قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

اکتوبر 2016، قیمت 15₹

ماہنامہ

اُردو دُنیا

دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

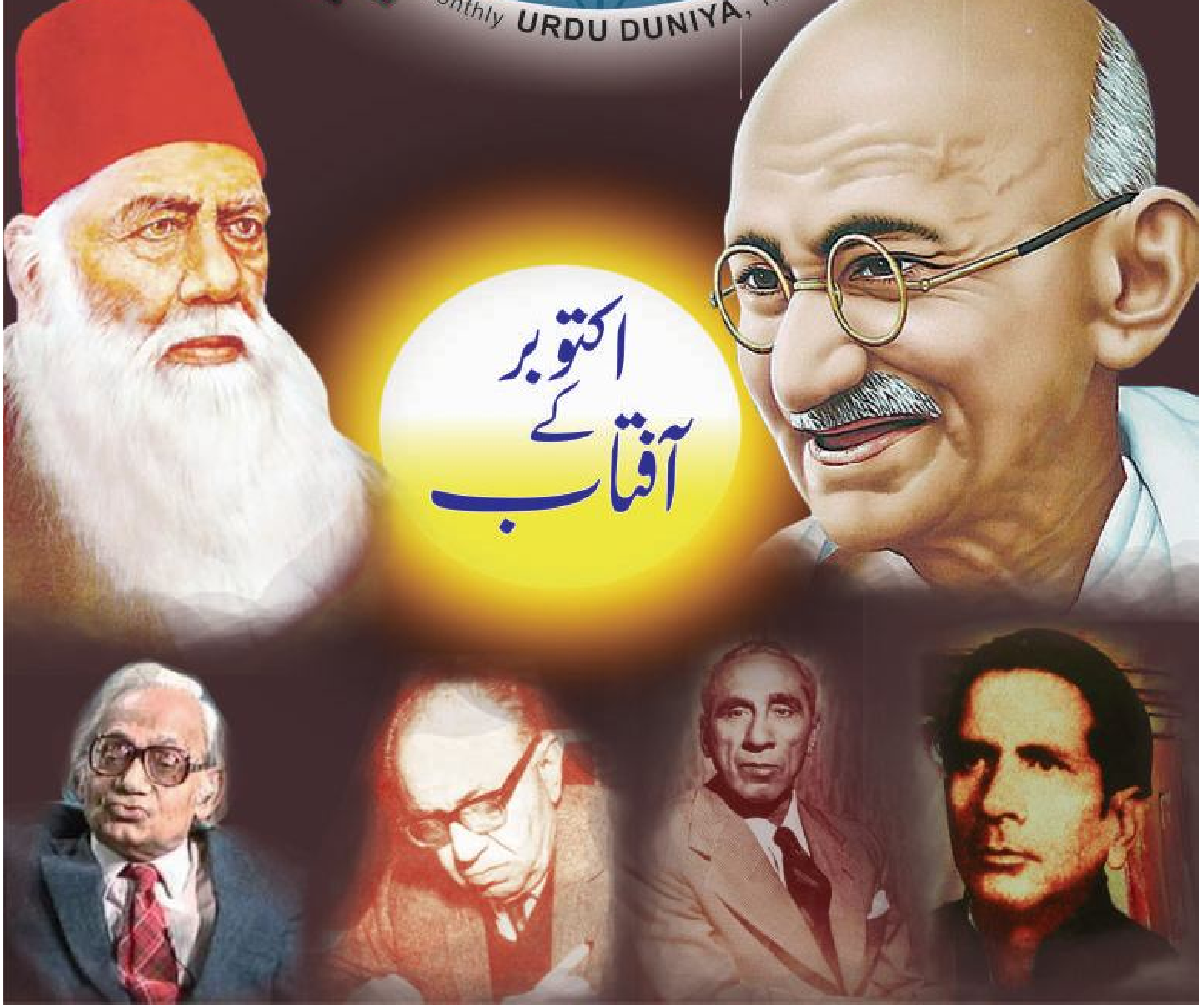

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچّوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول
عجیب و غریب خبریں

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ان کے علاوہ:

کہکشاں ♦ سیاحتی مقامات

اردو ایس ایم ایس ♦ اردو فیس بک ♦ دماغی ورزش

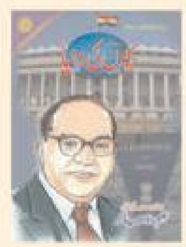

ننھے فنکار ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

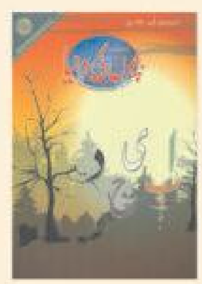

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے　　سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002 فون:24415194 - 040

ماہنامہ
اُردو دُنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi
قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:18، شمارہ:10، اکتوبر 2016

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت-/15 روپے سالانہ -/150 روپے
Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھرگٹی، حیدرآباد۔500002
فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
آپ کی بات قارئین کے خطوط 5

انٹرویو
...اردو ترقی نہیں کر سکے گی: اعجاز عبید عبدالعزیز سہیل 7

شخصیت
بڑا ہے درد کا رشتہ
(خلیل الرحمٰن اعظمی کی یاد میں) ابوالکلام قاسمی 11

زبان و تعلیم
اردو کی ابتدائی تعلیم بدر محمدی 14

خراج عقیدت
گاندھی جی کی اردو اور
مسلم تہذیب سے ہم آہنگی فیروز بخت احمد 16

نظیر بے نظیر
اردو شاعری میں نظیر اکبرآبادی
کی انفرادیت واہمیت محمد نعمان خان 18
ہندوستانی تہذیب کی عکاسی امتیاز احمد علیمی 21

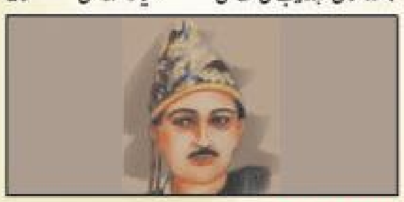

ادبی مباحث
بچوں کے ادب میں نفسیات کی اہمیت ظفرالدین 24
انشائیہ میں انکشاف ذات محمد اسد اللہ 27
اردو ہائیکو: فن وتکنیک سہیل ارشد 30
اردو غزل اور میڈیکل سائنس ای آر محمد عادل 35

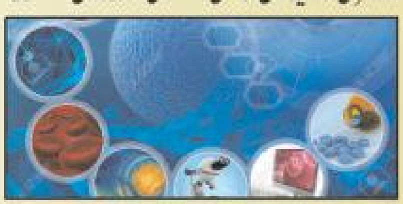

آغا حسن مرزا کی لغت نویسی فریدہ تبسم 39
مراٹھی اردو ترجموں میں قومی یکجہتی معین الدین عثمانی 43
انٹرویو اور اس کی اہمیت منظور احمد ملا 46

سلسلۂ صحافت
نیاز تسلی بیانیہ اور اردو صحافت شافع قدوائی 49

یاد رفتگان
کشمیری لال ذاکر: کچھ احوال واذکار نند کشور وکرم 51
ادب کا آفاقی پیغام شعیب رضا فاطمی 54

لسانیات
ماہر لسانیات نوم چومسکی اقتدار حسین خاں 56

ہم نے جنھیں بھلا دیا
اعجاز حسین اعجاز سید علی حیدر 59

سائنس
تجاذب: ایک پراسرار قوت انیس رشید خان 61

فلم
ڈراما 'انارکلی' پر مبنی فلمیں اشفاق احمد عمر 63

خصوصی تبصرہ
'فکر وتحقیق' (ناول نمبر) قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی 68

کتابوں کی دنیا
تبصرہ وتعارف 70

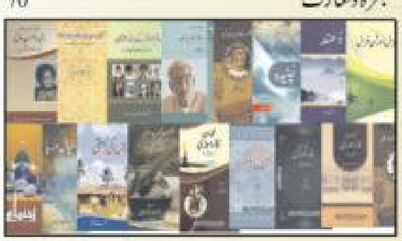

خبر نامہ
اردو دنیا کی خبریں ادارہ 82

ہماری بات

یہ اردو زبان کی خوش بختی ہے کہ ہندوستان کے طول وعرض اور بیرونی ممالک سے اردو کے بہت سے رسالے، مجلات اور اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ اس سے قطع نظر کہ ان مجلات کا منہج، معیار، مزاج کیا ہے یہ خوش آئند بات ہے کہ یہ تمام رسالے اردو زبان کی زندگی کا ثبوت پیش کر رہے ہیں۔ پوری دنیا سے نکلنے والے ان رسالوں کی سطحیں مختلف ہیں اور ان کے مقاصد اور منشور بھی الگ ہیں۔ ہر رسالے کا اپنا ایک زاویہ نظر ہے۔ کچھ رسالے تحقیقی موضوعات اور تنقیدی مضامین پر مرکوز ہیں تو کچھ رسالوں میں تفریحی مواد کی کثرت ہوتی ہے۔ ان تمام رسالوں میں قدرِ مشترک صرف یہ ہے کہ ان سے اردو زبان کے فروغ کی راہیں روشن ہوتی ہیں اور ایک بڑا طبقہ ان رسالوں کے وسیلے سے اردو زبان وادب سے جڑتا ہے۔ مدارس سے نکلنے والے مجلات کو بھی اردو زبان کی زندگی سے جوڑ کر دیکھا جائے تو اردو زبان کا ایک وسیع تر منظرنامہ سامنے آتا ہے اور خوشی ہوتی ہے کہ رسائل کے ذریعے اردو زبان ان قریوں اور نگروں تک پہنچ رہی ہے جہاں کسی اور ذریعے سے اردو کی رسائی ممکن نہ تھی۔

یہ دور زوال اور قحط الرجال کا ہے۔ مادیت اور صارفیت نے بھی ہماری ترجیحات بدل دی ہیں۔ مادی ضروریات نے لوگوں کو مطالعے سے بھی منحرف کر دیا ہے۔ زبان اور ادب کے تئیں وہ ذوق وجستجو بھی اب نہیں ہے۔ زبان وادب کے تعلق سے معاشرے کا رویہ بھی بدلتا جا رہا ہے۔ ایسے میں یہ کیا کم ہے کہ زبان کو زندہ رکھنے کے لیے یہ رسائل بہترین وسائل ثابت ہو رہے ہیں اور ان رسائل کی وجہ سے ایک ادبی نسل بھی جنم لے رہی ہے۔ ماضی میں بھی رسائل کے ذریعے ادب عالیہ کی تخلیق اور تشکیل ہوئی۔ مگر اب صورتِ حال ذرا مختلف ہے۔ آج کے دور میں ادب عالیہ کی توقع رکھنا عبث ہے۔ کیونکہ بزرگ تخلیق کار آہستہ آہستہ اٹھتے جا رہے ہیں۔ جو زندہ ہیں اور جن کے پاس گہرا وژن ہے ان کے قویٰ مضمحل ہو چکے ہیں۔ وہ چاہ کر بھی موجودہ ادبی منظرنامے کو بدل نہیں سکتے۔ ایسے میں زبان وادب کا سارا انحصار اس نسل پر ہے جو ابھی جوان ہو رہی ہے اور اردو زبان وادب سے جڑی ہوئی ہے۔ اب ادب اور زبان کو زندہ رکھنے کے لیے اس نسل کی ذہنی اور تحریری تربیت ضروری ہے کہ ادب آسمان کے یہی نئے ستارے مستقبل میں روشنی کی ضمانت بن سکتے ہیں۔ اس لیے اس نسل کو کسی بھی طور پر نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ جوش ملیح آبادی نے چند شماروں کے بعد رسالہ 'کلیم' کی اشاعت اس جواز کے ساتھ معطل کر دی تھی کہ تیسرے درجے کا ادب شائع کرنا ممکن نہیں ہے۔ جوش مرحوم چاہتے تو تیسرے درجے کا ادب لکھنے والے کو اوّل درجے کا ادیب بنا سکتے تھے مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ آج بھی صورتِ حال کچھ ایسی ہی ہے کہ اوّل درجے کا ادب تخلیق نہیں کیا جا رہا ہے۔ ایسے میں اگر جوش ملیح آبادی کی روش کو اختیار کیا جائے تو ہندوپاک سے نکلنے والے بیشتر رسالوں کو بند کرنا پڑے گا جس سے لازمی طور پر زبان کا ہی نقصان ہوگا۔ کیونکہ زبانیں انھی رسالوں کے ذریعے عوام تک پہنچتی ہیں۔ آج مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہمارے ادب کا رشتہ عوام سے جوڑنے کی بات ہو رہی ہے۔ ایک بڑا طبقہ ایسا ہے جو ایسی تحریروں کو پسند کرتا ہے جو ادق نہ ہوں، عام فہم ہوں اور ادبی مباحث کے ساتھ ساتھ معاشرتی مسائل سے بھی متعلق ہوں۔ اس لیے رسائل ایسے قاری کی ذہنی سطحوں کا بھی خیال رکھتے ہیں اور اس طرح ان رسالوں کی اشاعت سے زبانوں کو زندگی ملتی ہے۔ اگر رسائل کے اس افادی پہلو کو نظر میں رکھا جائے تو یقینی طور پر ہمیں معیار، منہج اور مزاج کے تعلق سے اپنا رویہ تبدیل کرنا ہوگا۔ بدلتے زمانے کے ساتھ ترجیحات بدلنی پڑتی ہیں اور رسائل عوام کی اس نفسیات سے اچھی طرح واقف ہو چکے ہیں۔ اسی لیے وہ اگرچہ آج کے عہد میں ادب عالیہ پیش کرنے سے قاصر ہیں مگر اردو زبان کو زندگی دے رہے ہیں۔ اس کے کینوس کو وسیع کر رہے ہیں اور اردو زبان کو دور دور تک پہنچا رہے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے اردو رسائل کی خدمات کا اعتراف کیا جانا چاہیے۔

ماہنامہ 'اردو دنیا' بھی ہندوستان سے نکلنے والے انھی رسائل میں سے ایک ہے جس نے فروغ اردو زبان کو اپنا منشور بنایا ہے اور اس رسالے کی کوشش ہوتی ہے کہ ہر سطح کے قاری کا خیال رکھا جائے اور اس کے ذوق کی تسکین کا سامان کیا جائے۔ اس رسالے میں ادب کے علاوہ اور بھی موضوعات ہوتے ہیں جن سے قاری اپنی دنیا کے علاوہ دوسری دنیا سے بھی آشنا ہوتا ہے۔ ادبی مباحث کے علاوہ سائنس، طب اور دیگر موضوعات کی شمولیت اسی مقصد سے ہوتی ہے کہ اردو دنیا کا ایک بڑا حلقہ ادبی اور نظریاتی مباحث سے زیادہ اس طرح کے موضوعات سے دلچسپی رکھتا ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' کی کوشش ہوتی ہے کہ نئے سے نئے موضوعات اس میں شامل کیے جائیں اور قلم کاروں سے گزارش بھی کی جاتی ہے مگر افسوس کہ ان موضوعات پر ہمیں مضامین نہیں مل پاتے جو ہماری ترجیحی فہرست میں شامل ہیں۔

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

آپ کی بات

✍ اگست 2016 'اردو دنیا' ملا شکریہ۔

اداریہ میں صحیح لکھا گیا ہے کہ اردو کے قارئین کے روبرو ایسی تحریریں پیش کی جانی چاہیے جو فکر انگیز اور مفید ہوں۔ اشخاص کے بجائے افکار پر زیادہ توجہ مرکوز کی جائے جو سائنس، ٹیکنالوجی، سماجیات، ترقیات اور جدید دور کے موضوعات پر مبنی ہوں۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جدید ٹیکنالوجی کا موضوع کس طرح ایک ادیب اور شاعر کی نگارشات میں کھپ سکتا ہے اور سماجیات کا موضوع تو ہر صورت میں شاعر اور ادیب کے مضامین میں سانس لے رہا ہے اور ترقیات کی بات آتی ہے تو کون کون سی ترقیات — کیا وہ ترقیات جس کو 2G یا 3G کے تیز رفتار کمپیوٹر اور موبائل کی صورت میں پیش کیا جائے — یا وہ ترقیات جو شہروں میں فلائی اور برج اور فلک بوس عمارتوں کی صورت میں دکھائی دے رہی ہے۔ یا وہ ترقیات جو امیر کو امیر اور غریب کو غریب ترین بناتی جارہی ہے۔ یا وہ ترقیات کہ گاؤں اور بستیوں میں موبائل تو پہنچ گیا برقی سہولتیں اور وسائل کے لیے پکی سڑکیں بن گئیں لیکن آج بھی گاؤں، دیہات اور قریے بے روزگاری اور ناخواندگی کا شکار ہیں یا وہ ترقیات کہ گلی گلی میں (Convent) تو کھل گئے ہیں مگر جہالت کا ماحول ہنوز باقی ہے۔

جناب مسرور حیدری کا مضمون 'اردو کا اوّلین محقق نصیرالدین ہاشمی' واقعی قابل مطالعہ ہے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ اردو تحقیقات کی دنیا میں نصیرالدین ہاشمی دکنی اردو تحقیقات کے باوا آدم ہیں۔ ہاشمی صاحب نے دکنی ادبیات کو دکن تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ سیکڑوں تصنیفات، خطوط، تاثرات کے ذریعے اردو ادب پر اپنی شخصیت کی اَن مٹ مہر لگا دی تھی۔

زیر نظر شمارے میں شکیل بدایونی سے متعلق تین مضامین جگہ پائے ہیں دو مضامین فلمی دنیا سے منسلک ہیں اور تیسرا مضمون خالص ادبی کارناموں سے متعلق — حضرت نوشاد علی موسیقار اعظم کے بغیر شکیل بدایونی کی شناخت دشوار تھی جس طرح اردو ادب میں سرسید کے بغیر

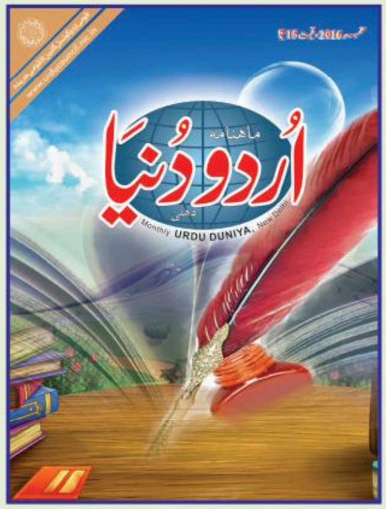

مولانا الطاف حسین حالی کی شناخت، ہدایت کار گرودت کے بغیر ساحر لدھیانوی کی شناخت۔ یہ سچ ہے کہ شاعر بنتا نہیں پیدا ہوتا ہے اور اپنی خداداد ادبی، علمی اور شعری صلاحیتوں سے ایک عالم کو گرویدہ کرلیتا ہے لیکن اس گرویدگی میں تن تنہا شاعر کا رول نہیں ہوتا بلکہ چند اہم ترین شخصیات کا بھی رول ہوتا ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

حضرت نوشاد علی صاحب شکیل کے محسن ہی نہیں مرشد بھی تھے۔ اپنی حیات کے آخری دنوں میں جبکہ شکیل صاحب مرضِ تپ دق میں مبتلا ہوکر ممبئی کے ایک مشہور ہاسپٹل میں داخل کردیے گئے تو نوشاد صاحب روزانہ عیادت کے لیے ان کے پاس جایا کرتے تھے۔ اسی اثنا میں مدراس کی ایک فلم 'ساتھی' کی ذمے داری انھیں سونپ دی گئی تو نوشاد صاحب چاہتے تھے کہ اس فلم کے سارے گیت شکیل صاحب سے لکھوائیں اور ایک بڑی رقم معاوضے کے طور پر انھیں دے دیں۔ مگر شکیل صاحب نے نہایت معذرت کے ساتھ کہا کہ وہ اس حالت میں گیت کیسے لکھ سکتے ہیں۔ پھر نوشاد صاحب نے ایک سبیل یوں نکالی اور شکیل صاحب سے کہا کہ صرف گانوں کے مکھڑے ہی لکھ دیجیے باقی کام میں مجروح سے کرالوں گا اور ایسا ہی ہوا۔ فلم کے پردے پر گیت کار کی حیثیت سے شکیل کے نام کے ساتھ مجروح کا بھی نام آسکتا تھا مگر مجروح صاحب نے نوشاد صاحب کی طرح کشادہ دلی اور ہمدردی سے کام لے کر پردے پر شکیل کا نام ہی رہنے دیا اور جو معاوضہ ملا وہ شکیل صاحب کے علاج کے لیے وقف کردیا۔

ایک اچھے شاعر کے لیے ایک اچھا انسان ہونا بھی ضروری ہے۔ ایک اچھے انسان کی صفات حضرت نوشاد علی، حضرت شکیل بدایونی اور حضرت مجروح سلطان پوری میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔

معصوم شرقی، فوزیہ خانم، شمس بدایونی، شاکر علی صدیقی اور اقبال النساء کے مضامین نے 'اردو دنیا' کے وقار کو روشن کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی تحریروں کو نظر بد سے بچائے۔

❖ **علیم صبا نویدی**: فلیٹ نمبر 16، دوسری منزل، چینئی

✍ ماہِ اگست 2016 کا شمارہ تمام تر خوبیوں سے مزین ہے۔ ادبی صفحات، انٹرویو، صحت، زبان و تعلیم و ضروری معلوماتی مضامین قرینے سے سجائے گئے ہیں۔ پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم) کا ایک جملہ (اداریہ) ''لایعنی مباحث میں قارئین کو نہ الجھایا جائے'' فکر انگیز ہے کیونکہ یہ صدی جس میں ہم جی رہے ہیں اور جس طرح جی رہے ہیں، وقت کو فضولیات میں نہ خرچ کر کے کچھ ایسا کرنا ہے کہ نئی نسل کو کچھ سبق، حوصلہ، TRACK اور کچھ اچھا کر گزرنے کا SUPPORT ملے۔ موصوف کی باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ آئندہ وہ بہت ساری تبدیلی لانے والے ہیں۔ یہ ایک اچھی کوشش ہے۔ اللہ ان کے لگن اور مقصد میں کامیابی عطا کرے۔ مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل جناب پرکاش جاوڈیکر کے متعلق پہلی بار اردو دنیا کے ذریعہ کتابی پہچان ہوئی۔ مضامین میں شکیل بدایونی کا گوشہ معلوماتی ہے۔ پردے کے پیچھے جان توڑ محنت کر کے دل لبھانے اور ہمیشہ گنگنانے والے سدا بہار گیت لکھنے والا کوئی اور نہیں شکیل بدایونی ہیں۔ انھیں جس طرح متعارف کرایا گیا ہے تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔ بانو سرتاج کی ترجمہ کردہ کہانی 'اکبری لوٹا' نے دل چھولیا۔ زہیر بن ابی سلمی کی شاعری علمی گوہر چننے والوں کے لیے ایک نایاب مضمون ہے۔ شمس بدایونی کی تحریر 'دیوانِ غالب کی

پہلی اشاعت ریسرچ اسکالر کے لیے قیمتی تحفہ ہے۔

ڈاکٹر معصوم شرقی کا انٹرویو میرے لیے دلی و ذہنی سکون پانے کا باعث ہوا ہے۔ جناب احمد سعید ملیح آبادی سے بھی میرے قریبی تعلقات رہے ہیں۔ ڈاکٹر معصوم شرقی کا شمار اردو کے لائق استاد میں ہوتا ہے۔ ان کے درس و تدریس کا طریقہ اوروں سے جدا ہے۔ یقیناً وہ اردو کے سپاہی ہیں جبکہ محترم احمد سعید ملیح آبادی لشکرِ اردو کے سپہ سالار ہیں۔ 1981 کے دوران جب ان کا اخبار آزاد ہند لیتھو پرنٹنگ سے آفسیٹ پرنٹنگ میں تبدیل ہو رہا تھا، راقم الحروف کو بحیثیت کاتب لگ بھگ دو سال تک خدمت کرنے کا اور ان کی صحبت میں بہت کچھ سیکھنے کا بھی موقع ملا۔ انٹرویو کے دوران ملیح آبادی صاحب نے اردو اخبارات اور قارئین کی سچی تصویر پیش کی ہے۔ الگ الگ زاویے سے اردو والوں کے لگاؤ اور اخبارات کے مسائل پر نظر ڈالی گئی ہے۔ بیشک انھوں نے بجا فرمایا ہے کہ اردو تکنیکی طور پر پتھر کے عہد سے نکل کر کمپیوٹر کے دور میں پہنچ گئی ہے۔ لیتھو پرنٹنگ سے (پتھر کی سل سے چھپائی) لے کر رنگین آفسیٹ کی چھپائی اور تیز رفتار کمپوزنگ سے اردو پریس میں انقلاب آ گیا ہے۔ رنگ و روپ تو خوب نکھرا ہے مگر زبان کا معیار گرتا جا رہا ہے۔ تحریروں میں پہلے جیسی گرمی اور چاشنی نہیں ملتی۔ مصاحبہ نگار نے جناب احمد سعید ملیح آبادی سے بڑے معیاری سوالات کیے ہیں بالخصوص 'پیڈ نیوز' سے متعلق مجھ کم فہم کے علم میں اضافہ ہوا۔

محمد فیاض انور: اے آئی جے ایم لائن، جگتدل، مغربی بنگال

ماہ اگست کے اردو دنیا میں محترمہ فوزیہ خانم نے اردو نظموں میں حب الوطنی کی قدیم روایتوں کے حوالے سے پنڈت برج نرائن چکبست، اکبر الہ آبادی، جوش ملیح آبادی، علی سردار جعفری کا خاص طور سے ذکر کرتے ہوئے جو پیغام دیا ہے۔ وہ نئی روشنی کے لیے مشعل راہ ہے۔ دیوان غالب عنوان سے شمس بدایونی نے بہت اہم جانکاری دی ہے۔

انیس امروہوی نے شکیل بدایونی کی نغمہ نگاری پر اچھا مضمون لکھا ہے اور یوسف رامپوری نے مضمون 'زہیر بن ابی سلمی کی قصیدہ گوئی' دور جاہلیت میں عربی شاعری کے عروج و زوال کا تذکرہ تفصیلی طور پر کیا ہے۔

محمود الظفر رحمانی: جنرل سکریٹری، انجمن ترقی اردو، یوپی

اگست کے شمارے میں فوزیہ خانم نے اپنے مضمون 'اردو کی نظمیہ شاعری میں حب الوطنی اور آزادی' میں جوش ملیح آبادی کا سنہ ولادت 1894 تحریر کیا ہے جو میری معلومات کے مطابق ٹھیک نہیں ہے۔ شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی کی پیدائش، 5 دسمبر 1898 (مطابق 21 رجب 1316 ہجری) محلہ مرزا گنج، ملیح آباد میں بروز اتوار صبح چار بجے ہوئی تھی۔ ان کے والد نواب بشیر احمد خاں بھی شاعر تھے۔ دادا نواب محمد احمد خاں احمد کا بھی شاعری سے تعلق تھا۔ جوش کے پردادا تہور جنگ، حسام الدولہ، نواب فقیر محمد خاں گویا (وفات 1851)، صاحب دیوان شاعر تھے۔ جوش کی دادی، مرزا اسد اللہ خاں غالب (1797-1869) کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ جوش ملیح آبادی کی رحلت 22 فروری 1982 بروز دوشنبہ کراچی میں ہوئی اور تدفین اسلام آباد میں عمل میں آئی۔

عبدالسلام صدیقی: ناظر کپاؤنڈ، جگت نرائن روڈ، لکھنؤ

آپ کی کوششوں سے رسالہ بہت عمدہ ہو گیا ہے! اگست 2016 کے شمارے میں مضامین اور ان کی پیش کش بہت پسند آئی۔ صحافت پر محترمہ پروفیسر شبنم حمید صاحبہ، الہ آباد کا مضمون 'اردو کی ادبی صحافت' کافی معلوماتی اور دلچسپ ہے۔ مضمون اپنے مواد اور اسلوب دونوں کے اعتبار سے عمدہ ہے۔

ڈاکٹر احسان حسن: اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، بی ایچ یو، وارانسی

ماہنامہ 'اردو دنیا' اگست کا شمارہ یوم آزادی کی مبارکباد کے ساتھ موصول ہوا، خوشی ہوئی۔ شکیل بدایونی پر گوشہ دیکھ کر مزید خوشی ہوئی کہ ان دنوں مرحوم پر لکھا پڑھا جا رہا ہے۔ حالانکہ فلمی نغمہ نگاروں اور پاپولر ادب کو ہمارے ناقدین عرصہ تک شجر ممنوعہ سمجھتے رہے ہیں۔ دراصل ادب اور زبان کے کچھ پیمانے ہیں اور ہر وہ تحریر جو ان پیمانوں میں رکھی جا سکتی ہو اور پوری اترتی ہو اس پر نہ صرف توجہ دینی چاہیے بلکہ تحقیقی و تنقیدی نقطۂ نظر سے بھی اس پر کام کرنا چاہیے۔ ادب کسی زبان کا نہ صرف خزانہ ہوتا ہے بلکہ ترویج و ترقی کا مرکزی کردار بھی۔

'اردو کی ادبی صحافت' اور 'معارف کے سو برس' مقالے گراں قدر ہیں اور اپنی طرف اس اعتبار سے بھی متوجہ کر رہے ہیں کہ بہت سے اکابر ادیب و شاعر اور صحافیوں کا نام زندہ ہو گیا ہے اور زمانی اعتبار سے بھی معارف کی اہمیت و افادیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اردو زبان میں جس طرح بہت سے غیر مسلم تخلیق کار اپنے فن اور ادب سے زندہ ہیں اور زبان و ادب کو بھی زندگی بخشتے رہتے ہیں اسی طرح ہندی میں بھی مسلم قلمکاروں نے اپنی تحریروں کی روشنی پھیلائی ہے۔ محمد نہال افروز کا مضمون 'ہندی فکشن میں مسلم تخلیق کاروں کا حصہ' اسی نوعیت کا ہے اور اس میں بھی بہت سے ادیبوں و افسانہ نگاروں کے نام اجاگر ہو گئے ہیں۔ دیگر مشمولات اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں جو 'اردو دنیا' کا خاصہ ہیں اور مستقل کالم بھی۔

ڈاکٹر رضوان الرضا رضوان: طبیہ کالج کوٹی ملیح آباد، لکھنؤ

'اردو دنیا' اور 'بچوں کی دنیا' کا مطالعہ کرتا ہوں۔ 'اردو دنیا' محققین، معلمین و معلمات (پروفیسرس)، ادبا، شعرا اور طالب علموں کے لیے ایک بہترین رسالہ اور حوالہ جاتی کتب کی حیثیت رکھتا ہے۔ ماہنامے کا اداریہ، مقالات کتابوں پر تبصرہ، کونسل کی سرگرمیاں اردو قاری کے لیے ضروری ہیں۔ 'اردو دنیا' جاذب نظر و خوب صورت ہوتا ہے۔

انصاری محمد یاسین نذیر احمد: مالیگاؤں، مہاراشٹر

قلم کاروں سے گزارش

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں ہر شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والے افراد کے ذوق اور سطح کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ادب کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی تحریریں شائع کی جاتی ہیں مگر ایسے مضامین کو ترجیح دی جاتی ہے جو سائنسی، سماجی، ثقافتی اور تعلیمی شعبوں میں ہونے والی ترقیات کا احاطہ کرتے ہوں یا روزگار کے حصول میں معاون وسائل کی نشان دہی کرتے ہوں۔ یہ ہر طبقے کا رسالہ ہے اسی لیے اس میں تنوع کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' کی خوش بختی ہے کہ اسے ہندوستان بھر کے قلم کاروں کا تعاون حاصل ہے۔ ہر موضوع پر ہمیں مضامین ملتے رہتے ہیں۔ لیکن تمام مضامین کی فوری اشاعت ممکن نہیں ہے۔ اس لیے اب قلم کاروں سے گزارش ہے کہ اپنے مضمون کے ساتھ چند سطروں میں مضمون کے اہم نکات کی نشان دہی فرما دیں تاکہ ترجیحی طور پر مضمون کو شامل اشاعت کیا جا سکے۔

'اردو دنیا' کے لیے تمام مضامین/مکتوبات اردو دنیا کی ای میل آئی ڈی کے علاوہ درج ذیل آئی ڈی پر بھی ضرور ارسال کریں: director@ncpul.in

محمد عبدالعزیز سہیل

جب تک دوسرے میدانوں میں اردو کا بول بالا نہیں ہوگا اردو ترقی نہیں کر سکے گی

اعجاز عبید

محمد اعجاز اختر جنہیں اردو دنیا بالخصوص اردو یونی کوڈ سے واقف کار اعجاز عبید کے نام سے جانتے ہیں اردو کے اہم خدمت گزار ہیں جن کی خدمات اردو کو ٹکنالوجی سے جوڑنے میں کافی اہمیت کی حامل رہی ہیں۔ یونی کوڈ کے حوالے سے انھوں نے قابل قدر کام انجام دیا ہے اور اپنے متعلق ان کا یہ کہنا ہے کہ ''میں یہ سمجھتا ہوں کہ میں نے اردو کی بطور زبان یہی خدمت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسے ٹکنالوجی سے جوڑ سکوں۔ بطور اردو ادیب اردو ادب میں رطب و یابس کا اضافہ ضرور کیا ہو گا لیکن اردو ادب کو میں اردو زبان کی ترقی نہیں مانتا۔ اب بھی مجھے انٹر نیٹ پر اردو کی جگہ رومن رسم الخط لکھا ہونے سے بہت کوفت ہوتی ہے۔ میری یہی خواہش ہے کہ ہر اردو داں شخص محض اردو میں گوگل تلاش بھی کرے، اردو ویب سائٹس ہی مطالعہ کرے اور اردو میں ہی ای میل کرے یا سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس، فیس بک وغیرہ پر اردو میں ہی لکھے۔ اسی نصب العین کے حصول کے لیے میں نے یونی کوڈ کو عام بنانے کی کوششیں کی ہیں''۔ اعجاز عبید نے یونی کوڈ میں اردو ادب اور شاعری کو عام کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے، وہ تقریباً پندرہ سالوں سے لگاتار اردو کو انٹرنیٹ پر عام کرنے کی مہم سے جڑے ہوئے ہیں، ان کی تیار کی ہوئی 'بزم اردو لائبریری' میں سیکڑوں کتابیں موجود ہیں، انھوں نے 'سمت' نامی ایک ادبی رسالہ بھی جاری کیا۔

عزیز سہیل: مکمل نام، قلمی نام، تاریخ پیدائش اور آبائی مقام کی تفصیلات سے ہمارے قارئین کو واقف کروائیں؟

اعجاز عبید: مکمل نام، محمد اعجاز اختر، تاریخی نام: اعجاز بلند اختر، قلمی نام: اعجاز عبید، پیدائش: 22 جنوری 1950 لیکن غلطی سے ہائر سیکنڈری اسکول سرٹیفکیٹ میں تاریخ 20 جون ہوگئی، جو سرکاری طور پر درست مانی گئی۔ مقام: جاؤرہ، ضلع رتلام، مدھیہ پردیش، (ننھیال) بچپن: اندور، مدھیہ پردیش (ددھیال)، ہجرت: علی گڑھ 1968، والدہ اور بہن علی گڑھ میں ہی مقیم ہیں۔ والد کے آبا و اجداد البتہ نصیر آباد، راجستھان سے تھے۔

ع س: کن تعلیمی اداروں سے آپ نے تعلیم حاصل کی ہے؟

اعجاز عبید: ہائی اسکول بلکہ ہائر سیکنڈری اسکول، اسلامیہ کریمیہ ہائر سیکنڈری اسکول، اندور، 1966 سے 1968 سے 1973 علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، بی ایس سی (آنرس)، اور ایم ایس سی، جیالوجی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ، اس کے بعد کچھ دن وہیں ریسرچ اور لکچررشپ 1975 تک۔

ع س: اپنے خاندان سے متعلق کچھ بتایئے؟

اعجاز عبید: والد، مرحوم صادق اندوری، اندور کے معروف استاد شاعر، والدہ، عبیدہ انجم، وہ بھی شاعرہ ہیں۔ اور کافی شائع بھی ہوئی ہیں اپنے زمانے میں۔

ع س: اساتذہ یا والدین میں سے، کس سے سب سے زیادہ متاثر ہیں اور کیوں؟

اعجاز عبید: دونوں سے کافی حد تک، والد سے عروض کی شد بد حاصل ہوئی۔

ع س: آپ اپنا وقت کیسے گزارتے ہیں (مشغولیات)؟

اعجاز عبید: آج کل، ریٹائرمنٹ کے بعد، تو ضروریات جن میں مسجد بھی شامل ہے، کے علاوہ محض کتابوں کی تدوین میں۔ اس کے علاوہ اردو کی جس خدمت کا موقع مل جائے اور میں انجام دے سکوں۔ اردو محفل فورم میں اصلاح سخن کا کام بھی میں نے لے رکھا ہے۔

ع س: روزگار کی کیا مصروفیات رہی ہیں؟

اعجاز عبید: علی گڑھ میں لکچررشپ کے بعد 1975 میں بطور جیالوجسٹ جیالوجیکل سروے آف انڈیا میں جوائن کیا، وہیں سے 2010 میں ریٹائر بطور سلیکشن گریڈ ڈائریکٹر۔ کولکتہ، حیدرآباد، شیلانگ۔ حیدرآباد ناگپور اور پھر حیدرآباد میں پوسٹنگ رہی، اگرچہ ٹریننگ وغیرہ کے سلسلے میں تقریباً ہندوستان کے ہر صوبے کی سیر کی، سوائے پنجاب اور ہماچل پردیش کے۔ ان 53 سالوں میں کوئی 22 سال فیلڈ ورک بھی کیا، یعنی شہروں سے دور دور مقامات پر کیمپ کر کے سروے کیے۔

ع س: کون سی بات آپ کو فوری ناراض کر دیتی ہے؟

اعجاز عبید: مجھ کو تو لگتا ہے کہ میں ناراض ہی نہیں ہوتا، البتہ جس بات سے دلی تکلیف محسوس ہوتی ہے وہ اس بات پر کہ جب مجھ پر کوئی غلط الزام لگاتا ہے۔ اور میرا توضیحی بیان سننا نہیں چاہتا۔

ع س: کون سا شاعر پسند ہے، ادبا میں کس کو پسند کرتے ہیں اور آپ کس شاعر یا ادیب سے زیادہ متاثر ہیں؟

اعجاز عبید: بہت سے، اساتذہ کے علاوہ فیض، فراق، ابن انشاء، ناصر کاظمی، ظفر اقبال، عرفان صدیقی وغیرہ، نثر میں بھی بہت نام ہیں۔ کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، بیدی، قرۃ العین حیدر، مشتاق احمد یوسفی اور ابن صفی بھی۔ علی گڑھ میں شروع میں بشیر بدر کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا

رہا تو کچھ ان سے، ناصر کاظمی سے، لیکن ان کے چنگل سے نکلنے کے بعد کسی سے نہیں۔

ع س: کوئی کتاب جس نے آپ کی زندگی پر اثرات مرتب کیے؟

اعجاز عبید: ایسی تو کوئی کتاب نہیں، البتہ بہت سی کتابیں پسند ضرور آئیں۔ عبد اللہ حسین کی اداس نسلیں، قدرت اللہ شہاب کی یا خدا، شوکت صدیقی کی خدا کی بستی، عینی آپا کے آگ کا دریا سے زیادہ پت جھڑ کی آواز، میرے بھی صنم خانے اور آخر شب کے ہم سفر، مشتاق یوسفی کے چراغ تلے، خاکم بدہن اور آب گم وغیرہ۔

ع س: آپ کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟

اعجاز عبید: میرے خزانے میں موجود ہزاروں کتابوں کے مواد کو اپنی زندگی میں ہی تدوین کر کے اپ لوڈ کر سکوں۔

ع س: آپ کتنی کتابوں کے مصنف ہیں نام اور موضوع بتلائیے؟

اعجاز عبید: کچی روشنائی سے تو کوئی کتاب چھپی ہے نہ میں نے اس طرف توجہ دی ہے۔ برقی طور پر شائع شدہ کتابیں ہیں دو غزلوں کے مجموعے 'تحریر آب زر' اور 'اپنی برہنہ پائی پر'، ایک طویل نظم 'صاد' اور ایک مکمل مجموعہ 'صاد اور دوسری نظمیں'، ایک ناولٹ 'مائل بہ کرم راتیں' افسانوں کا مجموعہ 'تتلی کے پر' اور حج کا سفر نامہ مزاحیہ انداز تحریر میں 'اللہ میاں کے مہمان'۔ یعنی 'صاد' کو ملا کر کل سات کتابیں۔

ع س: اپنا کوئی پسندیدہ شعر/نظم شیر کریں۔

اعجاز عبید: یہ کہنا تو بہت مشکل ہے۔ ویسے شاعری سے زیادہ مجھے اپنا ناولٹ 'مائل بہ کرم راتیں' پسند ہے۔ اور اتفاق سے وہی غزلیں بھی مجھے زیادہ پسند ہیں جو ناصر کاظمی کے اتباع میں کہی گئی ہیں، یا ان کی ہی زمینوں میں۔

ع س: اردو ادب اور اردو کو ٹکنالوجی سے جوڑنے میں آپ کی کیا خدمات ہیں؟

اعجاز عبید: ان دونوں سوالوں کا مشترکہ جواب دینا پسند کروں گا۔ وہ اس لیے کہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ میں نے اردو کی بطور زبان یہی خدمت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسے ٹکنالوجی سے جوڑ سکوں۔ بطور اردو ادیب اردو ادب میں رطب و یابس کا اضافہ ضرور کیا ہوگا لیکن اردو ادب کو میں اردو زبان کی ترقی نہیں مانتا۔ اب بھی مجھے انٹرنیٹ پر اردو کی جگہ رومن رسم الخط لکھا ہونے سے بہت کوفت ہوتی ہے۔ میری یہی خواہش ہے کہ ہر اردو داں محض اردو میں گوگل تلاش بھی کرے، اردو ویب سائٹس ہی مطالعہ کرے اور اردو میں ہی ای میل کرے یا سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس، فیس بک وغیرہ پر اردو میں ہی لکھے۔ اسی نصب العین کے حصول کے لیے میں نے یونی کوڈ کو عام بنانے کی کوششیں کی ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ میں اس میدان میں اردو میں بعد میں آیا، اس سے پہلے ہندی کے میدان میں آیا۔ اس کی ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ میں نے قرآن درپن کے نام سے ہندی میں قرآن کے آخری پارے کی تفسیر شروع کی تھی۔ ویسے میں کوئی دینی عالم تو نہیں، لیکن یہ ضرور محسوس کرتا تھا کہ ہندی میں کوئی قابل قدر تفسیر موجود نہیں، اور اس ضمن میں کام کیا جائے۔ اس سے پہلے کمپیوٹر سے واقف ہو چکا تھا اور انگریزی میں مائکرو سافٹ ورڈ وغیرہ میں کام کرتا رہا تھا۔ لیکن جب ہندی کا معلوم کیا تو پتہ چلا کہ اس کے لیے محض کچھ سافٹ ویئر ہی دستیاب ہیں، اور اگر یہ استعمال کر کے ٹائپ بھی کیا جائے تو پڑھنے والوں کو وہی سافٹ ویئر بھی استعمال کرنا ہوگا جسے ٹائپ کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

اس سلسلے میں مزید تحقیق کی تو 'شوشا' نامی فانٹ مل سکے جن کو اس طرح استعمال کیا جا سکتا تھا جو ونڈوز آپریٹنگ سسٹم کے کسی بھی سافٹ ویئر میں پڑھا جا سکتا تھا۔ محض مذکورہ فانٹ کی ضرورت ہوتی تھی، جو اس وقت مجھے اس لیے بہتر لگا کہ صارف کو محض فانٹ انسٹال کرنے کی ضرورت تھی، اور مائکرو سافٹ ورڈ کے ڈاکیومینٹ میں فانٹ کو شامل بھی کیا، بلکہ تکنیکی اصطلاح میں امبیڈ (embed) بھی کیا جا سکتا تھا اس وقت یہ ترکیب مجھے بہت پسند آئی۔ اور شوشا میں ایک ہی حرف کو دو کنجیوں کی مدد سے لکھنے کی بجائے میں نے ایسے فانٹس بنانے کی سوچی جو ایک stroke Key میں ہی پورا حرف لکھ سکیں اور اس طرح میں فانٹ بنانے کے میدان میں کود پڑا۔ اس کی ضرورت یوں بھی تھی کہ اس زمانے میں اپنے دفتر میں دوسرے جیالوجسٹس کی رپورٹس کی نشر و اشاعت کے شعبے میں تھا، اور ضروری تھا کہ ہر انگریزی رپورٹ کا کم از کم خلاصہ ہندی میں بھی دیا جائے۔ تو میں نہ صرف ترجمہ خود کرتا تھا، بلکہ ہاتھ سے سٹینسل پر لکھ کر سائکلو سٹائل کرواتا تھا اور اسے انگریزی رپورٹ میں شامل کرتا تھا۔ اسی کے بعد حج بیت اللہ پر بھی گیا 1977 میں تو حج کا مزاحیہ سفر نامہ لکھا۔ 'اللہ میاں کے مہمان' کے نام سے۔ اسے بھی کمپیوٹر میں ٹائپ کرنے کا خیال آیا تو پھر اردو کمپیوٹنگ کی دنیا میں بھی داخل ہوا۔ پہلے اشہر فرحان کے 'اردو صفحہ ساز' کا پتہ چلا۔ یہ جیلانی بانو کے صاحب زادے ہیں۔ ان کے دوست راجیو سے اس سافٹ ویئر کا کام کرنا سیکھا اور اس زمانے میں رائج فلاپی ڈسکس میں اس کا شئر ویئر ورژن حاصل کیا جو قابل استعمال تھا۔ اسی میں ٹائپ کرنا شروع کیا لیکن پھر انٹرنیٹ سے ربط ہوا، اور ان پیج کا معلوم ہوا، تو اسی چوری کے سافٹ ویئر پر پہلی بار مکمل کتاب ٹائپ کی۔ لیکن وہ احساس ضرور ہوا کہ اگر اس سافٹ ویئر کی جگہ محض کوئی فانٹ استعمال کیا جا سکے۔ حالانکہ اسی زمانے میں یونی کوڈ آ چکا تھا 1998 میں، لیکن مجھے 2000 میں اس کا پتہ چل سکا۔ اس سے پہلے اسی تلاش و جستجو میں یاہو گروپس بنائے، ایک اردو کمپیوٹنگ، ایک انڈک کمپیوٹنگ اور ایک قرآن ان ہندی۔ اسی گروپ کے مراسلوں کے ذریعے ہی یونی کوڈ سے واقفیت ہوئی۔ اور ساتھ ہی نبیل نقوی اور زکریا اجمل سے ربط ہوا۔ ان کی خواہش تھی کہ ایسی آن لائن سوشل کمیونٹی بنائی جائے جہاں سب لوگ ٹکنالوجی سے دور رہنے والے بھی اردو میں ہی بات چیت کر سکیں، اردو رسم الخط میں ہی۔ نبیل نے ایک جاوا اسکرپٹ میں اردو ایڈیٹر لکھا تھا، اور وہی اردو ایڈیٹر اب بھی کئی ویب سائٹس، فورمس اور بلاگس میں استعمال ہوتا ہے۔ بہر حال ای میل کے ذریعے ہی سب دوستوں نے مل کر اردو محفل (اردو ویب ڈاٹ آرگ/محفل) کی شروعات کا فیصلہ کیا۔ اردو محفل ہی انٹرنیٹ پر اردو کی نہ صرف پہلی یونی کوڈ اردو فورم ثابت ہوئی بلکہ یونی کوڈ اردو کی ترقی کے لیے بنیادی پلیٹ فارم ثابت ہوئی۔ سارے ہی اردو والنٹرس کا تعلق کسی نہ کسی مرحلے پر اردو محفل سے رہا ہے۔ میں نے بھی اپنی صلاحیت کے مطابق کچھ حصہ لینے کی کوشش کی۔ فانٹس اور کی بورڈس بنائے۔ ان پیج سے یونی کوڈ کنورٹر بنانے میں تعاون کیا۔ اور اس کے بعد اردو الفاظ کی فہرست سازی میں حصہ لیا۔ اصل میں تو فہرست سازی پاکستان کے ایک ادارے، سنٹر فار ریسرچ ان اردو لینگویج کمپیوٹنگ (CRULP) نے بنائی تھی، لیکن معلوم ہوا کہ یہ فہرست سازی موجود ویب سائٹس سے حاصل شدہ مواد سے ہی بنائی گئی تھی، اور ہم اردو والے ٹائپنگ کے معاملے میں سنجیدہ نہیں ہیں۔ اس لیے اس لسٹ میں بے شمار 'غیر الفاظ' کی شمولیت ہو گئی تھی۔ مثلاً اصل فہرست کا پہلا لفظ تھا 'آ آ کر' جو در اصل تین الفاظ کا مجموعہ ہے: 'آ'، 'آ' اور 'کر'، اور واحد لفظ نہیں کہا جا سکتا۔ پھر جب مائکرو سافٹ نے اپنے مائکرو سافٹ آفس میں اردو میں عمل لفظی کی شروعات کی تو معلوم ہوا کہ اس میں بھی الفاظ کی فہرست بہت کم ہے۔ اور میں نے کرلپ کی فہرست کو درست کر کے اس فہرست کو کسٹم ڈکشنری کے طور پر استعمال کیا۔ اور

اب یہی اسٹینڈرڈ مانی جاتی ہے۔ یونی جہاں بھی مائکرو سافٹ آفس میں اردو میں عمل لفظی کیا جاتا ہے، یہی میری تبدیل شدہ فہرست بطور کسٹم ڈکشنری استعمال ہوتی ہے۔ بزم اردو لائبریری اور برقی کتابوں کی تدوین کی وجہ سے اس میں کئی الفاظ شامل ہوتے جا رہے ہیں اور یہ فہرست مزید ضخیم ہوتی جا رہی ہے۔

ابھی میں نے ہم اردو والوں کی 'غیر سنجیدگی' کی بات کی تھی۔ اسے کچھ مزید واضح کر دوں۔ دراصل اردو ٹائپنگ کرنے والے اس حقیقت سے روگردانی کرتے ہیں کہ کسی بھی لفظ کی پہچان اس سے ہوتی ہے کہ جہاں یہ ختم ہو، وہاں اس کے اگلے لفظ سے پہلے ایک عدد خالی اسپیس دینی ضروری ہے۔ جیسے اوپر کی مثال میں 'آ' کے بعد اسپیس، پھر 'آ' کے بعد ایک اسپیس، اور پھر 'کر' لیکن ہم اردو والے نہ جانے کیوں اس کا خیال نہیں رکھتے اور جہاں حروف نہیں ملتے ہیں، وہاں بغیر اسپیس دیے اگلا لفظ ٹائپ کر دیتے ہیں۔ 'ا' یا 'آ' کیونکہ اگلے حرف سے نہیں ملتا ہے، اس لیے اس کے بعد کی ضروری اسپیس نہیں دی جاتی۔ اسی طرح 'ر' بھی اگلے حرف سے نہیں ملتا ہے، اس لیے 'کرسکتا' کو ملا کر لکھ دیا جاتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے 'کرسک' اور 'جاسک' یا 'آسک' کو مائکروسافٹ آفس کی اصل اردو لغت بھی غلط قرار نہیں دیتی!! اسی طرح اکثر واحد لفظ کو بھی توڑ دیا جاتا ہے۔ 'اور' جیسے عام لفظ کو بھی میں نے 'او' اور 'ر' یا 'ا' اور 'ور' کے طور پر دو الفاظ کی صورت میں اکثر لکھا دیکھا ہے۔ یعنی 'اور' جیسے اکلوتے لفظ میں اسپیس دے کر دو الفاظ میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ میں اسے صرف غیر سنجیدگی سے ٹائپ کرنے کی غلطی سمجھتا ہوں۔ ابھی حال ہی میں میں نے اپنے لیے پروف ریڈنگ میں مدد کے لیے اردو محفل کے ہی رکن اور فعال پروگرامر اسد سے وژول بیسک میں پروگرام بنوایا ہے، جس سے ایسے تمام غلط الفاظ خودکار طور پر درست ہو جاتے ہیں۔ یہ پروگرام بھی اردو محفل پر ہی موجود ہے۔

ع س: اپنے رسالے کے بارے میں بتلایئے؟

اعجاز عبید: میں نے یہ محسوس کیا کہ اردو یونی کوڈ کی ترویج زیادہ ضروری ہے، اور اس کا تجربہ ہوا کہ اردو کی ترقی ایک طرف شعر و ادب سے جڑی ہے تو دوسری طرف دین اسلام سے۔ اسی سلسلے میں پہلے برقی کتابوں کی لائبریری بنائی۔ لیکن دینی ویب زیادہ تر مسلکوں میں تقسیم ہے، اس لیے اسے دوسروں کے لیے چھوڑ کر محض ادبی سائٹ کے طور پر 'سمت' کا اجرا کیا جو یونی کوڈ اردو کا پہلا ادبی رسالہ تھا۔ اس کا پہلا شمارہ نومبر 2005 میں سامنے آیا۔ اس وقت یہ ایک بلاگ کی صورت میں تھا۔ مختلف ڈومین کے بعد اب یہ تین چار سال سے بزم اردو کے پلیٹ فارم سے سہ ماہی جریدے کے طور پر نکل رہا ہے اور ماشاء اللہ خاصا مقبول ہے۔

ع س: اپنی ویب سائٹس اور اس کی اہمیت کو بیان کیجیے؟

اعجاز عبید: آج کل بزم اردو پلیٹ فارم سے ہی منسلک ہوں۔ 'سمت' بھی اسی پلیٹ فارم سے نکلتا ہے اور بزم اردو برقی لائبریری بھی۔ کچھ کتابیں جو باقاعدہ چھپ چکی ہوتی ہیں، ان کی کمپوز کی ہوئی (ان پیج سافٹ ویئر میں جو اردو کا مقبول سافٹ ویئر ہے) فائلیں مصنفین یا ناشرین بھیجتے ہیں۔ میں ان کو یونی کوڈ اردو میں تبدیل کرتا ہوں، پھر اس کی فارمیٹنگ اور پروف ریڈنگ کرتا ہوں، جسے عمل لفظی یا محض تدوین کہتا ہوں، اور پھر اس متن کو ویب سائٹ پر اپ لوڈ کر دیتا ہوں۔ ویب سائٹ کی اینڈرائڈ ایپ بھی ہے۔ اور سمارٹ فون پر بھی اس ایپ کے ذریعے ساری کتابیں پڑھی جا سکتی ہیں۔

ع س: اردو ٹکنالوجی اور یونی کوڈ کی وضاحت کیجیے؟

اعجاز عبید: یونی کوڈ سے پہلے اردو میں کمپیوٹر پر لکھنا جیسے ای میل ممکن نہیں تھا۔ ویب سائٹس نہیں تھیں۔ ان پیج پروگرام کی اس قدر حکمرانی تھی کہ اسی کے ذریعے ایک ایک صفحے کو تصویر کی شکل میں اکسپورٹ کیا جا سکتا تھا۔ اور یہی تصویریں اٹیچ کر کے اردو میں ای میل کی جاتی تھیں۔ ویب سائٹس بھی انھیں تصویروں کی شکلوں میں ہوتی تھیں۔ جب یونی کوڈ کا استعمال شروع ہوا تب بھی نستعلیق فانٹس نہیں بن سکے تھے۔ سب سے پہلے کرلپ نے ہی 'نفیس نستعلیق' نامی فانٹ بنایا جو بہت سست رفتاری کی وجہ سے مقبول نہیں ہو سکا۔ لیکن 2006 میں پاک نستعلیق اور 2008 میں علوی نستعلیق کے اجرا کے بعد تو جیسے انقلاب آ گیا ہے۔ نسخ سے اجتناب برتنے والے بھی اب نستعلیق فانٹس میں ویب سائٹس اور بلاگس بنانے لگے۔ علوی نستعلیق کے کچھ ہی عرصے بعد جمیل نوری نستعلیق کا اجرا بھی ہوا جو سب سے زیادہ مقبولیت کا حامل رہا ہے۔

ایک بات اور کہہ دوں کہ تصویروں کی شکل میں ویب سائٹس میں کیا مشکل درپیش تھی۔ انٹرنیٹ پر سب سے ضروری چیز 'تلاش' ہوتی ہے۔ آپ کو جب بھی کسی چیز

سوانحی کوائف

نام: اصل، اعجاز اختر، تاریخی۔ اعجاز بلند اختر، (1369ھ) **قلمی نام:** اعجاز عبید

والد: صادق اندوری (1986-1917) اندور کے استاذ شاعر، خود پنڈت پربھودیال عاشق لکھنوی (شاگرد حالی) کے شاگرد

والدہ: عبیدہ انجم (2016-1924)، **برقی مجموعہ:** حجاب شعر، والدہ کا ابھی 24 جولائی کو 82 سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

پیدائش: جاؤرہ، ضلع رتلام، مدھیہ پردیش 22 جنوری 1950 لیکن سرکاری ریکارڈس میں غلطی سے 20 جون ہو گئی۔

تعلیم اور ملازمت: ابتدائی، ہائر سیکنڈری تک کی تعلیم اندور میں، اس کے بعد علی گڑھ۔ مسلم یونیورسٹی سے، بی ایس سی 1971، ایم ایس سی جیالوجی 1973، پھر پی ایچ ڈی میں داخلہ، 1974 میں علی گڑھ میں ہی لکچررشپ۔ اسی سال یو پی ایس سی کے امتحان میں کامیابی اور بطور کلاس 1 جیالوجسٹ جیالوجیکل سروے آف انڈیا کولکاتا میں تقرر۔ پھر حیدرآباد تبادلہ ہوا۔

ادبی دلچسپیاں: ابتدا ادب اطفال سے ہوئی۔ شروع کی تخلیقات نور، رام پور اور پیام تعلیم، دہلی میں شائع ہوئیں۔ عزیز اندوری مرحوم کی ادارت میں نکلنے والے 'سفیر مالوہ' اندور کے بچوں کے صفحے 'کھلتی کلیاں' کی ادارت کی۔ پہلی سنجیدہ نظم اسی اخبار کے ادبی صفحے میں 1966 میں شائع ہوئی۔ پہلی غزل ماہنامہ 'کتاب' لکھنؤ میں جولائی 1967 کو شائع ہوئی۔

تخلیقات: برقی شکل میں چھپی ہیں۔ یہ ہیں: غزلوں کے دو مجموعے 'تحریر آب زر' اور 'ایک برہنہ پائی پر'، نظموں کا مجموعہ 'صا او ر دوسری نظمیں'، طویل نظم 'صاد'، کہانیوں کا مجموعہ 'تتلی کے پر'، ناولٹ 'مائل بہ کرم راتیں' اور حج کا مزاحیہ سفرنامہ 'اللہ میاں کے مہمان'۔

کمپیوٹر سے تعلق: پہلی بار کمپیوٹر کی ٹریننگ 1988 میں دفتر میں ہوئی اور 2000 میں انٹرنیٹ سے رابطہ ہوا۔ 2001 میں یاہو اردو کمپیوٹنگ گروپ کی تشکیل۔ اس عرصے میں کئی اردو ہندی اور کئی ہندوستانی زبانوں کے کی بورڈس، اردو اور ہندی کے نسخ فانٹس بنائے۔ 2005 میں 'سمت' (پہلا برقی رسالہ) شروع کیا۔ 2006 میں اردو محفل اسی سال برقی لائبریری کا آغاز، جو مختلف مفت ڈومینس میں ہوسٹ ہونے کے بعد اب 2013ء سے بزم اردو کے پلیٹ فارم سے جاری ہے۔

پتہ: مکان نمبر 9-1-25/A/1، ہاشمی نگر، لنگر ہاؤس، حیدرآباد، 500008 فون نمبر: 970080086

کے بارے میں جاننا ہوتا ہے، تو اس کا نام لکھ کر 'گوگل' کرتے ہیں۔ اس میدان میں 'گوگل' کی ایسی حکمرانی ہے کہ تلاش کرنا اور 'گوگل کرنا' ہم معنی ہو گئے ہیں۔ تو جب تک اردو تصویروں کی شکل میں تھی، گوگل اور اس قسم کے دوسرے سرچ انجنوں کی دسترس سے دور تھی۔ کہ یہ تصویریں تھیں، متن نہیں تھا۔ جب متن ہی انٹرنیٹ پر شامل ہونا شروع ہو گیا تو سرچ انجن بھی کامیاب ہونے لگے۔ انگریزی میں تلاش کرنے پر درست اسپیلنگ کا معلوم ہونا بھی ضروری تھا۔ فرض کیجیے کہ آپ میرا نام ہی تلاش کریں، اعجاز عبید انگریزی میں کتنی مختلف صورتوں میں لکھا جاتا ہے۔ اعجاز کو، Ajaz، Ejaz، Aijaz، Aejaz، Ejaaz، اور عبید کو بھی Ubaid، Obaid، Ubed، Obed کے طور پر لکھا جا سکتا ہے۔ اور مختلف اعجازوں اور عبیدوں کے بارے میں روابط ملیں گے، لیکن اگر اردو میں ہی تلاش کریں تو آپ کو یقیناً میرے بارے میں ہی روابط مل سکیں گے۔

یہی نہیں، بلکہ اگر آپ کو اگر اپنے مضمون میں کوئی اقتباس شامل کرنا ہے تو اسے بھی راست کاپی پیسٹ کر کے اپنے مضمون کو کمپیوٹر میں ہی ٹائپ کر سکتے ہیں۔ مثلاً آپ کسی کی شاعری پر کوئی مقالہ لکھ رہے ہیں، تو شاعر مذکور کے اشعار ٹائپ کرنے کی ضرورت نہیں، اگر ان کا متن ویب سائٹس پر مل جائے تو کاپی پیسٹ کیا جا سکتا ہے۔ اور آپ خود اردو میں ٹائپ نہ بھی کر سکتے ہوں یا کسی اور کمپیوٹر پر کام کر رہے ہوں جہاں اردو کی بورڈ دستیاب نہ ہو تو آپ کسی معلوم ویب سائٹ کھول کر جس چیز کی سرچ کرنا ہے، اس کا نام وہاں سے کاپی کر سکتے ہیں۔ جیسے غالب کے تصوف پر آپ کو مضمون لکھنا ہے۔ تو 'غالب' لفظ اور 'تصوف' لفظ کاپی کر کے گوگل کے سرچ باکس میں پیسٹ کر سکتے ہیں۔ اگر خود ہی ٹائپ کر سکیں تو بس ٹائپ کیجیے۔ یا کسی کے شعر کا ایک مصرع آپ کو یاد آ رہا ہے، تو وہ مصرع ٹائپ کیجیے اور سرچ کیجیے، یقین واثق ہے کہ معروف شعر ہونے کی صورت میں آپ کو مکمل شعر مل جائے گا۔

ع س: آپ ابھی کس پروجکٹ پر کام کر رہے ہیں؟

عجاز عبید: جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، 'سمت' اور 'بزم اردو لائبریری' ہی میرا بنیادی پروجیکٹ ہے۔ لیکن اپنی خدمات جہاں ضرورت ہوتی ہیں، اور میں جس کی اہلیت رکھتا ہوں، وہاں پیش کر دیتا ہوں۔

ع س: اردو کے عصری منظر نامہ سے متعلق آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ سوشل میڈیا اور اردو کے فروغ کے بارے میں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟

اعجاز عبید: اردو سے میں مایوس نہیں ہوں۔ کم از کم کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی حد تک۔ البتہ تعلیم و تدریس کی صورت حال بہت مایوس کن ہے۔ جب تک اردو داں طبقہ یہ طے نہ کر لے کہ ہم کو اپنے بچوں کو اردو پڑھانا ضروری ہے، اردو کی ترقی ممکن نہیں۔ افسوس یہ ہے کہ سوشل میڈیا میں نوجوان طبقہ اپنا کافی وقت لگا رہا ہے

(ضائع کر رہا ہے نہیں کہہ رہا ہوں کہ ممکن ہے اس کا مثبت استعمال بھی کیا جا رہا ہو) لیکن زیادہ تر پوسٹس اب بھی رومن میں ہی کی جا رہی ہیں۔ خود فیس بک بھی اردو میں عرصے سے دستیاب ہے۔ اردو والے اسے اردو میں ہی استعمال کریں اور اردو میں ہی ٹائپ کر سکیں تو بہتر ہوگا۔

ع س: ہم شکر گزار ہیں کہ آپ نے ہمیں وقت دیا۔ کیا آپ اپنی سبکدوشی کے بعد کے حالات کے بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گے؟

اعجاز عبید: سبکدوش ہونے کے بعد میرا زیادہ تر وقت بزم اردو لائبریری میں ہی گزر رہا ہے۔ اس کے علاوہ دینی سرگرمیاں بھی جاری ہیں۔ امریکہ اور سعودی عرب کے سفر بھی زیادہ ہونے لگے ہیں جہاں بچے مقیم ہیں۔

ع س: عام روش سے ہٹ کر آپ نے اردو زبان کی تعلیم کو سائنس وغیرہ کے مضامین پر کیوں ترجیح دی؟

اعجاز عبید: نہیں، تعلیم تو میں نے سائنس کی ہی حاصل کی۔ البتہ مادری زبان ہونے کی وجہ سے اردو سے تعلق کبھی ٹوٹا نہیں۔ بلکہ علی گڑھ کے زمانے سے ہی اس وقت ترقی اردو بورڈ کے اردو انسائکلو پیڈیا پروجیکٹ سے منسلک بھی تھا۔ اصطلاح سازی کمیٹیوں میں بھی حصہ لیا، اور انسائکلو پیڈیا کے لیے جیالوجی کے ہی موضوعات پر کئی مضامین بھی لکھے۔ 1970 سے 1980 تک۔ اب این سی پی یو ایل کے تحت ان کی کچھ جلدیں شائع ہو چکی ہیں، لیکن اتفاق سے جیالوجی والی جلد اب تک شائع نہیں ہو سکی۔ شاید اس کا بھی ذکر مجھے اردو کی ترویج میں اپنی خدمات کے ضمن میں کرنا تھا۔

ع س: تخلیقی اعتبار سے آپ کا نقطہ نظر کیا ہے؟

اعجاز عبید: میرا تعلق کسی ازم سے نہیں ہے اور میں یہی چاہتا ہوں کہ ادب بھی آزاد رہے۔ ادب اگر سچا ہے تو وہ پسند کیا ہی جائے گا۔ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے فلسفوں اور رجحانوں کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ شاعری میں مثلاً مجھے میر مومن اور مصحفی بھی اتنے ہی پسند ہیں جتنے فیض، ساحر، سردار جعفری اور ناصر کاظمی، عرفان صدیقی، زیب غوری، شہر یار اور ندا فاضلی۔

ع س: اردو کے فروغ کے لیے کس طرح کی سرگرمیوں کو فروغ دیا جائے؟

اعجاز عبید: اردو زبان کو محض شعر و ادب اور دینی سرگرمیوں کے علاوہ بھی استعمال کریں۔ جب تک دوسرے میدانوں میں اردو کا بول بالا نہیں ہوگا، اردو ترقی نہیں کر سکے گی۔ ہر جگہ اردو کے فروغ کے لیے آواز اٹھائیں۔ جہاں رہ رہے ہوں، وہاں کوشش کریں کہ سڑکوں، ریلوے اسٹیشنوں اور بس اسٹینڈس کے ناموں کو اردو میں لکھا جائے۔ مختلف فارمس وغیرہ اردو میں دستیاب ہوں۔ اردو میں ہی بات چیت اور خط و کتابت/ ای میل/ایس ایم ایس کریں۔ اور اپنے بچوں کو اردو تعلیم ضرور دیں۔

ع س: آپ اردو دنیا کے قارئین کو کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

اعجاز عبید: اپنے بچوں کو اردو میں تعلیم دیں۔ اگر آپ ہندو پاک سے باہر کسی ملک میں مقیم ہیں تو گھروں میں اردو ہی بولیں اور بچوں کو اردو بولنے پر مجبور کریں۔ اگر آپ اردو بولتے ہیں تو اردو لکھنا بھی سیکھیں، کمپیوٹر اور فون پر بھی اور ان کے علاوہ بھی۔ اور اردو ہمیشہ درست لکھنے کی کوشش کریں، دو الفاظ کے درمیان اسپیس چھوڑ کر، اور واحد لفظ میں غیر ضروری اسپیس نہ دے کر۔

جناب اعجاز عبید کی ویب سائٹس کی لنکس:

http://samt.bazmeurdu.net
http://lib.bazmeurdu.net
http://kitaben.urdulibrary.org

■

Dr. Mohd Abdul Aziz Sohail,
House No.: 4-2-75, Lateef Bazar,
Nizamabad (Telangana)
Aijaz Obed, H.No.9-1-25/A/1
Hashim Nagar Langar Houz
Hyderabad 500 008 (Telangana)
Mob.: 970080086

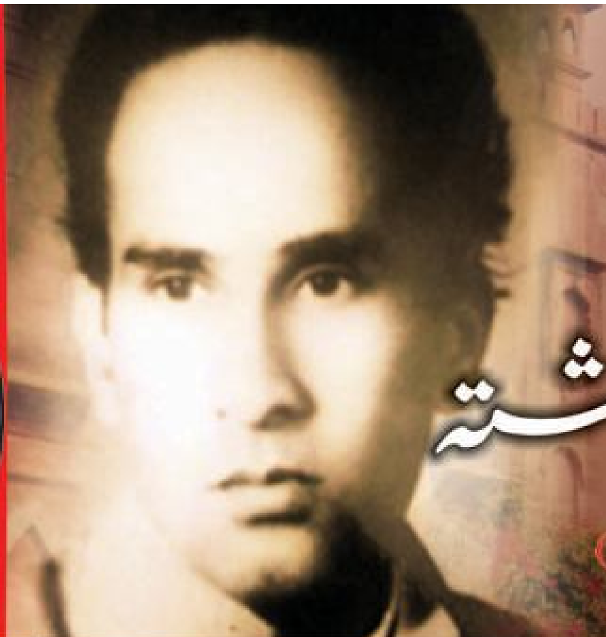

ابوالکلام قاسمی

بڑا ہے درد کا رشتہ

(خلیل الرحمٰن اعظمی کی یاد میں)

خلیل الرحمٰن اعظمی ہمارے ان اساتذہ میں تھے جنھوں نے بہت کم مدت میں اپنے علم وفضل کے گہرے نقوش ہمارے ذہنوں پر مرتسم کردیے۔ میرے پاس بی.اے کی سطح پر اردو باقاعدہ طور پر نہیں تھی اس لیے صرف ایک کورس ان سے پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہ کورس بھی میں نے ان سے براہِ راست کلاس میں پڑھنے کے شوق میں آفر کرلیا تھا، اس لیے کہ اس زمانے کے سمسٹر سسٹم میں بعض نصابات اپنی پسند سے بھی آفر کیے جاسکتے تھے۔ ایم.اے (اردو) میں داخلہ لینے کے بعد ہماری کلاس کو اعظمی صاحب نے اقبال بھی پڑھایا، نظم کا پرچہ بھی ان سے پڑھنے کا اتفاق ہوا اور تنقید کی بعض کلاسیں بھی انھوں نے لیں۔ وہ حسب توقع نہایت گہرائی کے ساتھ پوری تیاری کے بعد پڑھایا کرتے تھے۔ اگر کوئی طالب علم یہ سمجھ لیتا کہ ان کی کلاس کو نظر انداز کر کے اس موضوع پر بعض کتابیں پڑھ کر اس کمی کو پورا کرلے گا تو یہ بات پوری طرح غلط ثابت ہوتی۔ اس لیے کہ وہ جو کچھ پڑھاتے تھے وہ روایتی اور رسمی معلومات سے کہیں زیادہ ہوا کرتا تھا۔ مختلف رسائل میں اس موضوع پر کیا لکھا جاتا رہا یا پھر خود اعظمی صاحب نے اس موضوع پر بہت ساری چیزیں پڑھنے کے بعد خود ذاتی رائے کیا قائم کی؟ ان کی کلاس اس طرح کے سوالات کے جواب فراہم کیا کرتی۔ متن کی تشریح وتعبیر کا ان کا اپنا الگ انداز ہوتا۔ یونیورسٹیوں میں بالعموم جس چیز پر سب سے کم توجہ صرف کی جاتی ہے وہ تفہیم متن ہے۔ ہم علی گڑھ والوں کو ہمیشہ اس بات کا اعتماد رہتا کہ ہمارے اساتذہ کلاسیکی نثر ونظم بالخصوص قصیدہ، غزل اور قدیم نثری متون بڑی وضاحت سے تمام لسانی اور ادبی نزاکتوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے پڑھاتے تھے۔ یہ محض اتفاق تھا کہ خلیل صاحب نے ہم لوگوں کو ایم.اے میں ایک ساتھ کئی پرچے پڑھانے کے بعد اپنی علالت کے سبب لمبی چھٹی لے لی تھی۔ ایک ڈیڑھ سال کی فرصت کے بعد وہ اپنے کام پر واپس بھی آئے تو زیادہ کلاسز کو باقاعدہ نہیں پڑھا سکے۔ اس لیے کہ اس وقت تک ان کی صحت خاصی ناگفتہ بہ ہوچکی تھی۔ جہاں تک ان کی علالت اور اس سے متعلق مسائل کا سوال ہے تو اس پر گفتگو قدرے بعد میں ہوگی۔

خلیل الرحمٰن اعظمی کا تعلق جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ اعظم گڑھ سے تھا جہاں سے برگشتہ ہوکر وہ اپنے لڑکپن میں ہی علی گڑھ آگئے تھے۔ ان کی ابتدائی شاعری میں اس برگشتگی اور بن باس کے متعدد حوالے ملتے ہیں۔ ان میں سے ایک جذباتی حوالہ کچھ اس طرح ان کی ایک نظم میں آیا ہے:

کون سا وقت تھا جب میں نے لیا تھا بن باس
ایک جھونکا بھی ہوا کا نہ وطن سے آیا
نہ کوئی نکہت گل اور نہ کوئی موج نسیم
پھر کوئی پوچھنے مجھ کو نہ چمن سے آیا
آم کے پیڑ پہ جو نام لکھا تھا میں نے
دل کے زخموں کی طرح اب بھی وہ تازہ ہوگا
میرے احباب اسے دیکھ کے کہتے ہوں گے
جانے کس دیس میں بے چارہ بھٹکتا ہوگا
یوں تو کہنے کی نہیں بات مگر کہتا ہوں
پیار کا نام کتابوں میں لکھا دیکھا ہے
جب بھی ہاتھ بڑھایا ہے کسی کی جانب
فاصلہ اور بھی بڑھتا ہی ہوا دیکھا ہے

جب خلیل صاحب علی گڑھ آگئے تو یہیں کے ہوکر رہ گئے۔ شعر وادب سے دلچسپی ابتدا سے ہی تھی۔ انھوں نے ہائی اسکول یا انٹرمیڈیٹ تک کی تعلیم اپنے وطن میں ہی حاصل کی تھی۔ ان کا خاندان شروع سے ہی علم دوست رہا تھا۔ شاید انھیں کے اجداد نے وہاں مدرسۃ الاصلاح کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا تھا جہاں کے فارغ التحصیل طلبا نے عربی اور دینی علوم میں غیر معمولی کارنامے انجام دیے اور ہنوز دے رہے ہیں۔ خلیل صاحب کو بچپن سے ہی اردو کے ادبی سرمایے سے گہری دلچسپی تھی۔ انھوں نے اپنے لڑکپن میں ہی بعض علمی رسائل نکال رکھے تھے۔ ان کے اسکول کے زمانے کے دوست اور ساتھی ان کی اُٹھان کے بڑے معترف رہے۔ جس زمانے میں خلیل صاحب کی ناگہانی وفات ہوئی تھی اس موقع پر اس طرح کی متعدد تحریریں شائع ہوئی تھیں جن میں ان کے اسکول کے زمانے کی دلچسپیوں کا تفصیلی ذکر تھا۔ یہ تو نہیں معلوم کہ اعظم گڑھ چھوڑ کر علی گڑھ آنے پر ان کو کن لوگوں کی سرپرستی حاصل رہی۔ تاہم بی.اے کی تعلیم کے دوران ہی ان کی شاعری اور نثر کی مقبولیت کا چرچا علی گڑھ میں عام ہوگیا تھا۔ خلیل صاحب نے بی.اے کے زمانے میں ہی آتش لکھنوی کی عشقیہ شاعری پر ایک طویل مضمون لکھا تھا جو نہ صرف یہ کہ 'نگار' لکھنؤ میں بڑے اہتمام کے ساتھ شائع ہوا بلکہ نیاز فتح پوری نے اس پر اپنا نوٹ بھی لکھا جس میں خلیل صاحب کو بڑے طمطراق کے ساتھ متعارف کرایا گیا تھا۔ اس زمانے میں رسالہ 'نگار' کا شمار اردو کے ممتاز رسالوں میں ہوا کرتا تھا اور نیاز صاحب کی کاٹ دار تحریروں اور اداریوں کی وجہ سے اس کی انفرادیت بہت نمایاں تھی۔ چنانچہ خلیل صاحب کو اپنی ناقدانہ حیثیت منوانے کے لیے زیادہ جدوجہد نہیں کرنی پڑی اور ادبی حلقوں میں وہ راتوں رات قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے تھے۔ رشید احمد صدیقی اس زمانے میں شعبۂ اردو کے صدر تھے اور آتش والے مضمون کے باعث خلیل

صاحب ان کے منظور نظر بن چکے تھے۔ اس لیے جب وہ اردو میں ایم اے کر رہے تھے تو ان کی حیثیت ایک معروف ادیب اور شاعر کی بھی تھی جس نے روز بروز ان کے ادبی اعتبار میں اضافہ کیا۔ خلیل صاحب اپنی طالب علمی کے زمانے میں کبھی ٹیوشن اور کبھی اپنی تحریروں کے ذریعے اپنی معاشی ضروریات کی تکمیل کرتے رہے۔ انھوں نے اپنی طالب علمانہ زندگی خالصتاً ادیبانہ اور فن کارانہ انداز میں گزاری۔ ان کی دلچسپی کا سب سے بڑا مرکز تو مطالعہ اور علمی و ادبی مباحث ہوا کرتے تھے مگر ان کی باخبری اور افادیت کے باعث ان کے گرد شعری اور ادبی دلچسپی رکھنے والے طلبا کا جمگھٹا رہا کرتا تھا۔ ان کے خاص دوستوں میں ایک صاحب ہوا کرتے تھے جن کا نام حنیف خاں ناشاد تھا، جن کے ساتھ خلیل صاحب ایم اے کے بعد کی بے کاری کے عرصے میں ان کے وطن بہار جا کر کئی ماہ کے لیے قیام کر آئے تھے۔ انجم اعظمی اور شہریار وغیرہ ان کے احباب میں قدرے بعد میں شامل ہوئے۔ مگر علی گڑھ کے امیر نشاں اور کیفے ڈی لیلی ریستوراں میں ان کے ساتھ ان کے احباب کی مجلسیں اسی زمانے میں مثالی شہرت اور مقبولیت اختیار کر چکی تھیں۔ اپنی شام کی محفلوں میں بالعموم خلیل صاحب اپنی معلومات سے محفل کو گل و گلزار بنائے رکھتے تھے۔ ویسے ان کی محفلوں میں عموماً شعر و ادب کی باتیں ہوا کرتی تھیں یا نئے ادبی رسائل، شاعری اور افسانوں پر گفتگو رہا کرتی تھیں۔ سید امین اشرف دو تین سال پہلے تک جب تک وہ زندہ رہے ان کی محفلوں کو یاد کرتے رہے اور سید شاہد مہدی ہنوز خلیل صاحب کی ادبی محفلوں کو ان کی ساری تفصیل کے ساتھ یاد کیا کرتے ہیں۔ خلیل صاحب کے 'نگار' میں آتش پر مضمون کی اشاعت اور مقبولیت کا سلسلہ روز بروز اس طرح دراز ہوا کہ لگاتار ہندوستان اور پاکستان کے نمائندہ رسالوں کے لیے وہ اپنی شاعری اور تنقید بھیجتے رہے اور ان کی تحریریں بڑے اہتمام سے شائع ہوتی رہیں۔ انھوں نے ادبی حلقوں میں اپنی شہرت کو نہ تو کبھی سستی شہرت میں بدلنے دیا اور نہ اس شہرت کو کبھی محض اپنی ذاتی ضرورت یا کسی طرح کے چھوٹے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ ان کے احباب اور حلقۂ اثر میں جہاں کسی شخص میں ادبی استعداد نظر آتی یا کوئی نوجوان عمدہ شاعری یا افسانہ سناتا، خلیل صاحب اسے اپنی سفارش کے ساتھ کسی نہ کسی ممتاز رسالے میں اشاعت کے لیے بھیج دیتے۔ اس طرح یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کے بیش تر احباب کی ادبی شہرت خلیل صاحب کی توجہ اور ہمت افزائی کی مرہون منت تھی۔ ایسے احباب میں سید امین اشرف، شاہد مہدی، شہاب جعفری، انجم اعظمی، حسن نعیم جیسے متعدد لوگ شامل تھے۔ ریستوراں کی محفلوں میں دیر دیر تک چائے پی جاتی، ادبی بحثیں کی جاتیں، نمائندہ ادبی رجحانات کی معنویت پر غور و خوض کیا جاتا اور لگاتار بحث و تمحیص کے نتیجے میں خلیل صاحب کی صحبتیں علی گڑھ کے ادبی فیصلوں کا محور بنی رہتیں۔ ان محفلوں میں جملہ بازیاں بھی ہوتیں، لطیفے بھی وجود میں آتے اور بعض کم سواد ادبی نو واردوں کا مذاق بھی اڑایا جاتا تھا۔ یہ تب کی بات ہے جب خلیل صاحب کو شعبۂ اردو میں لکچر بنے ابھی کچھ ہی سال گزرے تھے۔ سرور صاحب لکھنؤ کی ملازمت چھوڑ کر

خلیل صاحب رسالوں اور کتابوں میں لگاتار اپنی موجودگی کا احساس دلانے والے شاید واحد ادیب تھے جن سے ہند و پاک کا ہرادیب یا ادب دوست نہ صرف واقف تھا بلکہ اعتبار کی نظر سے دیکھتاتھا۔ ان کو اپنے زمانے کی تحریروں سے ہی نہیں مختلف رسائل کی فائلوں میں شائع شدہ ہرصنف ادب سے اور اس سے بننے والے رجحانات سے پوری واقفیت رہا کرتی تھی اور ان کا یہ علم اس قدر مستحضر تھاکہ ہرادبی اور علمی ضرورت کا مارا ہوا آدمی ان سے رجوع کرنے کی کوشش کرتاتھا۔

علی گڑھ واپس آ چکے تھے اور اپنے پیچھے جن طالب علموں کو لکھنؤ چھوڑ آئے تھے ان میں سے بعض ان کے مشورے سے علی گڑھ آ گئے تھے۔ ان میں ایک صاحب ایسے بھی تھے جو باتیں تو بڑی بڑی کرتے تھے مگر ان کی ادبی واقفیت برائے نام ہی تھی۔

خلیل الرحمٰن اعظمی شروع میں کافی دنوں تک ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے۔ اس وقت علی گڑھ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی جو محفلیں ہوا کرتی تھیں ان کے سرپرستوں میں ڈاکٹر عبدالعلیم اور نوجوان محرکوں میں خلیل صاحب ہی ہوا کرتے تھے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی اور باقر مہدی، اس زمانے کی اپنی ترقی پسندی اور انتہا پسندی کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ باقر مہدی کے ساتھ ان کی رفاقت زمانۂ طالب علمی سے تھی۔ اس درمیان تقسیم ہند کے نتیجے میں چھوٹے ہوئے فسادات کے زیر اثر علی گڑھ سے دہلی جاتے ہوئے فسادیوں نے خلیل الرحمٰن اعظمی اور باقر مہدی کو مار پیٹ کر ٹرین سے باہر جمنا کے کنارے پھینک دیا تھا۔ اتفاق سے دونوں کی سانس باقی تھی اور دونوں کسی طرح ہاسپٹل پہنچا دیے گئے تھے جہاں انھیں نئی زندگی ملی۔ مگر خلیل صاحب کے حواس پر عرصۂ دراز تک اس حادثے کا غیر معمولی اثر رہا اور ان کی نفسیات اس حادثے کی ہیبت سے بقول ان کے ساری زندگی باہر نہ نکل سکی۔ شاید ان دونوں کو بعد میں جامعہ ملیہ میں جا کر پناہ ملی تھی۔

علی گڑھ کے شعبۂ اردو میں اساتذہ تو بہت سے تھے مگر کسی کو یہ شرف حاصل نہیں تھا کہ ہند و پاک کے زیادہ تر لکھنے والوں سے اس کے گہرے ادبی اور ذاتی تعلقات قائم رہے ہوں۔ خلیل صاحب رسالوں اور کتابوں میں لگاتار اپنی موجودگی کا احساس دلانے والے شاید واحد ادیب تھے جن سے ہند و پاک کا ہر ادیب یا ادب دوست نہ صرف واقف تھا بلکہ اعتبار کی نظر سے دیکھتا تھا۔ ان کو اپنے زمانے کی تحریروں سے ہی نہیں مختلف رسائل کی فائلوں میں شائع شدہ ہر صنف ادب سے اور اس سے بننے والے رجحانات سے پوری واقفیت رہا کرتی تھی اور ان کا یہ علم اس قدر مستحضر تھا کہ ہر ادبی اور علمی ضرورت کا مارا ہوا آدمی ان سے رجوع کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ کوئی تحریر کب چھپی، کہاں چھپی، کون سا شعر کس کا ہے، کس شعر کا پہلا یا دوسرا مصرع کیا ہے، فلاں بات جس شعر میں کہی گئی ہے وہ شعر کیا ہے؟ غرض یہ کہ اس نوع کے ہر سوال کا جواب خلیل صاحب اپنے مستحضر علم سے ضرور دے دیا کرتے تھے۔ ان کے استاد رشید احمد صدیقی کے جو خطوط ان کے نام شائع ہو چکے ہیں ان میں اس نوع کے سوالات اور استفسار کی بڑی لمبی فہرست شامل ہے۔ یعنی ان کے حافظے اور علمی و ادبی واقفیت کے ان کے اساتذہ بھی قائل تھے۔ رسالوں میں چلنے والی ادبی بحثوں میں وہ عموماً بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے اور ہمیشہ اپنی بالادستی برقرار رکھتے تھے۔ اگر ان کے یا ان کے کسی ادبی ہم مشرب کی شاعری یا زبان میں بلاوجہ کوئی نقص نکالا جاتا تو خلیل صاحب اس کی مدافعت میں اساتذہ کی تحریروں سے چھوٹے موٹے نقائص تک کی سند بھی بڑی آسانی سے فراہم کر دیا کرتے تھے۔ رشید احمد صدیقی ان کے محض استاذ ہی نہیں گویا کہ ان کے سرپرست تھے۔ خلیل صاحب کی لائبریری میں ہنوز رشید صاحب کے لکھے ہوئے اَن گنت چھوٹے چھوٹے پرچے یا پرچیاں محفوظ ہیں جن پر آدھا، یا نامکمل شعر یا جیسا کہ عرض کیا

گیا کہ کوئی علمی حوالہ دریافت کرنے کی خاطر استفسار کی نوعیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

جیسا کہ شروع میں ذکر کیا گیا کہ مجھے خلیل صاحب سے شرف تلمذ 1972 کے بعد ہوا جب خلیل صاحب کی صحت خاصی خراب ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے ایم اے کے زمانے میں اکثر ان کو اپنے شعبے کے کمرے میں کسی نہ کسی کتاب کے مطالعے میں غرق دیکھا یا پھر وحید اختر یا وارث کرمانی یا وقار حسین یا سلامت اللہ خاں صاحب ان کے پاس ہوتے اور سب کسی نہ کسی ادبی مسئلے پر مصروف گفتگو ہوا کرتے۔ یہ بات اس لیے بھی قابل ذکر ہے کہ میں نے محض اپنے شعبۂ اردو میں ہی نہیں بلکہ زیادہ تر ڈپارٹمنٹ میں اساتذہ کے کمروں میں اس طرح کی خوش گپیوں کی محفلیں ہوتے دیکھی ہیں گویا شرکائے محفل ڈپارٹمنٹ میں نہیں کسی کلب میں بیٹھے ہوں۔ وہ لوگ غنیمت ہیں جو ادبی یا علمی بحث و مباحثہ میں مصروف رہتے ہیں ورنہ تو زیادہ تر اساتذہ خالی ہاتھ، خالی میز اور خالی الماری کے ساتھ پوری طرح مخلع بالطبع رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں اور یونیورسٹی کی ملازمت جو انھیں میسر ہوتی ہے اس پر اس قدر مطمئن ہوتے ہیں جس قدر مطمئن بادشاہوں یا درباروں کے وظیفہ خوار درباری بھی نہ رہا کرتے ہوں گے۔ خلیل صاحب کا کبھی کوئی خاص پسندیدہ موضوع یا مضمون نہیں تھا۔ وہ غزل، نظم، قصیدہ اور نثر میں فکشن پر بھی یکساں دسترس اور مہارت کے ساتھ لکچر دیا کرتے تھے۔ ان کا حافظہ غضب کا تھا۔ ایک بار پاکستان سے سلیم احمد کے بھائی شمیم احمد اور اطہر نفیس علی گڑھ آئے تھے، اس طرح کے ادیب و شاعر عموماً یا تو خلیل صاحب کے گھر ٹھہرتے تھے یا کہیں اور ٹھہرتے تو زیادہ تر وقت خلیل صاحب کے ساتھ گزار کر جایا کرتے تھے۔ پاکستان واپس جانے کے بعد شمیم احمد نے نسیم درّانی کے رسالے 'سیپ' میں اپنا سفرنامہ یا علی گڑھ کے سفر کی روداد لکھی تھی۔ یہ روداد زیادہ تر خلیل صاحب کی محفلوں اور ان سے ہونے والی ادبی گفتگو کی تفصیلات پر مبنی تھی۔ اس روداد میں خلیل صاحب کے حافظے، مستحضر علم اور اردو ادب کے معاصر منظرنامے پر ان کی گہری دسترس کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا گیا تھا۔ اسی طرح جب بھی کسی رسالے میں چھپنے والی کسی بحث میں خلیل صاحب نے حصہ لیا یا کسی موضوع کا تحریری جائزہ لیا تو اس سے خلیل صاحب کے علمی تبحر کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا تھا اور ان کے حاضراتی دانش وری کا بھی۔ اس سلسلے میں سوغات کے نظم جدید نمبر میں خلیل صاحب کے خیالات یا شب خون کے بعض مباحث کو یاد کیا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں اگر ن م راشد پر خلیل صاحب کے مضمون کا ذکر کیا جائے تو کوئی بے محل بات نہ ہوگی۔ جب شہریار اور مغنی تبسم نے شعر و حکمت کا راشد نمبر نکالنے کی ٹھانی تو ن م راشد پر پہلی بار ایک ساتھ متعدد سنجیدہ اور تجزیاتی مضامین جمع کر کے شائع کیے گئے۔ اس میں خلیل صاحب کے علاوہ دوسرے کئی نکتہ رس اور ممتاز نقادوں کے مضامین شامل تھے، مگر راشد نے خود ایک جگہ لکھا ہے کہ مجھے اگر کسی نے پہلی بار گہری سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش کی تو وہ خلیل الرحمٰن اعظمی ہیں۔

میں نے اپنے ایم اے کے زمانے میں اکثر ان کو اپنے شعبے کے کمرے میں کسی نہ کسی کتاب کے مطالعے میں غرق دیکھا یا پھر وحید اختر یا وارث کرمانی یا وقار حسین یا سلامت اللہ خاں صاحب ان کے پاس ہوتے اور سب کسی نہ کسی ادبی مسئلے پر مصروف گفتگو ہوا کرتے۔ یہ بات اس لیے بھی قابل ذکر ہے کہ میں نے محض اپنے شعبۂ اردو میں ہی نہیں بلکہ زیادہ تر ڈپارٹمنٹ میں اساتذہ کے کمروں میں اس طرح کی خوش گپیوں کی محفلیں ہوتے دیکھی ہیں گویا شرکائے محفل ڈپارٹمنٹ میں نہیں کسی کلب میں بیٹھے ہوں۔

خلیل الرحمٰن اعظمی ادیب و شاعر تو اعلیٰ درجے کے تھے ہی ادیب اور شاعر گر بھی تھے، جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ انھوں نے انجم اعظمی، امین اشرف، شہاب جعفری، حسن نعیم اور شہریار جیسے ہونہار لوگوں کو صحیح معنوں میں شاعروں کی صف اول میں لانے کی ساری سبیلیں پیدا کیں۔ شہریار سے ان کے خصوصی تعلقات تھے، عرصے تک شہریار، خلیل الرحمٰن اعظمی کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ خلیل صاحب انھیں کنور صاحب کہا کرتے تھے اور ان کی شاعری کی نوک پلک درست کرنے میں ان کا سب سے اہم رول تھا۔ شہریار چوں کہ خود بھی غیر معمولی اپج اور ٹیلنٹ کے شاعر تھے اس لیے ان کو بہت زیادہ کسی سہارے کی ضرورت نہ تھی۔ تاہم خلیل صاحب سے ان کی رفاقت مثالی تھی۔ یاد آتا ہے کہ ہماری طالب علمی کے زمانے میں جب کسی مشاعرے یا نشست میں خلیل صاحب اور شہریار دونوں ہوتے تو بعض لوگ کہتے کہ ایسا لگتا کہ شہریار کی شاعری میں بہت سے مصرعے خلیل نے اپنے شامل کر دیے ہوں، مگر ہماری رائے یہ تھی کہ خلیل صاحب نے شہریار کی لاکھ ہمت افزائی کی ہو، ان کو اس زمانے کے ادبی منظرنامے میں منفرد مقام دلوایا ہو، ادبی سیاست میں ان کی بالادستی کی تدبیریں کی ہوں مگر شاعری کے معاملے میں خود شہریار، خلیل صاحب سے کچھ زیادہ ہی جودت طبع کے مالک تھے۔ اس بات کا اندازہ دونوں کی شاعری کے موازنے سے بھی کیا جا سکتا ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی نے اپنی کتابیں بلکہ اپنی پوری لائبریری بڑی احتیاط اور حفاظت سے رکھی تھی۔ شہریار بتاتے تھے کہ خلیل صاحب اپنی میز کرسی کے قریب ردّی پھینکنے کے لیے کوڑا دان نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے کہ وہ رسالوں، کتابوں اور دوسری تحریروں سے متعلق کسی کاغذ کو ضائع نہیں ہونے دیتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بچوں میں سب سے ہونہار اور سعادت مند صاحب زادے سلمان خلیل نے جو میڈیکل کالج میں استاذ ہیں، ہر چیز کو بڑی احتیاط سے رکھا ہے اور ہنوز اس لائبریری سے استفادہ کرنے والوں کے ساتھ تعاون کرتے رہتے ہیں۔ ان کی کوئی اولاد ادیب تو نہیں مگر سلمان خلیل اب تو شعر و ادب سے خاصا شغف پیدا کر چکے ہیں۔ دراصل خلیل صاحب کی بیگم راشدہ خلیل نے بعد کے زمانے میں بزم خواتین کے نام سے ادب دوست خواتین کی ایک انجمن بنائی جو تقریباً دو دہائیوں سے سرگرم عمل ہے۔ 'بزم خواتین' کے نام سے ہی اس انجمن کا ایک سالانہ رسالہ بھی نکلتا ہے جس میں بہت ممتاز اور معیاری تو نہیں لیکن بہت سی عمدہ اور نمائندہ تحریریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ سلمان خلیل ان تمام معاملات میں اپنی والدہ کا ہاتھ بٹاتے ہیں، تحریریں جمع کرتے ہیں، انجمن کے پلیٹ فارم پر خواتین کی حاضری کو یقینی بناتے ہیں، رسالے کی طباعت و اشاعت کی دیکھ ریکھ کرتے ہیں اور تمام معاملات میں بڑی ہنرمندی اور احتیاط کا ثبوت دیتے ہیں۔ بیگم راشدہ خلیل کبھی باقاعدہ ادیب نہیں رہی تھیں مگر اپنی ان تمام مصروفیات کے نتیجے میں وہ بھی اپنے اندر گہری ادب شناسی پیدا کر چکی ہیں اور ہر شمارے میں خاصے معلوماتی اور ادیبانہ اداریے لکھتی ہیں۔ صحیح معنوں میں خلیل الرحمٰن اعظمی کی ادبی روایت کو ان کی بیگم اور بیٹے سلمان نے بڑی عمدگی کے ساتھ برقرار رکھا ہے اور کوشش کی ہے ان کے جمع کردہ رسائل و کتب اور دوسری تحریریں علمی صدقۂ جاریہ کا وسیلہ بن جائیں۔

■

Prof. Abul Kalam Qasmi, Dept of Urdu, Aligarh Muslim University, Aligarh - 202002

بدر محمدی

اردو کی ابتدائی تعلیم

اردو ایک زندہ زبان ہے اس لیے کہ اس میں زندگی اور زندگی کی تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں اور اس لیے بھی کہ اردو زبان میں افراد کو زندہ رکھنے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے۔ طرز معاشرت سے تعلق کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ اردو ایک زبان ہی نہیں تہذیب بھی ہے۔ یہ میل جول اور ہم آہنگی کی زبان ہے۔ اردو کے الفاظ ہمارے احساسات و جذبات کی بہت خوب صورت ترجمانی کرتے ہیں۔ اردو میں دوسری زبانوں کے الفاظ اور غیر ملکی زبانوں کو جذب کرنے کی صلاحیت ہے۔ اردو کا رشتہ ایک جانب دینی مدارس سے ہے تو دوسری طرف یہ زبان مشاعرے اور فلم سے بھی منسلک ہے۔

اردو کا مولد و مسکن ہندوستان ہے۔ یہ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی آئینہ دار ہے۔ تحریک آزادی کی لڑائی اردو میں ہی لڑی گئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ کئی رہنماؤں کو تحریک آزادی کے دوران اردو سیکھنی پڑی تھی۔ لہٰذا اجداد کی وراثت کے تحفظ اور اپنے تشخص کی بقا کے لیے اردو سے ہماری وابستگی ضروری ہے۔ ہند اور بیرون ہند کی کئی یونیورسٹیوں میں اردو داخل نصاب ہے۔ کئی ایسے ادارے ہیں جہاں ابتدائی سے اعلیٰ درجے تک کی تعلیم اردو میں دی جاتی ہے۔ ملک کی ریاستی اردو اکیڈمیاں اس زبان کی اہمیت وافادیت پر دال ہیں۔ مقابلہ جاتی امتحانات میں اختیاری مضمون کی حیثیت سے اردو کی مقبولیت بڑھتی جارہی ہے۔ اردو پڑھ کر طلباء وطن سے دور وابستۂ روزگار ہورہے ہیں۔

زبان اردو کی تمام تر افادیت کا تعلق اعلیٰ تعلیم سے ہے۔ ابتدائی تعلیم سے اس کا کوئی سروکار نہیں۔ لیکن اعلیٰ تعلیم بغیر ابتدائی تعلیم کے ممکن نہیں۔ ابتدائی تعلیم زینۂ اول کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے مزید تعلیم کی اہلیت پیدا ہوتی ہے۔ بنیادی تعلیم صلاحیت کو جلا بخشتی ہے۔ مزید یہ کہ ابتدائی تعلیم سے ہی انسان کی صلاحیت پرکھی جاتی ہے۔ ابتدائی تعلیم بڑی اہمیت کی حامل ہے اور اردو جیسی کارآمد زبان کے لیے تو یہ اور بھی اہم ہے۔ حصول علم بہترین مصروفیت ہے۔ یہ ایسا زیور ہے جس سے آراستہ ہوکر آدمی غیر معمولی جاذبیت کا مالک بن جاتا ہے۔

حصول تعلیم کے لیے کسی زبان کا جاننا ضروری ہے۔ کسی بھی زبان کی پختہ معلومات اس کے لکھنے پڑھنے کے ساتھ بولنے سے بھی ہے۔ صحیح تلفظ کی ادائیگی ہر زبان کے لیے ضروری عمل ہے اور جو شخص اردو الفاظ کا تلفظ بخوبی ادا کرتا ہے اس کے لیے دوسری زبانوں کا تلفظ آسان ہوجاتا ہے۔ اس طرح اردو کی ابتدائی تعلیم کی اہمیت نہ صرف زبان کے لیے بلکہ دوسری زبانوں کے لیے بھی اہم ہوجاتی ہے۔ اردو کی حیثیت مادری زبان کی بھی ہے۔ اور ابتدائی تعلیم مادری زبان میں دینا سود مند ہے۔ لہٰذا اردو ذریعۂ تعلیم کی اچھی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ ہر نوعیت کے مضمون کے لیے ذریعۂ تعلیم بن سکتی ہے۔

ابتدائی تعلیم کی نسبت عام طور سے عمر کے ابتدائی حصے سے ہوتی ہے۔ اور عمر کا ابتدائی حصہ لہو ولعب میں گذرتا ہے۔ گھر کی خوشیاں، قصے کہانی، ہنسی مذاق اور کھیل کود سے الگ کرکے، بچوں کو پڑھائی کی طرف راغب کرنا آسان کام نہیں۔ اس عمر کی تعلیم مفت ہونے کے باوجود ایک مہنگا عمل ہے۔ کیونکہ ابتدائی عمر زندگی کے آغاز کی مدت ہوتی ہے۔ اس عمر میں آدمی تجربات زیست سے تہی دست ہوتا ہے۔ اور ناتجربہ کاری میں کسی سے کوئی کام کرانے کے لیے غیر معمولی تجربے کی ضرورت ہوتی

ہے۔ یہ تجربہ اساتذہ اور والدین دونوں کے لیے لازمی ہے۔ والدین کو چاہیے کہ وہ بچوں کو صرف اور صرف تعلیم کی راہ پر ڈالیں۔ انھیں کسی اور کام پر لگانے کی نہ سوچیں۔ بچوں کو اسکول بھیجنے کے ساتھ گھر پر بھی تعلیمی ماحول قائم رکھیں۔ اسی معنی میں کہا جاتا ہے کہ ماں کی گود مکتب اول ہے۔ اساتذہ کو چاہیے کہ وہ طلباء کی سیرت سنوارنے میں دلچسپی دکھائیں۔ ان کی طبیعت کا میلان بچوں اور نوجوانوں کی تشکیل پارہی شخصیت کی طرف ہو۔ اعلیٰ تعلیم مختلف ذرائع سے ممکن ہے مثلاً کالج یونیورسٹی، فاصلاتی نظام تعلیم، کتب خانہ اور اخبارات و رسائل۔ مگر ابتدائی تعلیم معلم کے بغیر ممکن نہیں حتیٰ کہ ابتدائی تعلیم کے لیے اعلیٰ تعلیم یافتہ معلمین ہی درکار ہیں۔ ابتدائی تعلیم کے اساتذہ میں احساس ذمے داری، فرض شناسی، معاملہ فہمی، خوش اخلاقی، خندہ پیشانی، خلوص و ہمدردی، صبر و استقلال، خود اعتمادی، اصول و ضوابط کی پابندی، وضع کی سادگی، بے تعصبی اور مساوات کا سلوک جیسے عام اوصاف کے ساتھ علمی لیاقت، زبان دانی، تعلیمی تجربہ، مطالعے و مشاہدے کا شوق، بچوں کی نفسیات سے واقفیت، تدریسی صلاحیت، ذوق تربیت، موثر انداز بیان، عام فہم سادہ سلیس زبان پر قدرت، جدید تعلیم اور نئے طریقوں پر عبور

> بنیادی تعلیم کی بہتری کے بغیر اعلیٰ تعلیم کی حصولیابی ممکن نہیں ہے۔ اس لیے ابتدائی تعلیم پر خاص توجہ دی جاتی رہی ہے۔ اس توجہ کا حال یہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم بے توجہی کی شکارہو گئی ہے اور اعلیٰ تعلیم کے فقدان کا رونا رویا جارہا ہے۔لیکن اتنی ساری توجہ کے باوجود ابتدائی تعلیم کی صورت حال بھی کچھ اچھی نہیں ہے۔

جیسے خصوصی اوصاف بھی ہونے چاہئیں تاکہ طلباء کے لیے وہ مرکز توجہ قرار پائیں۔

ابتدائی تعلیم میں بولنا، پڑھنا، لکھنا اور تحریر و تقریر کا سمجھنا شامل ہے۔ بولنے میں تلفظ کی صحیح ادائیگی، پڑھنے میں روانی اور لکھنے میں املا کی درستگی کے ساتھ ساتھ تخلیقی صلاحیت اور مفہوم تک رسائی بھی لازمی ہے۔ بچوں کی نفسیات و فطرت، قدرت کا ایک حیرت انگیز راز ہے۔ بچوں میں جبلت تجسس اور نقالی کا وصف زیادہ ہوتا ہے۔ لہٰذا ان کے روزمرہ کی زندگی اور نصاب میں تال میل ہونا چاہیے۔ تاکہ انہماک کے ساتھ وہ شوق انگیز مضامین پڑھ سکیں۔ نصاب کے معاملے میں طلبا کی عمر، مدت طالب علمی، دلچسپی اور صلاحیت کا پاس رکھنا چاہیے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ نصاب بچوں کی نفسیات سے قریب تر ہو جس کا آزمودہ نمونہ برسوں سے عمل میں رہا ہے لیکن کچھ برسوں سے نصابی تجربات نے تجربات کے سوا کچھ نہیں کیا۔ ان تجربات نے آسمانی خواب تو ضرور دکھائے لیکن زمینی تعبیر سے محروم ہی رکھا۔ الغرض اردو کی ابتدائی تعلیم کے لیے اچھے نصاب کا تعین ضروری ہے۔ ذخیرۂ الفاظ کی توسیع کے لیے لائبریری، کتب اور لغت کا استعمال تدریسی و امدادی ذرائع کے طور پر ہونا چاہیے کتاب با تصویر اور زبان سہل و دل نشیں ہونی چاہیے۔ قواعد پر زور دیا جانا چاہیے تاکہ اس لحاظ سے زبان کا درست استعمال ہو۔ حصول تعلیم کے دوران نتائج سے آگاہی کے لیے امتحان کی اہمیت بتائی جانی چاہیے۔ ابتدائی تعلیم، اعلیٰ تعلیم کے مقابلے سستی ہونی چاہیے۔ تاکہ تمام بچوں کے پاؤں اسکول کی راہ میں اٹھ سکیں۔

بنیادی تعلیم کی بہتری کے بغیر اعلیٰ تعلیم کی حصولیابی ممکن نہیں ہے۔ اس لیے ابتدائی تعلیم پر خاص توجہ دی جاتی رہی ہے۔ اس توجہ کا حال یہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم بے توجہی کی شکار ہو گئی ہے اور اعلیٰ تعلیم کے فقدان کا رونا رویا جارہا ہے۔ لیکن اتنی ساری توجہ کے باوجود ابتدائی تعلیم کی صورت حال بھی کچھ اچھی نہیں ہے۔ اور کم وبیش یہی حال اردو کی ابتدائی تعلیم کا بھی ہے۔ زبان کا تعلق تہذیب سے ہونے کے باعث اس کی تعلیم کا انحصار ماحول پر ہوتا ہے۔ اردو کی تعلیم بھی ماحول سے متاثر ہے۔ ذریعۂ تعلیم میں اردو کی کمی واقع ہو رہی ہے۔ اردو سیکھنے والے طلباء لکھنے پڑھنے اور بولنے میں جھجک محسوس کرتے ہیں۔ ان میں تلخیص اور توضیح کی صلاحیت کم پائی جاتی ہے۔ مطالعے کا شوق بھی کم ہوتا ہے۔ طلبا کے سوالات سے استاد احتراز کرتے ہیں۔ ان کے اعتراضات کو گستاخی مانتے ہیں۔ اردو کی ابتدائی تعلیم میں ٹی۔ ایل۔ ایم یعنی تعلیمی وسائل سے ابھی بھی خاطر خواہ استفادہ نہیں کیا جارہا ہے۔

کہتے ہیں کہ اردو مدارس کے درس و تدریس سے زندہ ہے مگر یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ مدرسوں کی تعلیم سے بچے اسکولی تعلیم میں پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ اور ان کی اردو دانی بھی متاثر ہوتی ہے۔ لہٰذا اردو کی ابتدائی تعلیم کے لیے ابتدائی اسکول کی سہولت زیادہ سے زیادہ پیدا کی جائے اور ان میں بڑے پیمانے پر داخلے کو یقینی بنایا جائے۔ بہرکیف بچوں کو اسکول میں پڑھنے کے سلسلے میں غریبی کو رکاوٹ نہیں بننے دیا جائے۔ ٹھہراؤ کی خاطر انھیں اسکول میں مصروف کار رکھا جائے۔ ہر اسکول میں بنیادی سہولت کا پھیلاؤ لازمی بنایا جائے۔ اسکول کی اپنی عمارت ہو اور وہاں پینے کا پانی، بیت الخلا، بینچ، ڈیسک، کھیل کا

> وقت آگیا ہے کہ اردو کی ابتدائی تعلیم میں بہر صورت بہتری لائی جائے۔اس کی ترویج و اشاعت کے سارے ممکن اقدامات کیے جائیں۔ اعلیٰ تعلیم کے استحکام کے لیے اردو کی ابتدائی تعلیم کا تحفظ اور فروغ ناگزیر ہے۔ اردو پڑھنے والوں کے تناسب میں اضافے کے لیے سب کچھ زمینی سطح پر کرنے کی ضرورت ہے۔

میدان اور اساتذہ کی تعداد طلبا کی تعداد کے تناسب میں ہونا ضروری ہے۔ ہمہ گیر تعلیمی مہم کے تحت اردو کے بہت سے نئے اساتذہ کی تقرری عمل میں آئی ہے اور مزید آنے والی ہے۔ جب بھی کوئی منصوبہ سامنے آتا ہے تو اردو دنیا اس سے امیدیں وابستہ کر لیتی ہے۔ اردو کی ابتدائی تعلیم بہتر ہونے کی توقع رکھنی چاہیے مگر اس کے ساتھ اردو کی ابتدائی تعلیم کے لیے موثر اقدام بھی ہونا چاہیے۔

درس گاہوں میں بچوں کے اردو سیکھنے اور ابتدائی درجوں میں اردو کو بطور ذریعۂ تعلیم اپنانے میں دلچسپی اور مواقع کی فراہمی پر ہی اس ملک میں اردو کے مستقبل کا انحصار ہے۔ سماج کا اعلیٰ طبقہ اردو سے دور ہے اور پست طبقہ تعلیم سے ہی نابلد ہے۔ متوسط طبقے کی اردو سے وابستگی برقرار رکھنے کے لیے خصوصی وظیفہ اور انعام کا اہتمام کیا جانا چاہیے۔ ابتدائی مرحلے میں بچوں کو اردو زبان کا پڑھنا لازمی بنایا جائے۔ وقت آگیا ہے کہ اردو کی ابتدائی تعلیم میں بہر صورت بہتری لائی جائے۔ اس کی ترویج و اشاعت کے سارے ممکن اقدامات کیے جائیں۔ اعلیٰ تعلیم کے استحکام کے لیے اردو کی ابتدائی تعلیم کا تحفظ اور فروغ ناگزیر ہے۔ اردو پڑھنے والوں کے تناسب میں اضافے کے لیے سب کچھ زمینی سطح پر کرنے کی ضرورت ہے۔

■

Badr Mohammadi, AT - Chandpur Fatah,
P.O.-Bariarpur - 843102, Distt - Vaishali (Bihar)
Cell-9939311612
E-mail:badrmohammadi1963@gmail.com

خراج عقیدت

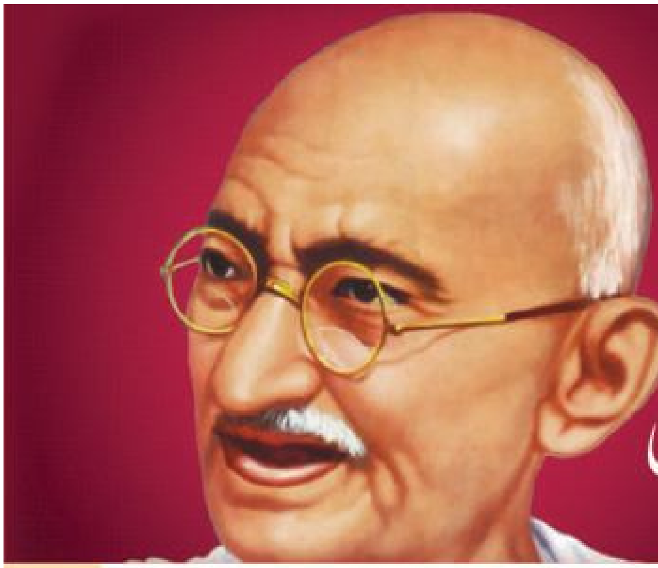

گاندھی جی کی اردو اور مسلم تہذیب سے ہم آہنگی

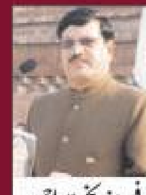

فیروز بخت احمد

بابائے قوم گاندھی جی ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بیک وقت بہت سے حقائق پر نظر رکھا کرتے تھے۔ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ گاندھی جی نہ صرف یہ کہ زبانِ اُردو بخوبی جانتے تھے بلکہ وہ عربی وفارسی کی تعلیم سے بھی آراستہ تھے۔ ساتھ ہی انھیں اسلام کی بھی بخوبی جانکاری تھی۔ کیونکہ اکثر سیاسی محفلوں میں وہ فارسی اشعار و کہاوتوں کا استعمال کیا کرتے تھے۔ اردو کلچر یا اسلامی اقدار سے قربت مولانا آزاد سے قربت کا نتیجہ تھی۔

کچھ لوگوں کے نزدیک گاندھی جی سیاستداں ہوں گے۔ کچھ لوگوں کے لیے وہ فلسفی ہوں گے، کچھ لوگوں کے لیے وہ تحریک آزادیِ ہند کے جاں نثار سپاہی ہوں گے اور کچھ لوگوں کے لیے وہ محض ایک اچھے انسان ہوں گے۔ سیاست میں رہتے ہوئے انسان کا اچھا انسان بنے رہنا کچھ دشوار سا عمل ہے۔ مگر گاندھی جی کی یہ خوبی تھی کہ وہ سب کچھ ہوتے ہوئے ایک اعلیٰ انسان تھے۔

بقول مولانا آزاد اچھا انسان ہونا ایک ایسی عظمت ہے جو بڑی عام سی دکھائی دیتی ہے مگر کم ہی خوش نصیبوں کے حصے میں یہ خصلت آتی ہے۔ واقعی میں گاندھی جی بہت اچھے انسان تھے۔

ایک مرتبہ جب بنگال کے نواکھالی علاقے میں خطرناک قسم کے ہندو مسلم فسادات چل رہے تھے تو گاندھی جی گھر گھر جا کر خیرسگالی کا پیغام دے رہے تھے۔ یہ واقعہ راقم کے والد نورالدین احمد مرحوم کے پاس کلکتہ میں مولانا کے غیر مطبوعہ تحریری خزانہ سے اخذ کیا گیا ہے۔ جب بڑا لال بازار کے ایک گھر کے زینے سے گاندھی جی اترے تبھی انھیں ایک جوشیلے بنگالی مسلمان نے پکڑ لیا اور گلا دبانا شروع کر دیا۔ اُن دنوں سکیورٹی گارڈ نہیں ہوا کرتے تھے۔ اس سے قبل کہ مولانا آزاد جو کہ اس وقت ان کے ساتھ تھے اور دیگر اکابرین جیسے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا حفظ الرحمٰن وغیرہ بھی ان کے ساتھ تھے، یہ لوگ کوشش کرتے کہ ان کو چھڑائیں، وہ شخص بولا۔ ''کوئی آگے نہیں آئے گا۔ اس کافر کی کیسے ہمت ہوئی کہ یہ یہاں آ گیا!''

یہ کہہ کر اس نے گاندھی جی کو دھکا دیا، وہ دھان پان تو تھے ہی، گر گئے۔ مگر گرتے ہوئے انھوں نے جب سورۃ فاتحہ پڑھی تو سب دنگ رہ گئے۔ یہ دیکھ کر وہ بنگالی مسلمان بھی حیران رہ گیا اور دشمنی تھوک کر تاحیات اُن کا چیلا بن گیا۔ اس کا نام تھا۔ عبدالرحمٰن منڈل۔

ایک مرتبہ جب ہندو پاک کی تقسیم کو روکنے کے لیے ایک اہم ترین میٹنگ سابرمتی آشرم میں چل رہی تھی تو درمیان میں سے گاندھی جی اٹھ کر جانے لگے کہ وہ اپنی بکری کی زخمی ٹانگ پر کھڑیا مٹی لگانے جا رہے ہیں۔ جو دیگر اہم شخصیات اس میٹنگ میں موجود تھیں وہ تھیں: سر اسٹافرڈ کرپس، لارنس، سر اے۔ وی۔ الگزانڈر، پنڈت نہرو، سردار ولبھ بھائی پٹیل اور مولانا آزاد۔ جب پندرہ منٹ تک گاندھی جی نہیں آئے تو 2 مئی 1946ء کی اس اہم میٹنگ کے شرکاء باہر آنگن میں آگئے۔ وہاں وہ یہ دیکھتے ہیں کہ گاندھی جی اپنی بکری کی ٹانگ پر لیپ لگا کر اس پر پٹی باندھ رہے تھے۔ بکری ذرا چھٹپٹا رہی تھی۔ یہ دیکھ کر سر پیتھک لارنس بولے، ''کمال ہے گاندھی جی! اتنی چھوٹی سی بات کے لیے آپ اتنی اہم میٹنگ چھوڑ کر آ گئے۔'' قریب میں کھڑے مولانا آزاد نے موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے کہا: سر پیتھک! گاندھی جی عظیم ہیں اور اسی وجہ سے وہ عظمت کے اس درجے کو پہنچے ہیں کہ وہ ان چھوٹی چھوٹی اور معمولی سی دکھائی دینے والی باتوں کو اہمیت دیتے رہے ہیں۔ لوگ انھیں اسی لیے چاہتے ہیں کہ بڑی بڑی باتوں کے ساتھ گاندھی جی چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی بے انتہا خیال کرتے ہیں!''

گاندھی جی مولانا آزاد کے بڑے عقیدت مند تھے اور ان کی بے تحاشہ عزت کیا کرتے تھے۔ مولانا کے کردار کو دیکھ کر ہی وہ مسلمانوں سے خود کو بہت قریب سمجھتے تھے۔ گاندھی جی نے کئی رسائل کی ادارت کی تھی جن میں خاص تھے انگریزی کا ''انڈین اوپی نین'' (Indian Opinion) اور گجراتی کا ''ہریجن''۔ ان دونوں جرائد میں گاندھی جی نے کھلے ذہن سے مولانا آزاد کی تعریفوں کے پُل باندھے ہیں۔ ''ہریجن'' میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں: ''مولانا آزاد کی عادت تھی کہ وہ مخالفوں سے نہیں الجھتے تھے۔ گاندھی جی کو پتہ تھا کہ مولانا ہمیشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ کا نسخہ اختیار کرتے تھے جس میں شفاء ہے۔ دشمنوں سے کیا سلوک ہونا چاہیے، وہ سب رسول کے اسوۂ حسنہ میں ہے۔ اس کے بعد کسی سے سبق لینے یا مدد کی ضرورت نہیں، ان کا اتباع ہی اس مرض کا علاج ہے۔ مولانا مخالفوں کو جواب نہیں دیا کرتے تھے۔ بقول گاندھی جی مولانا صاحب سیاست کو دنیوی چیز تسلیم کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ اس کی مثال اس مے کدے کی سی ہے کہ جام ہی نہیں ٹکراتے عمامے بھی اچھلتے ہیں۔ مخالفوں کو جواب دینے کا مطلب ہے کہ ہم نے انھیں تسلیم کر لیا اور یہ عشق مقصود کی نفی ہے۔

گاندھی جی مولانا صاحب کی بذلہ سنجی و حاضر دماغی کے بھی قائل تھے۔ ''انڈین اوپی نین'' میں انھوں نے تحریر کیا ہے کہ بعض دوستانہ صحبتوں میں بذلہ سنجی کا جوہر مطائبات کی حد تک ضرور کھلتا تھا۔ مولانا آزاد کے حافظے میں عرب شعراء کی حاضر جوابیاں، عرب حکماء کی دقیقہ سنجیاں اور عرب کنیزوں کی برجستہ گوئیاں ڈھیر تھیں۔ وہ اپنی نکتہ رس طبیعت سے انھیں اور نکھار دیتے۔ کئی مسائل میں ان کے جواب اختصار کلمات کی رعایت سے خوب ہوتے اور بذلہ سنجی سے متعلق ان کی رائے تھی کہ مزاح اور ظرافت میں وہی رشتہ ہے جو حسن اور نزاکت میں ہے۔ خلوت پسندی بقول گاندھی جی مولانا صاحب کے کردار کا ایک اہم حصہ تھی۔ تنہائی چاہے جس حالت میں

بھی آئے وہ مولانا کے دل کا دروازہ ہمیشہ کھلا پائے گی۔ ابتدا سے ہی مولانا کو جب سے اُن کے کلکتہ کے بالی گنج سرکلر روڈ والے مکان میں دیکھا تو یہی پایا کہ شروع سے ہی طبیعت کی افتاد کچھ ایسی واقع ہوئی تھی کہ خلوت کے خواہاں اور جلوت سے گریزاں رہتے تھے۔ لوگ لڑکپن کا زمانہ کھیل کود میں بسر کرتے تھے مگر بارہ تیرہ سال کی عمر میں ہی مولانا کا یہ حال تھا کہ کتاب لے کر کسی گوشے میں جا بیٹھتے اور کوشش رہتی کہ لوگوں کی نظر سے اوجھل رہیں۔

کس طرح سے آج کے سیاستدان سرکاری روپیہ کو بے دردی سے برباد کرتے ہیں ایک پرانی حقیقت ہو چکی ہے، مگر گاندھی جی کے ساتھ ایسا نہیں تھا۔ مالِ مفت، دلِ بے درد والی بات گاندھی جی سے کوسوں دور تھی۔ ایک دفعہ گاندھی جی زخمیوں کی مدد کے لیے چندہ جمع کر رہے تھے۔ یہ چمپارن کا واقعہ ہے۔ اُن کو ایک طالب علم نے اُن کے آٹوگراف کے عوض دس روپیہ کا نوٹ دیا۔ گاندھی جی کو رات کو واپس اپنے میزبان دوست راجن مہاپاتر کے گھر لوٹنا تھا۔ گاندھی جی کے ساتھ اس وقت آچاریہ کرپلانی اور مسٹر بھنسالی بھی تھے۔ گاندھی جی نے آچاریہ کرپلانی کو دس روپے کا نوٹ دیا اور کہا کہ تانگہ کرلیں۔ تانگے والے سے پانچ روپے طے پائے۔ جب اپنی منزل پر تانگہ پہنچ گیا تو کرپلانی تانگہ والے سے پانچ روپے لینا بھول گئے۔ اُدھر تانگے والے نے بھی ان کو وہ رقم واپس نہ کی۔ جب رات کو گاندھی جی نے کرپلانی سے حساب مانگا تو وہ بولے، تانگے والے نے تو پیسے واپس ہی نہیں کرے۔'' اس پر گاندھی جی کو تھوڑا غصہ آ گیا اور وہ بولے، ''دیکھو کرپلانی یہ لوگوں کا پیسہ ہے۔ اس امانت کو ہمیں بہت احتیاط سے استعمال کرنا ہے۔ آگے سے ہم چندہ کے پیسے میں سے کچھ نہیں خرچ کریں گے اور آنے جانے کا خرچہ بھی ہم تینوں میں سے ہی کوئی دے گا۔'' کرپلانی جی کو اس کے بدلہ میں رات کا کھانا چھوڑنا پڑا۔ اس بات سے گاندھی جی کی زندگی کے اس حصہ پر روشنی پڑتی ہے جس میں وہ اُصولوں اور ڈسپلن کو سب سے زیادہ اہمیت دیا کرتے تھے۔

گاندھی جی کی خاص عادت تھی کہ وہ کسی چیز کو پھینکا نہیں کرتے تھے بلکہ بہت سنبھال کر رکھ لیا کرتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ ان کو کباڑ جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ یہ واقعہ 1934ء کا ہے جب گاندھی جی لندن جا رہے تھے۔ جس جہاز میں وہ سفر کر رہے تھے وہ پانی کا جہاز تھا اور اس پر ہر مسافر کو ایک رسالہ فری ملا کرتا تھا جس میں مزاحیہ اور اکثر و بیشتر بے ہودہ مواد بھی ہوتا تھا۔ اس کا نام تھا، ''اسکینڈل ٹائمس''۔ کئی دفعہ اس میں لوگوں کے ذاتی رشتوں پر بھی کیچڑ اُچھالی جاتی تھی۔ جب گاندھی جی کو اس کی ایک کاپی دی گئی تو ورق گردانی کے بعد انھوں نے اس میں سے وہ کلپ نکال لیا جس سے کاغذ یکجا کیے گئے تھے۔ بقیہ ''اسکینڈل ٹائمس'' کے صفحات انھوں نے واپس لوٹاتے ہوئے کہا، ''اس میں صرف یہی چیز کام کی تھی، باقی سب تو فضول کاغذات ہیں۔''

یہ واقعہ 1931ء کی سردیوں کا ہے جب گاندھی جی انگلستان میں تھے۔ لندن میں جہاں وہ ٹھہرے ہوئے تھے، اُن کی حفاظت کے لیے دو پولس گارڈ، سارجینٹ

ایوانس اور سارجینٹ راجرس تعینات کیے گئے۔ دونوں گارڈوں کو جاسوسی کرنے کا کام بھی سُپرد کیا گیا تھا۔ لہٰذا جب گاندھی جی سخت و جما دینے والی ٹھنڈ میں صبح 4 بجے اُٹھتے تھے تو ایوانس اور راجرس کو بھی صبح 4 بجے ہی اُٹھنا پڑتا تھا۔ جب تک گاندھی جی کا ہندوستان لوٹنے کا وقت ہوا تب تک اُن دونوں و گاندھی جی میں بہت اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ گاندھی جی کو یوں تو انگریزی حکمرانوں کے ساتھ اس دورے میں کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی مگر ہندوستان لوٹنے پر انھیں یاد آیا کہ انھوں نے اپنے دوست گارڈوں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اُن کو دو انگریزی گھڑیاں بطور تحائف دیں گے، مگر مصروفیات میں ضرورت سے زیادہ مشغولیت کی وجہ سے وہ اُن کو گھڑیاں انگلستان میں خرید کر نہ دے سکے۔

بمبئی پہنچتے ہی گاندھی جی نے اپنے ذاتی سکریٹری سے کہا، ''فوراً مارکیٹ سے دو انگلش گھڑیاں خرید کر لاؤ۔ اُن دنوں گاندھی جی کے ہی کہنے پر ''سودیشی'' چیزوں کے نہ استعمال کی تحریک چل رہی تھی کیونکہ انگریزوں نے گاندھی جی کی بات نہیں مانی تھی اور وہ ناکامیاب ہو کر انگلستان سے لوٹے تھے۔ لہٰذا گاندھی جی کے سکریٹری کو ایک بھی گھڑی نہیں ملی۔ دوبارہ جب وہ تمام مارکیٹوں میں چھان بین کر کے کرافورڈ مارکٹ گیا تو دوکاندار نے ایک پورا کریٹ گھڑیوں کا بھجوا دیا جس میں سوئس، جرمن، فرینچ گھڑیاں تو موجود تھیں مگر انگلش گھڑی نہیں تھی۔ آخر کار ہمت کر کے ان کے سکریٹری نے پوچھ ہی لیا، ''گاندھی جی آخر آپ کو انگلش گھڑیوں کی ایسی کیا ضرورت پڑ گئی۔ آپ نے ہی تو انگریزی سامان کے استعمال کے بائکاٹ کا حکم دیا ہے۔'' تب گاندھی جی نے اسے تمام بات سمجھائی اور کہا، ''مجھے انگلستانی لوگوں سے کوئی گلہ شکوہ نہیں جس کی وجہ سے میں اپنا وعدہ اپنے دوستوں ایوانس اور راجرس کی خوشی کے لیے پورا کرنا چاہتا ہوں۔'' آخرکار گاندھی جی کو یہ گھڑی دلّی میں مل گئی اور انھوں نے بذریعہ پارسل اپنے دوستوں کو بھیج دیں۔

بہت کم لوگ اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ گاندھی جی کرکٹ کے اچھے کھلاڑی بھی تھے۔ 12 اکتوبر 1950ء کے دہلی کے روزنامہ ''الجمعیۃ'' میں آفتاب احمد صدیقی (مرحوم) لکھتے ہیں، ''گاندھی جی کے الفریڈ ہائی اسکول، راجکوٹ، کے کلاس فیلو رتی لال گھیلا بھائی مہتہ نے مجھے بتایا کہ گاندھی جی بہت اچھے کرکٹر تھے۔ اُن کو بلے بازی اور فیلڈنگ میں مہارت حاصل تھی۔ وہ کورز میں بہت تیزی سے گیند کو فیلڈ کیا کرتے تھے۔ اُن کے من پسند کھلاڑی انگلستان کے کپتان ڈگلس آر۔ جارڈائن (Douglas R. Rardine) تھے۔'' اسی مضمون میں آفتاب صاحب لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ گاندھی جی نے ایم۔سی۔سی۔ (M.C.C.) کی ٹیم کے لیے میچ بھی کھیلا تھا۔ یہ بات دسمبر 1934ء کی ہے۔ گاندھی جی نے کس طرح یہ میچ کھیلا بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں مگر تحریری طور پر اس کا ثبوت لکشمی مرچینٹ کے پاس ہے جو وجے مرچینٹ کی بہن ہیں اور بمبئی کے روزنامہ ''فری پریس جرنل'' میں یہ بات 24 جنوری 1949ء کو شائع ہو چکی ہے۔ آفتاب صاحب نے مِس لکشمی مرچینٹ کے ذریعے یہ بات بھی لکھی ہے کہ 1934ء میں گاندھی جی نے ایم۔سی۔سی۔ کی ٹیم کے لیے ایک میچ بھی کھیلا اور بطور 17 ویں کھلاڑی کے اُن کی آٹوگراف بک میں دستخط بھی کیے۔ یہ آٹوگراف بک آج ایم۔سی۔سی۔ کے میوزیم کا بیش قیمتی اثاثہ سمجھی جاتی ہے۔

■

Firoz Bakht Ahmad,
A-202, Adeeba Market & apartments
Near Rahmani Masjid, Zakir Nagar,
New Delhi-110025
Email-firozbakhtahmed08@gmail.com

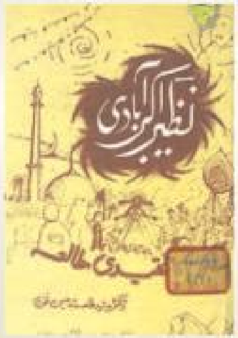

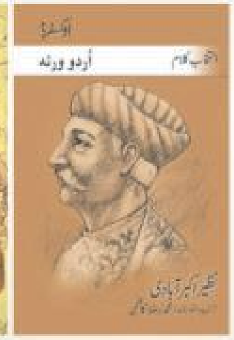

محمد نعمان خاں

اردو شاعری میں نظیر اکبرآبادی کی انفرادیت و اہمیت

امیر خسرو، قلی قطب شاہ اور ولی دکنی سے لے کر عصر حاضر تک بے شمار اردو شعرا نے مختلف شعری اصناف میں طبع آزمائی کر کے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا فنکارانہ اظہار کیا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ قبول عام اور بقائے دوام کا شرف معدود چند شعرا کے حصے میں ہی آسکا ہے۔ اردو کے جو خوش نصیب شعرا مجتہدانہ انفراد و اختصاص کے مرتبے کو پہنچ سکے ہیں اُن میں ایک نام ولی محمد نظیر اکبرآبادی کا بھی ہے۔

نظیر اکبرآبادی کئی اعتبار سے منفرد و اہم شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے لسانی، فکری، فنی، تہذیبی، موضوعاتی لحاظ سے عام مروّجہ شاعرانہ روش سے اجتناب کر کے اپنی راہ خود تعمیر کی۔ ان کے اس مجتہدانہ عمل کے سبب اُنھیں باغی، روایت شکن، مبتذل، سطحی، چٹکلے باز، عوامی شاعر کہہ کر عرصہ دراز تک اُن کی شاعرانہ حیثیت اہمیت اور عظمت کو نظرانداز کیا جاتا رہا لیکن جن وجوہ و اسباب کے تحت انھیں معیاری شاعر تسلیم نہیں کیا گیا، وقت گزرنے کے ساتھ وہی تمام امور و عناصر اُن کی عظمت، انفرادیت اور اہم عوامی شاعر ہونے کا سبب بن گئے۔ نظیر اکبرآبادی کی شاعرانہ عظمت اور اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ وہ اردو اور ہندی حلقوں میں نہ صرف یکساں طور پر مقبول ہیں بلکہ اسکولی تعلیم کی ابتدائی سطح سے دانش گاہوں کی اعلیٰ سطح تک کے نصابات میں ان کا کلام شامل نظر آتا ہے۔

نظیر اکبرآبادی زندگی کے شاعر ہیں، ہندوستان کے شاعر ہیں۔ انھوں نے مہد سے لحد تک روزمرہ زندگی کے چھوٹے، بڑے، اہم اور غیر اہم قسم کے واقعات کو جس طرح حقیقی رنگ میں بیان کیا ہے اسی طرح اُس کی نظیر کسی اور اردو شاعر کے یہاں نظر نہیں آتی۔ زندگی کے ڈرامے میں نظیر کی حیثیت محض تماشہ بیں یا واقعہ نویس کی نہیں بلکہ حقیقی عملی کردار کی ہے۔ وہ اہم وصف جو اُنھیں دیگر اردو شعرا سے منفرد و ممتاز حیثیت عطا کرتا ہے وہ ان کی سادگی، سچائی، قلندرانہ انداز، انسان دوستی اور عوامی زندگی سے گہری وابستگی میں مضمر ہے۔ وہ ایسے پہلے منفرد اور اہم عوامی شاعر ہیں جن کے پورے کلام میں بلاامتیاز مذہب وملت ہندوستان کے عام آدمی یا عام انسان کا تصور اور اس کے متعلقہ مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ آل احمد سرور نے نظیر کی پوری شاعری کو 'آدمی نامہ' سے موسوم کیا ہے۔ نظیر خود ایک عام انسان تھے۔ ان کی تمام زندگی عام حالات میں، عوام الناس کے درمیان رہ کر بسر ہوئی۔ باوجود پیشکش کے اُمراء و سلاطین کے دربار سے وابستہ ہونا اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنا ان کی عوام پسند، خوددار، دُرویشانہ طبیعت نے گوارا نہیں کیا۔ نظیر توکل پسند انسان تھے۔ انھوں نے دیگر اردو شعرا کی طرح نہ تو ناآسودگیوں اور محرومیوں کا رونا رویا اور نہ ہی نامساعد حالات کا شکوہ زبان پر آنے دیا۔ جیسے اور جو بھی حالات درپیش تھے انھوں نے صبر و شکر و اطمینان کے ساتھ اُنھیں حالات میں گزر بسر کی اور دوسروں کو بھی اسی کی تلقین کرتے رہے۔ فارسی اور اردو شاعری کی مروّجہ روایت سے یہ پہلا انحراف ہے کہ جس میں انسانیت کے تئیں ایک ایسے وسیع المشرب، صلح کل، روادار، خوش فکر، بے باک فنکار کے مصورانہ تخیل اور بیانیہ ہنرمندی کی کارفرمائی نمایاں ہے جو ارض وطن کی محبت سے سرشار تھا اور جسے وطن عزیز کا ہر ذرہ دیوتا نظر آتا تھا۔ جس کے نظامِ فکر و فن میں عام آدمی کی زندگی اور اس کے عہد کا پورا سماجی، سیاسی، تہذیبی، مذہبی، تفریحی اور کاروباری منظرنامہ جلوہ گر نظر آتا ہے۔

نظیر کا انفراد و اختصاص یہ بھی ہے کہ وہ جس موضوع پر قلم اُٹھاتے تھے، اپنے مشاہدات، تجربات اور معلومات کو بروئے کار لاکر اس سے متعلق تمام تر ضروری تفصیلات اور جزئیات کو حقیقی رنگ میں، سادگی کے ساتھ شعر کے پیکر میں ڈھال دیتے تھے اور اپنی منظرسازی، محاکات

آفرینی واقعہ نگاری سے ایسی لفظی تصویر پیش کر دیتے تھے جس میں حرکت وتموج، رنگ و آہنگ، صورت و صدا، حسیاتی اور لمسیاتی کیفیت کا جیتا جاگتا نمونہ پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

نظیر اکبرآبادی البیلی شخصیت اور ہمہ جہت صفات کے مالک تھے۔ ان کے کلام کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ محض ایک فطرت شناس، قادرالکلام شاعر ہی نہ تھے بلکہ اپنے عہد کے سچے مورخ، سماجی مبصر، واقعہ نویس، مرقع نگار، طنزومزاح نگار، نفسیات وعمرانیات ولسانیات کے ماہر، ایک وسیع المعلومات انسان تھے۔ تخلیقی صلاحیتیں انھیں فطرت کی جانب سے ودیعت ہوئی تھیں چنانچہ ان کا انفراد یہ بھی ہے کہ انھوں نے نہ تو کسی استادفن سے مشورۂ سخن کیا اور نہ ہی کبھی شاعرانہ تعلّی سے کام لیا۔ نظیر کی شاعری ہر طرح کے تصنع اور آورد سے عاری ہے۔ وہ تو دل کی کتاب کے قاری تھے۔ بقول خود:

سب کتابوں کے کھل گئے معنی
جب سے دیکھی نظیر دل کی کتاب

نظیر کی انفرادیت واہمیت اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ انھوں نے بے ثباتی دنیا، اخلاقی اقدار کی پامالی، انسان کی ناقدری، موت کی حقیقت اور مذہبی رسوم کے ساتھ ساتھ زنانِ بازاری اور جنسی موضوعات پر بھی بے محابا، بے باکانہ نظمیں کہی ہیں۔ ان کے کلام میں بے ثباتی دنیا کا شدید احساس شامل ہونے کے باوجود، اداسی اور غم انگیزی کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موت کی حقیقت کے احساس نے انھیں ہر حال میں خوش اور مطمئن رہنے کا ہنر سکھادیا تھا اور اسی شعار کا مشورہ وہ اپنے قاری کو بھی دیتے نظر آتے ہیں۔ نظم ''تسلیم ورضا'' کا یہ بند ملاحظہ کیجیے:

جو فقر میں پورے ہیں، وہ ہر حال میں خوش ہیں
ہر کام میں، ہر دام میں، ہر حال میں خوش ہیں
گر مال دیا یار نے تو مال میں خوش ہیں
بے زر جو کیا تو اسی احوال میں خوش ہیں
افلاس میں، ادبار میں، اقبال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں

ہندوستان کی مشترکہ تہذیب اور تصوف دونوں موضوعات کی عکاسی کے سبب بھی نظیر متقدمین، متوسطین اور متاخرین اردو شعرا میں اپنی انفرادیت رکھتے ہیں۔ ان کے کلام میں اسلام کا صوفیانہ وجدان بھی ہے اور ہندو مذہب اور بھگتی کا گیان دھیان بھی۔

نظیر اردو کے وہ پہلے مسلم شاعر ہیں جنھوں نے قلندرانہ مزاج وماحول کے ساتھ ساتھ ہندو مذہبیات اور صنمیات پر بھی سب سے زیادہ نظمیں کہی ہیں۔

اردو شاعری طبقۂ اعلیٰ کی ترجمان اور عشقیہ جذبات کے اظہار سے عبارت تھی۔ نظیر نے اسے عوامی رنگ اور قلندرانہ مزاج عطا کر کے ایک ایسے رنگ و آہنگ سے ہم کنار کیا جو کسی بھی مذہب ومسلک سے بالاتر تھا۔ بقول اختر اوریںوی:

''نظیر کا سب سے زیادہ رچا ہوا رنگ قلندرانہ لطف اندوزی میں نظر آتا ہے...... باہم اور بے ہم کی روح نظیر کے یہاں ہر جگہ نظر آتی ہے۔...... نظیر کے پاس اگر کوئی پیغام ہے تو وہ قلندری اور بے خودی کا ہے۔...... وہ عامۃ الناس کو صرف پیغام نہیں دیتا بلکہ وہ ان کی سطح پر اُتر کر، ان کے ساتھ زندگی اور انسانیت کے تجربے کرتا ہے۔ وہ صرف واعظ نہیں ہے، اداکار بھی ہے۔ وہ رمزو کنائے کی زبان میں گفتگو نہیں کرتا بلکہ جنتا کی سیدھی سادی، صاف ستھری زبان میں نغمہ سرائی کرتا ہے''۔

> نظیر اکبرآبادی البیلی شخصیت اور ہمہ جہت صفات کے مالک تھے۔ ان کے کلام کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ محض ایک فطرت شناس، قادرالکلام شاعر ہی نہ تھے بلکہ اپنے عہد کے سچے مورخ، سماجی مبصر، واقعہ نویس، مرقع نگار، طنزومزاح نگار، نفسیات و عمرانیات و لسانیات کے ماہر، ایک وسیع المعلومات انسان تھے۔ تخلیقی صلاحیتیں انھیں فطرت کی جانب سے ودیعت ہوئی تھیں چنانچہ ان کا انفراد یہ بھی ہے کہ انھوں نے نہ تو کسی استادفن سے مشورۂ سخن کیا اور نہ ہی کبھی شاعرانہ تعلّی سے کام لیا۔ نظیر کی شاعری ہر طرح کے تصنع اور آورد سے عاری ہے۔

نظیر اکبرآبادی زودگو شاعر تھے۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ انھوں نے دو لاکھ سے زیادہ اشعار کہے ہیں۔ موضوعات کے تنوع اور لفظیات ومصطلحات کے استعمال کے اعتبار سے بھی نظیر کی انفرادیت واہمیت مسلّم ہے۔ انھیں مختلف آٹھ زبانوں یعنی عربی، فارسی، برج بھاشا، پنجابی، مارواڑی، پوربی، ہندی اور اردو پر نہ صرف دسترس حاصل تھی بلکہ حسب ضرورت اُنھوں نے مذکورہ بالا تمام بولیوں اور زبانوں کے الفاظ کو اپنے کلام میں برجستہ طور پر استعمال کر کے موثر وبامعنی بنادیا ہے۔ نظیر کی شاعری مخصوص لفظیات کا خزانہ ہے۔ انھوں نے اپنا علاحدہ اسلوب اختیار کیا اور موضوع کی مناسبت سے کئی نئی لفظیات ومصطلحات وضع کر کے لسانی اعتبار سے بھی اردو شاعری کو ثروت مند بنادیا ہے۔

کلامِ نظیر کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے کلام میں عربی، فارسی لفظیات، مصطلحات اور تشبیہات کا استعمال کم سے کم کیا ہے۔

مقامی بولیوں کے الفاظ اور روزمرہ کو نظیر نے جتنا زیادہ اپنے کلام میں برتا ہے اس کی مثال کہیں اور نظر نہیں آتی۔ نظیر کا یہ لسانی رویہ محض نظم گوئی کی حد تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ غزل گوئی اور دیگر شعری اصناف میں بھی انھوں نے اسے برقرار رکھتے ہوئے اپنی مجتہدانہ انفرادیت اور جدت پسندی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ نظیر نے ابتدا ہی سے اس روش کو قائم رکھا چنانچہ میر کی موجودگی میں پہلی بار مشاعرے میں شریک ہوکر انھوں نے جو غزل پڑھی، وہ بھی اسی رنگ وطرز کی حامل تھی۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

نظر پڑا اک بتِ پری وش، نرالی سج دھج نئی ادا کا
جو عمر دیکھو تو دس برس کی، پہ قہر آفت، غضب خدا کا
گلے لپٹنے میں یہ شتابی کہ جیسے بجلی کی اضطرابی
اِدھر جو چمکا، چمک چمک کر، اُدھر جو لپکا تو پھر چھپا کا
لڑاوے آنکھیں بہ بے حجابی کہ پھر پلک سے پلک نہ مارے
جو نظریں نیچے کرے تو گویا، کُھلا سراپا چمن حیا کا
جتاوے الفت، چڑھاوے ابرو، اِدھر لگاوٹ، اُدھر تغافل
کرے تبسم، جھڑک دے ہر دم، روش نِٹیلی، چلن دغا کا
نہ وہ سنبھالے کسی سے سنبھلے، نہ وہ منائے، منے کسی سے
جو قتل عاشق پہ آ کے مچلے، تو غیر کا پھر نہ آشنا کا
جو شکل دیکھو تو بھولی بھالی، جو باتیں سنیے تو میٹھی میٹھی
دل ایسا پتھر کہ سر اڑا دے جو نام لیجے کبھی وفا کا

نظیر کی دیگر غزلوں کے اشعار میں بھی یہی انداز نمایاں ہے۔

غزل کا فن ایجاز واختصار اور اشارے وکنائے سے عبارت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل میں نظم کی طرح تفصیل، تسلسل، روانی اور جزئیات کی گنجائش نہیں لیکن نظیر اکبرآبادی نے اجتہاد سے کام لے کر اپنی غزلوں میں اس کلیے کو بھی غلط ثابت کردیا ہے۔ نظیر نے نظموں کے علاوہ اکثر غزلوں میں بھی تسلسل اور فکری ارتقا کی نظیر پیش کی ہے۔ ان کی اس نوع کی غزلوں میں روایتی تہہ داری

اور ایجاز کے بجائے وضاحت وصراحت سے کام لیا گیا ہے۔ ان کی بیشتر غزلیں ایسی ہیں جنھیں قافیہ بند اشعار کے بطور پیش کیا جاسکتا ہے۔ ان کی بعض غزلیں جزئیات نگاری، سراپا نگاری اور مکالمہ طرازی کی مثالیں بھی پیش کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر اُن کی مکالماتی غزل کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

کہا جو ہم نے ''ہمیں در سے کیوں اُٹھاتے ہو؟''
کہا کہ ''اس لیے تم یاں جو غل مچاتے ہو''
کہا ''لڑاتے ہو کیوں ہم سے غیر کو ہر دم''
کہا کہ ''تم بھی تو ہم سے نگہ لڑاتے ہو''
کہا جو حالِ دل اپنا تو اس نے ہنس ہنس کر
کہا ''غلط ہے یہ باتیں جو تم بناتے ہو''
کہا کہ ''عرض کریں ہم پہ جو گذرتا ہے؟''
کہا ''خبر ہے ہمیں، کیوں زباں پہ لاتے ہو''
کہا کہ ہم نہیں آنے کے یاں تو اُس نے نظیر
کہا کہ ''سوچو تو کیا آپ سے تم آتے ہو؟''

پیرایۂ نظم میں محبوب کا سراپا بیان کرنا اس قدر دشوار نہیں ہے جس قدر کہ غزل کے تنگ دامن میں نظیر نے اپنی محبوب 'موتی بیگم' کا سراپا غزل کی ہیئت میں اس طرح بیان کیا ہے:

بھرے ہیں اُس پری میں اب تو یارو سر بہ سر موتی
گلے میں، کان میں، نتھ میں، جدھر دیکھو، اُدھر موتی
وہ ہنستی ہے تو کھلتا ہے جواہر خانۂ قدرت
اِدھر لعل اور اُدھر نیلم، اُدھر مرجاں، اِدھر موتی
جو کہتا ہوں، ارے ظالم تو، اپنا نام تو بتلا
تو ہنس کر مجھ سے یوں کہتی ہے، وہ جادو نظر 'موتی'
تبسم کی جھلک میں یوں جھمک جاتے ہیں دانت اُس کے
کسی کے یک بہ یک جس طور جاتے ہیں بکھر موتی
نظیر اس ریختے کو سن، وہ ہنس کر یوں لگی کہنے
اگر ہوتے تو میں دیتی تجھے اک تھال بھر موتی

موتی بیگم کا یہ دلکش سراپا جب ایک غزل میں پورا نہیں ہوتا تو نظیر اُسے اپنی دوسری غزل میں ایک خاص شوخی اور روانی کے ساتھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

دکھا کر اک جھلک دل کو نہایت کر گیا بیکل
پری رو، تند خو، سرکش، ہٹیلا، چلبلا، چنچل
وہ عارض اور جبیں تاباں کہ ہوں دیکھ اُس کو شرمندہ
قمر، خورشید، زہرہ، شمع، شعلہ، مشتری، مشعل
کفوں میں انگلیوں میں لعل لب میں چشم سے گوں میں
حنا آفت، ستم فندق، مسی جادو، فسوں کاجل
بدن پہ جامۂ زرکش، سراپا جس پہ زیب آور
کڑے، بُندے، چھڑے، چھلّے، انگوٹھی، نورتن، ہیکل
سراپا پُر فریب ایسا کہ ظاہر جس کی نظروں سے
شرارت، شوخی، عیاری، طرح، پھرتی، دغا، چھل بل
نظیر اک عمر، عشرت ہو ملے ایسا پری پیکر
اگر اک آن، اگر اک دم، اگر اک چھن، اگر اک پل

کلامِ نظیر کا کمال یہ بھی ہے کہ نظیر نے موضوعات اور لفظیات میں ہی ہندوستانی طرز و رنگ کو قائم نہیں رکھا ہے بلکہ تشبیہات کے استعمال میں بھی یہی انداز روا رکھا گیا ہے۔ اس نوع کی کئی مثالیں ان کے کلام میں بکھری پڑی ہیں۔ نمونتاً دو شعر پیش کیے جاتے ہیں:

دیکھ کر کُرتی گلے میں سبز دھانی آپ کی
دھان کے بھی کھیت نے اب آن مانی آپ کی

یا:

یوں تو ہم تھے، یوں ہی کچھ مثلِ انار و مہتاب
جب ہمیں آگ دکھائی تو تماشا نکلا

اردو شاعری خصوصاً غزل میں محبوب کے لیے تذکیر کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے جبکہ نظیر کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے محبوب کے لیے تانیثی صیغہ استعمال کیا ہے۔ مثلاً:

کیا ہمیں لگتی ہے پیاری جب وہ کہتی ہے نظیر
ہے میاں کچھ ان دنوں نا مہربانی آپ کی

نظیر کا انفراد یہ بھی ہے کہ انھوں نے نئی لفظیات، مصطلحات، تشبیہات ہی وضع نہیں کی ہیں بلکہ اردو شاعری کو ایک انوکھے اور منفرد اُسلوب سے بھی روشناس کرایا ہے۔ اس ضمن میں کلیم الدین احمد کی یہ رائے حرف بہ حرف صحیح ہے کہ:

''نظیر کی ہمہ گیری نے اردو شاعری کو ایک نیا اسلوب اُس وقت دیا جب غزل گوئی شاعرانہ اظہار کی عالمانہ شکل تھی ...... نظیر اکبرآبادی وہ واحد شاعر تھے جس نے وقت کے تقاضے کے پیشِ نظر نرالے ڈھنگ سے اپنے جگر کو خون کرکے، ہم عصر شعرا کے برعکس اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس نے دربار داری کا راستہ اپنانے سے انکار کردیا اور عام انسانوں کو خطاب کرنے کے واسطے سچائی، جوش اور حقیقت کی شمع روشن کی۔ اُس نے رسمی طریقوں سے جن کی تقلید اُس زمانے میں تخلیقی فنکار کررہے تھے، قطع تعلق کرلیا تھا''۔

نظیر اکبرآبادی نے تمام مروجہ شعری اصناف مخمس، مسدس، رباعی، قطعات، ترکیب بند، ترجیع بند، گرہ بند، قصیدہ، مثنوی اور غزل گوئی میں طبع آزمائی کی ہے لیکن بنیادی طور پر وہ نظم کے شاعر ہیں۔ مجنوں گورکھپوری اُنھیں اردو کا پہلا نظم نگار تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سب سے پہلی بات جو پہلی ہی نظر میں معلوم ہوجاتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر قصائد و مثنویات کو نظم میں شمار نہ کیا جائے اور نظم کی اصطلاح کو جدید معنوں میں استعمال کیا جائے تو نظیر اکبرآبادی اردو کے پہلے نظم نگار ہیں۔''

اردو نظم کے سفرِ ارتقا پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ اردو نظم نے نظیر سے گہرے اور دوررس اثرات قبول کیے ہیں۔ اس ضمن میں بھی مجنوں گورکھپوری کی یہ رائے مبنی برحقیقت ہے کہ:

''بظاہر نظیر اکبرآبادی ہم کو اپنے تنہا رنگ کے تنہا شاعر نظر آتے ہیں، جن کی نہ کسی نے تعریف کی نہ تقلید۔ لیکن غائر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ نظیر اکبرآبادی کا اثر آئندہ نسلوں پر کتنی دور تک ہوا ہے اور نظم نگاری کی جو تحریک چلائی ہے اس میں کہیں شعوری اور کہیں غیر شعوری طور پر نظیر اکبرآبادی کے اثر پر کام کرتے رہے ہیں۔ حالی اور آزاد جو جدید نظم کے دو زبردست معمار ہیں، نظیر اکبرآبادی سے اثر قبول کیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔

اسماعیل میرٹھی کی اسی بات کا اثر یہاں اور بھی واضح اور نمایاں ہے''۔

کلامِ نظیر کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ تقلیدی اور ماورائی نہیں بلکہ اصلی اور ٹھوس حقائق پر مبنی ہے۔ اس کی جڑیں زمین میں پیوست ہیں۔ ان کی شاعری ایک بحرِ ذخار کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کے کلام کو استثناء کا درجہ حاصل ہے کہ وہ اپنی طرز کے خود ہی موجد تھے اور خاتم بھی۔

نظیر اکبرآبادی اردو شاعری میں قلندرانہ، عوامی اور جمہوری روایت کا آغاز کرنے والے پہلے تنہا مجتہد شاعر ہیں۔ میں اپنی بات کو مجنوں گورکھپوری کے اس خیال پر ختم کرتا ہوں:

''نظیر کے کلام کے مطالعے سے پڑھنے والے پر جو مجموعی تاثر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ شخص اردو شاعری میں واقعیت اور جمہوریت کی بنیاد ڈالنے کی پہلی کوشش کررہا ہے۔ ...... نظیر پہلے شاعر ہیں جن کو میں نے زمین پر کھڑا ہوکر زمین کی چیزوں سے متعلق بات کرتے پایا اور پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ شاعری کا تعلق روئے زمین سے بھی ہے۔''

■

Mohammad Nauman Khan
F-3, Goyal Hari Apartt., PNB Colony Idgah Hills
Bhopal -462001 (MP)

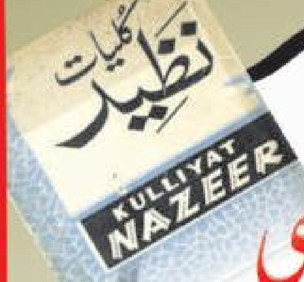

نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں ہندوستانی تہذیب کی عکاسی

امتیاز احمد علیمی

اردو ادب کے شعری منظرنامے پر نظیر اکبرآبادی کی بے نظیری اپنی جگہ مسلم ہے، یہ اور بات کہ نظیر کی شاعری ان کے ہم عصروں کو راس نہیں آئی انھیں عوامی اور بازاری شاعر سے زیادہ نہیں گردانا۔ جبکہ نظیر کے حوالے سے یہ بات سب پر عیاں ہے کہ وہ زود گو اور برجستہ شاعر تھا۔ اسے شاعری میں اعلیٰ اور اسفل، معیاری اور غیر معیاری بول چال کی ادائیگی پر کامل عبور حاصل تھا وہ چاہتے تو پیچیدہ اور مبہم شاعری کرسکتے تھے، مفرس اور معرب زبان کا استعمال کرسکتے تھے، بعض مقامات پر نمونے کے طور پر اس کا اظہار بھی ہوا ہے مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا، بلکہ اس سے انحراف کیا۔ نظیر کی شاعری میں تصنعات کا دور دور تک گزر نہیں ہے ان کی شاعری ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی مکمل آئینہ دار ہے اس میں ہر طرح کی دلچسپی کا سامان موجود ہے۔ واقعات نگاری، جذبات نگاری، جزئیات نگاری، سراپا نگاری، شخصی مرقعے، مذہبیات، اخلاقیات، عشقیہ، طنزیہ، شہر آشوب، کیا نہیں ہے! ہندوستانی تہذیب وثقافت کے جتنے پہلو آپ تلاش کرنا چاہیں وہ سب نظیر کی شاعری میں موجود ہیں، لہو ولعب، عیش وعشرت، سیر و تفریح، رنج وغم، حزن وملال یا دل ودماغ کی بولتی تصویریں ہوں یا امیری، غریبی، مفلسی، لاچاری اور مجبوری کی داستانیں ہوں، معاشیات واقتصادیات کے مسائل ہوں یا ہندوستانی موسمیات کا تذکرہ ہو یا کچھ اور، سبھی اپنے تلازمات اور جزئیات کے ساتھ موجود ہیں، اس لیے کہا جاتا ہے نظیر اردو کا وہ واحد شاعر ہے جس نے اپنی شاعری کا مواد عربوں یا ایرانیوں سے مستعار لینے کے بجائے ہندوستانی تہذیب وثقافت سے لیا اور اپنے آس پاس کی عوامی زندگی، عوامی طرز بود و باش، ملکی ومقامی ماحول اور اس کی روایات کو شاعری کے قالب میں ڈھال کر ایک ایسے لب ولہجے کی بنیاد ڈالی جس کی نظیر پوری اردو شاعری میں مشکل سے ملے گی، عوامی لہجے میں عوامی زندگی کے مسائل ان کے داخلی وخارجی جذبات واحساسات، ان کے دکھ درد، ان کی مفلسی وفقیری، بے بسی ولاچاری اور سکھ دکھ میں برابر شریک ہوکر ان کا بھرپور اظہار کیا۔ یہی نہیں بلکہ نظیر نے اپنے آپ کو سماج کے اندر جذب کرکے اپنی

انفرادیت کو ایک اجتماعی چیز بنادیا، اس لیے ان کی شاعری میں زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں بچا جو موجود نہ ہو، نظیر نے زندگی کی تمام تصویریں چاہے وہ معیشت کی ہوں یا معاشرت کی، تہذیبی قدریں ہوں یا سماجی قدریں، مذہبی معاملات ہوں یا ملکی صورت حال، داخلی وخارجی احساسات ہوں یا تاثرات، امیر وغریب، شاہ وگدا، زاہد ورند، ہندو ومسلمان یا کوئی اور، نظیر نے سب کی تفریح کا سامان مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ اس عہد کی تہذیبی اور سماجی صورت حال کا نقشہ جس طنزیہ پیرائے میں کھینچا ہے وہ اس عہد کے دوسرے شعرا میں نہیں ملتا۔ زبان سے نکلے ہوئے ہر فقرے میں ذاتی تجربہ اور گہرا مشاہدہ ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فیلن کی اس رائے سے اتفاق کیا جاسکتا ہے جو اس نے نظیر اور ان کی شاعری کے حوالے سے دی ہے وہ ہے:

''نہایت وسیع معنوں میں وہ اعلیٰ درجہ کا آزاد، اعلیٰ درجہ کا موجد، اعلیٰ درجہ کا حکیم، اور اعلیٰ درجہ کا حکیم دوست تھا۔ اس کی ذکاوت کی رنگارنگی ان مضامین رنگارنگ سے ظاہر ہوتی ہے جن پر اس نے طبع آزمائی کی، جس قسم کے شاعرانہ خیالات اس نے ان معمولی چیزوں سے پیدا کیے ہیں جن پر اور ہندوستانی شاعروں نے لکھنا یا تو کسر شان سمجھا یا ان کو لکھنے کی قابلیت ہی نہ تھی۔ انھیں کو ہندوستانی محققین ناواقفیت سے اس بات کا نہایت یقینی ثبوت خیال کرتے ہیں کہ وہ کوئی شاعر نہ تھا۔ یہ حضرت فرماتے ہیں ''اس نے اس قسم کی مبتذل چیزوں پر لکھا ہے۔ آٹا، دال، مکھی مچھر'' اس کی طبیعت کی رنگارنگی اور اس کی تخیل کی قوت علاوہ بریں اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اس نے ایک ہی چیز کی مختلف نظموں میں مختلف پہلو سے مختلف تصویریں دکھائی ہیں۔ اس کا دیوان خاصا تصویروں کا ایوان ہے، جس میں ہندوستان کے رہنے والوں کے کھیل تماشے، عیش وتفریح، رنج وغم، دل ودماغ سب کی بولتی چالتی تصویریں نظر آسکتی ہیں۔'' (ص 46، کلیات نظیر، نظیر اکبرآبادی، مقدمہ از عبدالمومن الفاروقی، کتابی دنیا، نئی دہلی ایڈیشن 2003)

جس رنگ کی شاعری نظیر نے پیش کی ہے آج کے شعرا کے لیے ہی نہیں، بلکہ ہر دور کے شعرا کے لیے کسی چیلنج سے کم نہیں ہے۔ آج کے شعرا کے یہاں نظیر کی سی شاعری کا امکان بہت کم نظر آتا ہے کیونکہ نظیر نے جس موضوع پر بھی نظم کہی ہے ان موضوعات پر اتنی تفصیل اور شرح وبسط کے ساتھ نظمیں کسی اور شاعر کے یہاں نظر نہیں آتیں، مثال میں نظیر کی وہ نظمیں پیش کی جاسکتی ہیں جو اس نے موسم برسات کے حوالے سے کہی ہیں ان نظموں میں 23 بندوں پر مشتمل 'برسات کا تماشا' 74 بندوں پر مشتمل 'برسات کی بہاریں' 16 بندوں پر مشتمل 'برسات اور پھسلن' 11 بندوں پر مشتمل 'برسات کی امس' وغیرہ قابل ذکر ہیں اور خاص بات یہ ہے کہ یہ ساری نظمیں مخمس میں ہیں۔ ان کے مطالعے سے برسات کے حوالے سے شاید ہی کوئی پہلو بچا ہو جو بیان سے رہ گیا ہو۔ نظم 'برسات کی بہاریں' میں نظیر نے اپنی قوت متخیلہ کو بروئے کار لاتے ہوئے برسات میں ہونے والے ہر عمل اور ہر منظر کی عکاسی اس طرح کی ہے کہ اس کی پوری تصویر آنکھوں کے آگے پھر جاتی ہے۔ اس میں کھیتوں میں سبزہ اور ہریالی، پھول پتے، کانٹے، بدلیاں، پھوار، تیتر، بٹیر، فاختہ، قمریاں، پپیہے، بگلے، ہدہد، مینڈھک کے اچھلنے، موروں کے ناچنے اور جھولا جھولنے سے لے کر گیت گانے تک ہر چیز کو انتہائی فنکاری سے پیش کیا ہے۔ وہ ہندوستان کے دریا، پہاڑ اور مناظر قدرت سے صرف خیالی طور پر لطف اندوز نہیں ہوتے اور نہ ہی خیالی بہاروں

کا سماں باندھتے ہیں بلکہ وہ ہندوستان کی برسات کی بہاریں اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور اس کو نظم کرتے ہیں جس میں تشبیہات واستعارات اور اس کی مثالیں خالص ہندوستانی ہیں اس نظم سے صرف دو بند ملاحظہ کیجیے:

ہیں اس ہوا میں کیا کیا برسات کی بہاریں
سبزوں کی لہلہاہٹ باغات کی بہاریں
بوندوں کی جھمجھاوٹ قطرات کی بہاریں
ہر بات کے تماشے ہر گھات کی بہاریں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

بادل ہوا کے اوپر ہو مست چھا رہے ہیں
جھڑیوں کی مستیوں سے دھومیں مچا رہے ہیں
پڑتے ہیں پانی ہر جا جل تھل بنا رہے ہیں
گلزار بھیگتے ہیں سبزے نہا رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

نظیر کی اس طرح کی نظمیں خالص مشرقی مزاج کی نظمیں ہیں جو شاعر کے خالص ہندوستانی ہونے کا ثبوت فراہم کرتی ہیں ایسی نظموں میں مناظر فطرت کی دلفریبیاں، سوسائٹی اور معاشرے کے مشاغل، موسم کے تغیر سے روز مرہ کی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات اور تبدیلیوں کا سچا مرقع نظر آتا ہے۔ نظیر نے اپنی شاعری میں جن حقائق کا ذکر کیا ہے وہ حقائق ہمارے تجربات کا حصہ ہیں وہ ماورائی یا تخیلاتی نہیں ہیں بلکہ ان سب کا تعلق زمینی حقائق سے ہے جہاں ہم اپنے شب وروز گزارتے ہیں۔ وہ سب ہمارے سامنے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں یہی نظیر کی شاعری کی انفرادیت بھی ہے اور اس کی شناخت بھی، کہ وہ شاعری کو صرف تخیلاتی، تصوراتی، یا ماورائی نہیں گردانتے بلکہ یہ تصور دیا کہ شاعری کا تعلق زمینی حقائق سے ہے اور زمینی حقائق کے بیان میں نظیر کو اولیت کا درجہ دیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ ایسی چیزوں کا ذکر کرتے ہیں جو ہماری روز مرہ کی زندگی کا اٹوٹ حصہ ہیں مثلاً جب وہ نظم 'بنجارا' میں یہ کہتے ہیں:

کیا شکر مصری، قند گری، کیا سانبھر میٹھا کھاری ہے
کیا راکھ منقا، سونٹھ، مرچ، کیا کیسر لونگ سپاری ہے

تو ہمیں کوئی حیرانی نہیں ہوتی کیونکہ ہم ان اشیا کے ناموں سے اچھی طرح واقف ہیں اور ہم ان سے مانوس بھی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس نظم کو نظیر نے تمثیل بنا کر دنیا کی بے ثباتی اور ناپائداری کو انتہائی سلاست وسادگی اور روانی سے پیش کیا اور در پردہ اس بات کا اظہار کیا ہے کہ دنیا کی رنگینی، جاہ وحشمت، مال ومتاع، دولت وثروت، عزت و شوکت، ٹھاٹ باٹ اور اپنے پرائے سب کچھ فانی ہیں۔ یہ بظاہر ایک عام سی نظم ہے لیکن نظیر نے اس میں اپنی زندگی کے تجربات کا نچوڑ پیش کیا ہے جس میں تصوف اور معرفت کو بھی تلاش کیا جا سکتا ہے اس میں دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ بہت لطیف پیرائے میں کھینچا ہے یہ پوری نظم ایک واعظانہ اور ناصحانہ انداز کی ہے جس میں تمثیل کے لیے بنجارے اور اس کی زندگی کے تلازمے کا استعمال کیا گیا ہے، معنوی اعتبار سے یہ ایک بلند پایہ نظم ہے یہ بند ملاحظہ ہو:

ٹک حرص وہوا کو چھوڑ میاں، مت دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارہ
کیا بدھیا، بھینسا، بیل، شتر کیا گونی پلا سر بھارا
کیا گیہوں، چاول، موٹھ مٹر، کیا آگ دھواں کیا انگارا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

نظیر کی شاعری اس عہد کے لیے ایک نئی قوت اور نیا امکان لے کر ابھری اور وہ یہ تھا کہ نظیر نے ہمارے کلاسکی شعرا کے بندھے ٹکے موضوعات اور اسالیب سے ہٹ کر ایک نئی روش اختیار کی جس کی نظیر کے باغی ذہن نے ان روایات سے انحراف کیا اور ایسے ایسے موضوعات پر شاعری کی جن پر ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان موضوعات پر اتنی اچھی اور موزوں شاعری کی جا سکتی ہے۔ تل کے لڈو، سنگترا، نارنگی، خربوزے، پنکھا، پنکھیا، کورا برتن، ککڑی، تربوز، بٹوا، حنا، مہندی، مکھی اور مچھر جیسے موضوعات پر بھی اچھی اور موزوں شاعری نظیر نے کر کے دکھائی ہے اور پوری سچائی اور حقیقت پسندی کے ساتھ اس کا اظہار کر کے تمام اصناف سخن میں اپنی انفرادیت اور ہمہ گیریت کا لوہا منوایا، اور فارسی شاعری کے تصورات، مفروضات، اور روایات واسالیب کی جگہ خالص ہندوستانی تصورات اور روایات کو ایک نئے اسلوب میں ڈھالا اور اپنی شاعری کا مواد اپنے ملک اور معاشرے سے لیا، دور از کار تشبیہات واستعارات اور رموز وعلائم کی جگہ معلوم اور مانوس صنائع بدائع کو جگہ دی اور ایسی شاعری کی جو ہمارے ملک کی پیداوار معلوم ہوتی ہے۔ جس چیز یا جس واقعے کا ذکر کرتے ہیں وہ اس کی ہو بہو تصویر کھینچ دیتے ہیں مثلاً مسدس میں 'آگرے کی تیراکی' کا یہ بند ملاحظہ ہو:

جب پیرنے کی رت میں دلدار پیرتے ہیں
عاشق بھی ساتھ ان کے غمخوار پیرتے ہیں
بھولے سیانے نادان ہشیار پیرتے ہیں
پیر و جوان لڑکے عیار پیرتے ہیں
ادنیٰ غریب ومفلس زردار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

اس نظم کے ذریعے نظیر نے شہر آگرہ کے مشہور ومعروف مقامات کا ذکر کرنے کے ساتھ دریا کی مختلف کیفیتوں، پانی کی مختلف ہیئتوں کو بھی بیان کیا ہے۔ یہ مقامی رنگ وآہنگ سے آمیز ایک مصورانہ نظم ہے نظیر نے اس نظم میں آگرے میں دریا کے کنارے جو خاص خاص اور مشہور مقامات تھے جن کا تعلق تیراکوں سے تھا ان کا ذکر کر کے ایک تاریخی اور تہذیبی دستاویز فراہم کی ہے۔ یہاں ایک بات عرض کرتا چلوں کہ ہندوستانی تہذیب و ثقافت کے حوالے سے نظیر کی جتنی بھی نظمیں ہیں خواہ ان کا تعلق مناظر قدرت سے ہو یا اخلاقیات اور فلسفے سے، ظریفانہ نظمیں ہوں یا مذہبی معتقدات سے متعلق، یا ہندو مسلم شخصیات اور تقریبات سے متعلق ہوں جب تک اس کی مکمل قرأت نہیں کی جائے گی تب تک اس سے بہت زیادہ لطف اندوز نہیں ہوا جا سکتا اور نہ ہی اس کے فنی، فکری اور لسانی پہلوؤں کو کسی ایک مضمون میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ بہر کیف ان باتوں سے قطع نظر نظیر نے اپنی شاعری میں عوامی رنگ اور سماج کے دبے کچلے اور نچلے طبقے کے لوگوں کی زندگی کے مسائل کو تلاش کر کے پیش کیا ہے جن میں ہندوستانی عناصر کی جھلکیاں حد درجہ نمایاں ہیں۔ اس حوالے سے سید محمد محمود رضوی مخمور اکبرآبادی کی یہ رائے بھی قابل توجہ ہے جو انھوں نے 'روح نظیر' کے مقدمے میں نظیر کی شخصیت اور اس کی شاعری کے سلسلے میں دی ہے:

''وہ (نظیر) ہندوؤں کی معاشرت کے بھی اتنے ہی بڑے ماہر ہیں جتنے مسلمانوں کے، بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ ہندو شعرا میں ایسے بہت کم نکلیں گے جو ہندو معاشرت دانی میں نظیر کا مقابلہ کر سکیں۔ ان کی نگاہ کی وسعت انھیں ہر طبقے کی حالت سے بخوبی واقف رکھتی ہے کچھ ہندو مسلمانوں ہی پر منحصر نہیں ہندوستان کی ہر قوم کی معاشرت کا ان کو یکساں علم وتجربہ ہے۔ امرا کے طریق زندگی، ان کے روز مرہ کے مشاغل، ان کی دلچسپیوں اور تفریحوں کے اسباب، متوسط طبقے کی طرز معاشرت، غربا کے عادات واطوار، عام شہریوں کے لہو ولعب، شہر کے مختلف پیشہ وروں کے چال چلن، ہنود کے تیوہار، مسلم اور ہندو خواتین کے رسم ورواج، خانگی زندگی کی کیفیت، صوفی اور فقرا کے خصائل، آزادوں اور بدمعاشوں، تماش بینوں کی بد وضعی، پھکڑوں کی عریانی، میلے ٹھیلوں کی رنگ رلیاں، ان کے علاوہ اور بہت سی باتیں، غرض معاشرت کے جتنے کوائف ہیں سب کا کچھ نہ کچھ ذکر ان کے یہاں موجود ہے۔'' (روح نظیر، از مخمور اکبرآبادی، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، دوسرا ایڈیشن، 2003، ص 17)

نظیر کی شاعری کا زمانہ وہ ہے جب ہندوستان کی ہندو مسلم دونوں قومیں باہم متحد تھیں۔ ہندو مسلمانوں کے اور مسلمان ہندوؤں کے مختلف تہواروں، میلوں، ٹھیلوں، تماشوں، اور ایک دوسرے کی سماجی رسموں میں زندہ دلی کے ساتھ شرکت کرتے تھے، ایسے ہی ماحول میں نظیر کی شاعری پروان چڑھی اور یہی ماحول، یہی کیفیت، اور یہی رنگ و آہنگ نظیر کی شاعری پر چھایا رہا، اسی لیے نظیر کی شاعری کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی شاعری یک رخی ہونے کے بجائے کثیر الجہات ہے اور اس کی کثیر الجہتی یہ ہے کہ اس نے اگر ایک طرف مسلمانوں کے تہواروں میں عید اور شب برات پر نظمیں کہی ہیں تو دوسری طرف ہندوؤں کے تہواروں میں ہولی، دیوالی، بسنت اور راکھی پر بھی اظہار خیال کیا ہے، اس نے جہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ، مدح پنجتن، اور حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے تو وہیں اہل ہنود کی مقدس ہستیوں میں شری کرشن، گرو نانک، کنھیا جی کی راس، جنم کنھیا جی، ہر کی تعریف میں، درگا جی کے درشن، بھیرو جی کی تعریف، مہادیو کا بیاہ، اور بلدیو جی پر بھی خوبصورت نظمیں کہی ہیں۔ اسی لیے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے اس کے کلام سے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا اور اسے اپنا شاعر تسلیم کرلیا۔ اس طرح نظیر کے کلام میں قدیم ہندو طرز معاشرت، ہندو دیومالا، ہندو رسم و رواج، ہندو فلسفہ، اور ہندو نجوم وغیرہ کا پایا جانا اس بات پر دال ہے کہ نظیر بلاشبہ ان سے واقف تھے کیونکہ بار بار ان کے کلام میں اس کے حوالے ملتے ہیں مثلاً اس نے کرشن کنھیا کی جن متعدد صفات کو گنوایا ہے وہ ذیل کے بند سے واضح ہوتا ہے:

پھر آیا واں اک وقت ایسا جو آئے گرب میں من موہن
گوپال منوہر مرلی دھر سیکشن کشورن کنول نین
گھنشیام مراری بنواری گردھاری سندر سیام برن
پربھوناتھ بہاری کان الا سُکھدائی جگ کے دکھ بھنجن
جب ساعت پرگھٹ ہونے کی واں آئی کٹ دھریا کی
اب آگے بات جنم کی ہے جے بولو کشن کنھیا کی

اس طرح کشن کنھیا کے متعدد اوصاف گنانے کے بعد جب وہ مسلم پیشوا اور رہنما حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے روضے پر حاضری دیتا ہے تو ان کی مدح سرائی میں اس طرح رطب اللسان ہوتا ہے کہ ایک ایک شعر ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف میں عقیدت و ستائش کا ایک بحر ذخار نظر آتا ہے:

ہیں دو جہاں کے سلطاں حضرت سلیم چشتی
عالم کے دین و ایماں حضرت سلیم چشتی
سر دفتر مسلماں حضرت سلیم چشتی
مقبول خاص یزداں حضرت سلیم چشتی
سردار ملک و عرفاں حضرت سلیم چشتی

نظیر نے تہواروں کا ذکر بھی انتہائی موثر انداز میں کیا ہے ہندو تہواروں میں ہولی، دیوالی، بسنت اور راکھی کا ذکر اور مسلم تہواروں میں عید، بقرعید، اور شب برأت کا ذکر تفصیل سے کیا ہے جن میں ہندو تہوار خالص ہندوستانی

''نظیر خالص ہندوستانی شاعر تھے، ہندوستان کی زندگی، ہندوستان کے رسوم و روایات ان کی شاعری کے لازمی عناصر ہیں۔ وہ اپنے گرد وپیش کے عام واقعات کے ساتھ سچی موانست رکھتے ہیں اور انہیں سے اپنی شاعری کے لیے مواد حاصل کرتے ہیں۔ نظیر اردو کے پہلے شاعر ہیں جن کا کلام پڑھ کر ہندوستان کے حالات کی عام معاشرت اور یہاں کے رسم و رواج کے متعلق معلومات حاصل کیے جا سکتے ہیں۔''

ہیں۔ ہولی پر اتنی نظمیں شاید ہی کسی ہندو شاعر نے کہی ہوں۔ یہ ایسا تہوار ہے جو پورے ہندوستان میں علاقائی رسم و رواج کے مطابق منایا جاتا ہے۔ ان تمام نظموں میں 'ہولی کی بہاریں' زیادہ بہتر ہے اس لیے کہ مترنم بحروں میں موسم اور ہولی کے جملہ متعلقات کی ایسی مصوری کی گئی ہے کہ اس کو پڑھ کر نظیر کی شخصیت اور اس کی فنی مہارت کا قائل ہونا پڑتا ہے:

جب پھاگن رنگ جھمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
اور دف کے شور کھڑکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
پریوں کے رنگ دمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
خم شیشے جام جھلکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
محبوب نشے میں چھکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

ہو ناچ رنگیلی پریوں کا بیٹھے ہوں گلرو رنگ بھرے
کچھ بھیگی تانیں ہولی کی کچھ ناز و ادا کے ڈھنگ بھرے
دل بھولے دیکھ بہاروں کو اور کانوں میں آہنگ بھرے
کچھ طبلے کھڑکیں رنگ بھرے کچھ عیش کے دم منھ چنگ بھرے
کچھ گھنگرو تال چھنکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

اس کے علاوہ اہل اسلام کی نظر میں 'شب برأت' کی اہمیت کیا ہے اس کی حقیقت کیا ہے اس میں کون سے اعمال کیے جاتے ہیں عقیدے اور عقیدت دونوں سے ہم بھی واقف ہیں، لیکن اس کی اہمیت اور افادیت نظیر کی زبانی سنیے:

کیونکر کرے نہ اپنی نموداری شب برأت
چلپک چپاتی حلوے سے ہے بھاری شب برأت
زندوں کی ہے زباں کی مزیداری شب برأت
مردوں کی روح کی ہے مددگاری شب برأت
لگتی ہے سب کے دل کو غرض پیاری شب برأت

عالم کے بیچ جس گھڑی آتی ہے شب برأت
کیا کیا ظہور نور دکھاتی ہے شب برأت
روشن ہیں دل جنھوں کے عبادت کے نور سے
ان کو تمام رات جگاتی ہے شب برأت
خالق کی بندگی کرو اور نیکیوں کے دم
یہ بات ہر کسی کو سناتی ہے شب برأت

مذکورہ بالا نظموں کے مطالعے کے بعد یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ نظیر کی شاعری میں حقیقتاً ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب اپنے تمام آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ نظیر نے ہندوستانی تہذیب کی باریک بینی کے ساتھ مشاہدہ کیا اور اسے اپنی شاعری میں اس طرح بیان کیا کہ قاری کے سامنے ہندوستانی تہذیب و معاشرت اور اس کے تمام متعلقات از خود روشن ہو جاتے ہیں۔ تہذیبی سطح پر دیکھا جائے تو اصل ہندوستان نظیر کی شاعری میں ہی بستا ہے۔ اس نے اپنی شاعری کے ذریعے ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا ایک ایسا آئینہ پیش کر دیا ہے جو رہتی دنیا تک ان کی شاعری کے پڑھنے والوں کو اپنے دور کی حقیقت سے روشناس کراتی رہے گی۔ میں اپنی گفتگو کا اختتام مجنوں گورکھپوری کے ان الفاظ پر کرتا ہوں:

''نظیر خالص ہندوستانی شاعر تھے، ہندوستان کی زندگی، ہندوستان کے رسوم و روایات ان کی شاعری کے لازمی عناصر ہیں۔ وہ اپنے گرد وپیش کے عام واقعات کے ساتھ سچی موانست رکھتے ہیں اور انھیں سے اپنی شاعری کے لیے مواد حاصل کرتے ہیں۔ نظیر اردو کے پہلے شاعر ہیں جن کا کلام پڑھ کر ہندوستان کے حالات کی عام معاشرت اور یہاں کے رسم و رواج کے متعلق معلومات حاصل کیے جاسکتے ہیں۔'' (نظیر شناسی، مرتبین مرزا اکبر علی بیگ، محمد علی اثر، ناشر، ادارہ شعر و حکمت، حیدرآباد، 1987، ص 111)

■

Imtiyaz Ahmad Aleemi
Research Scholar, Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia, New Delhi - 110025

بچوں کے ادب میں نفسیات کی اہمیت

ظفرالدین

اُردو میں بچوں کے ادب کا آغاز محمد حسین آزاد کی نصابی کتب سے ہوتا ہے جو بچوں کی درسی ضروریات کے پیش نظر تصنیف ہوئیں۔ بعدازاں نظم ونثر پر مشتمل بے شمار نصابی اور غیر نصابی کتابیں بچوں کے لیے لکھی گئیں۔ تراجم کے ذریعے بھی بچوں کے ادب میں وقیع اضافہ کیا گیا لیکن اُردو میں ابتدائی دنوں میں بچوں کے ادب کی تخلیق میں نفسیات کا لحاظ کم ہی رکھا گیا۔ جبکہ ماہرین نفسیات اس امر پر متفق ہیں کہ بچے بالغوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ بچپن سے بلوغت کے دوران ان کی ذہنی، جذباتی، معاشرتی اور جسمانی نشوونما، جو بالغوں کے مقابلے تیز رفتار ہوتی ہے، کے سبب یہ دور مخصوص ضروریات، تقاضوں اور مسائل کا حامل ہوتا ہے۔ لہٰذا بچوں کا ادب نفسیات کے ان اصول ونظریات سے چشم پوشی نہیں کرسکتا جو بچوں کی نفسیات کا احاطہ کرتا ہے۔

انسانی معاشرے میں جملہ انسانی سرگرمیوں اور فرائض ووظائف کا ایک بڑا حصہ بچوں کی ضروریات اور ان کے تقاضوں کو پورا کرنے سے متعلق ہوتا ہے۔ بچوں کی ضروریات اور تقاضوں میں، بالغ انسانوں کی طرح، بنیادی ضروریات کے علاوہ ادب بھی شامل ہے۔ یہ ادب بچوں کی دیگر بنیادی ضرورتوں کی طرح ان کی ذہنی اور جسمانی عمر اور مزاج کے مطابق ہونا چاہیے۔ مثلاً بچوں کی خوراک میں غذائیت کے علاوہ ان کی تیز رفتار نشوونما کے لیے لازمی اور معاون حیات بخش اجزا بھی شامل ہوتے ہیں۔ اسی طرح بچوں کے ادب کو بھی ذہنی وجذباتی نشوونما کے لیے لازمی اور معاون اقدار سے بھرپور ہونا چاہیے۔ یہ ادب ان کے لیے صحت مند تفریحی ذریعہ ہوسکتا ہے اور اس کے مثبت اثرات ان کے اذہان کو متاثر کرسکتے ہیں۔ اس طرح ان میں متوقع تبدیلی ممکن ہے جو ان کے محفوظ اور تابناک مستقبل کی ضامن بن سکتی ہے۔

بچوں کے ادب کی مخصوص ضروریات اور تقاضوں کا علم ہمیں نفسیات کے ذریعے ہوتا ہے۔ جہاں عمومی نفسیات بالغ انسانوں کا مطالعہ کرتی ہے وہیں بچوں کی نفسیات کے مطالعے کے لیے مخصوص نفسیات کی ایک شاخ نفسیاتِ اطفال (Child Psychology) بچوں کے موضوعات ومسائل کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ بچپن سے بلوغت کا دور اکتسابی دور ہے لہٰذا نفسیات کی ایک اور شاخ تعلیمی نفسیات (Educational Psychology) بھی بچوں کے موضوعات ومسائل کے لیے مخصوص ہے۔ بچوں کے ادب کے ضمن میں نفسیات کی ان ہی دو شاخوں کے اصول ونظریات کا مطالعہ مناسب ومفید ہوسکتا ہے۔

بچوں کے ادب کی روایت کو ذہن میں رکھا جائے تو مجموعی طور پر یہ ادب، بچوں کی دلچسپیوں اور بچوں سے ہماری (بالغوں) توقعات کا مظہر نظر آتا ہے۔ جن اقدار کو ہم تعلیم کے ذریعے بچوں میں منتقل کرنا چاہتے ہیں، ان کے کردار کی تشکیل اور ان کی شخصیت کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں، تقریباً ان ہی اقدار کو بچوں کے ادب کے ذریعے بھی بچوں میں منتقل کرنا چاہتے ہیں۔ اس طرح بچوں کا ادب تعلیمی نظام کا معاون اور اس کی توسیع ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بچوں کے ادب کا ایک حصہ ہماری نصابی کتابوں کا بھی جزو ہے یا یوں کہہ لیں کہ نصابی اور درسی ادب بھی بچوں کے ادب کا حصہ ہے۔ نصابی اور غیر نصابی دونوں طرح کی تصنیفات کے لیے بچوں کی عمر، ذہنی سطح، صلاحیت، ماحول اور دلچسپیوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

ہندوستان اور عالمی سطح پر تعلیمی نظام کی بنیاد نفسیات اور فلسفے پر رکھی گئی ہے۔ بچوں کی مخصوص ضروریات اور ان کی گوناگوں دلچسپیوں کو نفسیات کی روشنی میں سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ ہم جن اقدار کو بچوں میں منتقل کرنا چاہتے ہیں، ان کی کردارسازی اور ذہن سازی کرنا چاہتے ہیں، اس کا احاطہ فلسفہ اور نفسیات دونوں کی آمیزش سے ممکن ہے۔ اس نقطۂ نظر سے بچوں کے ادب کا تخلیق کار ایک مثالی معلم بھی ہے جو بچوں کی نفسیات کا ماہر نہیں تو واقف کار ضرور ہوتا ہے۔ لہٰذا بچوں کے ادب پر نظر رکھنے والے خوشحال زیدی اور بچوں کے ادیب سراج انور دونوں کا

خیال ہے کہ بچوں کے ادیب کا استاد اور مدرس ہونا بچوں کے ادب کے لیے بہتر ہے کیوں کہ وہ بچوں کی نفسیات سے واقف ہوتے ہیں۔ [1]

علم نفسیات نے بیسویں صدی کے نصف آخر میں جدید نفسیات کے دور میں قدم رکھا اور بچوں کی نفسیات کو نشوونما کی نفسیات (Developmental Psychology) کا نام دیا:

"It became apparent that studying different areas of child behaviour at different age levels would not be enough. It would not add to our understanding of how behavioural characteristics change as children Grow older and of what causes them to change. So interest began to shift. The name "child psychology was change to "child development " to emphasize that the focus was the child's Development rather than certain aspects of development" 2

ترجمہ: ''یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ عمر کے مختلف مرحلوں پر بچے کے رویے کے مختلف میدانوں کا مطالعہ کافی نہیں ہوتا۔ عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ بچے کی کرداری خصوصیات میں واقع ہونے والی تبدیلیوں اور ان کے اسباب کے فہم میں یہ مطالعہ کوئی اضافہ نہیں کرتا۔ چنانچہ دلچسپی کا میدان تبدیل ہوتا گیا۔ اور اس طرح 'بچے کی نفسیات کا' نام 'بچے کی نشوونما' کردیا گیا تاکہ اس بات پر زور دیا جائے کہ توجہ نشوونما کے بعض مخصوص پہلوؤں پر نہیں بلکہ بچے کی نشوونما پر ہے۔''

نفسیات کی اس نئی شاخ کی جدید تحقیقات نے ہمیں بچوں کی مخصوص ضروریات اور تقاضوں کے تئیں حساس بنایا اور بیدار کیا ورنہ اس سے قبل معاشرہ انھیں ایک آزاد انسانی فرد (Individual Human Entity) نہیں سمجھتا تھا۔ بچوں کے وجود کو تسلیم کرنے کے بعد ہی ان کے حقوق کے متعلق بھی بیداری آئی۔ انسانی حقوق اور عورتوں کے وجود کو تسلیم کرنے کا واقعہ بھی گزشتہ نصف صدی کا ہے۔ بہرحال یہ جدید نفسیات کی ہی دین ہے کہ بچوں کو سماج کے ایک فرد کی نظر سے دیکھا گیا۔ اسی نئی روشنی میں بچوں کے خلاف جرائم اور بچوں میں جرائم کی نفسیات کا بھی مطالعہ کیا جانے لگا ہے۔ بچوں کی نفسیات کو پیش نظر رکھ کر ہی ان کی تعلیم وتربیت کی پالیسی وضع کی گئی اور 'طفل مرکوز تعلیم' (Child Centred Education) کا تعلیمی نظام رائج ہوا۔ نصاب اور درسی کتاب نیز ان کے اسباق بھی جدید نفسیاتی اصولوں پر تیار کیے گئے۔ زائد نصاب مصروفیات (Extra-Curricular Activities) کو بھی سنجیدہ تعلیم وتربیت کی اہم سرگرمی تسلیم کی گئی۔ شعوری اور لاشعوری طور پر بچوں کی درسی اور معاون درسی کتابوں میں شامل مواد کی طرز پر یا ان سے تحریک پاکر ان ہی خطوط پر بچوں کے ادیبوں نے ادب تخلیق کیا۔ بچوں کے ادیبوں اور شاعروں کی اکثریت اسکولوں میں معلم ہے یا بچوں کے تعلیمی مسائل سے دلچسپی رکھتی ہے، جنھوں نے نفسیات کی روشنی میں بچوں کا ادب تصنیف کیا۔ زیر تربیت اساتذہ کی تدریسی تربیت میں زبان کی تدریس کی تربیت بھی شامل ہے، جس کا ایک اہم عنصر بچوں کے ادب کی تفہیم اور تربیت بھی ہے۔ اس طرح بچوں کے ادب کو تعلیمی نفسیات کے اصولوں پر پرکھنے اور تفہیم وتدریس کی تربیت دی جاتی ہے۔ [3]

عمومی ادب یعنی بالغوں کے ادب کی طرح بچوں کے ادب کا دامن بھی ملک وبیرون ملک کی زبانوں میں موجود بچوں کے ادب کے تراجم سے وسیع کیا گیا ہے۔ بچوں کے عالمی ادب میں زیادہ تر کتابیں نہایت اہتمام و انتظام کے ساتھ نفسیات کے اصولوں کی روشنی میں لکھی جارہی ہیں۔ ترقی یافتہ دنیا میں نفسیاتی اصولوں کا لحاظ کیے بغیر بچوں کا ادب تخلیق کیے جانے کا تصور بھی محال ہے۔ چنانچہ حالیہ برسوں میں بچوں میں مقبول کہانی ہیری پوٹر کے بچوں پر مرتب ہونے والے اثرات ونفوذ کو نفسیات کی جماعتوں میں پڑھایا جارہا ہے۔ ہیری پوٹر کے کرداروں اور ان کے رویوں کا نفسیاتی تجزیہ کیا جارہا ہے۔

"Two Vanderbilt Professors are teaching a psychology class, Harry Potter: Child Development and Children's Literature, in Oxford, England, over spring break." 4

ترجمہ: ''وینڈربلٹ (یونیورسٹی) کے دو پروفیسر آکسفورڈ برطانیہ میں بہار کی تعطیلات کے دوران 'ہیری پوٹر: بچے کی نشوونما اور ادب اطفال' کے موضوع پر نفسیات کی تدریس کریں گے۔''

بچوں کے سنجیدہ ادیبوں کے پیش نظر بچوں کا ادب تخلیق کرنے کے ضمن میں جو چیلنجز درپیش ہوتے ہیں ان میں اس ادب کا قاری، سامع یا ناظر کی 'دلچسپی' (Interest) پہلی شرط ہے۔ بچوں کے ادب پر غوروفکر کرنے والے اکثر اس پہلو پر بہت زور دیتے ہیں لیکن عام طور پر اس کا نہایت سطحی مفہوم لیا جاتا رہا ہے۔ مثلاً مواد کو بہت آسان بنادینا، لطیفے اور بہت ہلکی پھلکی باتیں کرنا یا اسے بھوت پریت، ہیجان خیز تصویروں، آوازوں یا مناظر کو استعمال کرکے مصنوعی طریقے سے دلچسپ بنادینا وغیرہ۔ بچوں کی دلچسپی ایک نفسیاتی مسئلہ ہے جو محرکات (Motivation) کا باعث بنتا ہے۔ علم نفسیات کے مطابق داخلی تحریک دلچسپی کے بغیر ناممکن ہے اور اس کے بغیر کسی بچے میں مطلوبہ تبدیلی نہیں لائی جاسکتی۔ کسی بچے کے رویے، کردار اور شخصیت میں مطلوبہ تبدیلی داخلی تحریک اور دلچسپی سے مشروط ہے۔ نفسیات کی رو سے دلچسپی کا انحصار ارادی توجہ (Voluntary Attention)، ادراک (Perception) اور احساس (Feeling) پر ہے۔ اس اعتبار سے دلچسپی کی تین قسمیں ہیں اور دلچسپی کی شرائط بھی ہیں۔ نفسیات سے عدم واقفیت دلچسپی کے عوامل کو سطحی انداز میں پیش کرتی ہے:

"What kind of person the child will become is determined to a large extent by the interests developed during the childhood years...Throughout the childhood years, interests provide a strong motivation to learn ... Interests influence the form and intensity of children's aspirations...Interests add enjoyment to any activity the individual engages in. If children are interested in an activity, the experience will be more enjoyable to them than if they are bored." 5

ترجمہ: ''بچے کی شخصیت کس قسم کی بننے والی ہے اس کا تعین بڑی حد تک اُن دلچسپیوں سے ہوتا ہے جو بچپن میں نشوونما پاتی ہیں۔ بچپن کی ساری مدت میں بچے کی دلچسپیاں سیکھنے کے لیے ایک اہم محرکہ فراہم کرتی ہیں۔ دلچسپیاں بچوں کی امنگوں کی نوعیت اور ان کی شدت پر اثرانداز ہوتی ہیں۔ دلچسپیاں ہر اس سرگرمی میں مسرت عطا کرتی ہیں جس میں کوئی فرد مشغول ہوتا ہے۔ اگر بچوں کو کسی کام میں دلچسپی ہو تو اُس کام کا انجام دینا اُن کے لیے بوریت کی بجائے زیادہ مسرت بخش ہوتا ہے۔''

بہرحال! بچوں کا ادب 'چند پند سودمند' قسم کی خشک نصیحتوں یا ہدایت ناموں کا دفتر نہیں ہوسکتا۔ لیکن اس

صورت حال سے گریز کا یہ طریقہ بھی مفید نہیں ہے کہ اخلاقیات کو تجربیات سے آمیز کردیں۔ کڑوی اور تلخ دواؤں کو شکر میں لپیٹ کر دینے کا نسخہ بھی بچوں کے ادب کی افادیت کو متاثر کرتا ہے اور دیرپا نہیں ہوتا۔

بچوں کے اپنے ادب کے تئیں دلچسپی کے مسئلے پر تعلیمی نفسیات کے معلم کی یہ رائے مناسب اور منطقی معلوم ہوتی ہے کہ:

''بچوں کی دلچسپیاں متنوع ہوتی ہیں، اس لیے ضروری نہیں کہ تفریحی طور پر پڑھنے کے لیے بچوں کو جو کچھ فراہم کیا جائے، وہ محض افسانوی ادب تک محدود ہو۔ بچے تاریخی واقعات، سفرنامے، ایجادات اور انکشافات کی کہانیاں بھی اس زمرے میں شامل کی جاسکتی ہیں۔ بچے ان کتابوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں، جن میں انسانی تجربات کا عکس ہو۔ ان کتابوں میں جو داخلی کشش ہوتی ہے، وہی بچوں کی توجہ مبذول رکھنے کا سبب بنتی ہے۔''[6]

بچوں کی دلچسپی کے مسئلے کو ماہر نفسیات ان کی عمر کے مدارج کے اعتبار سے دیکھتے ہیں کیونکہ بچوں کی ذہنی سطح اور ان کے مذاق و مزاج کا انحصار ان ہی مدارج پر ہوتا ہے۔ ان مدارج کا تعلق انسانی نشوونما کی نفسیات (Developmental Psychology) سے ہے۔ بچوں کے ادب کا ہدف (Target Group) سات سے چودہ برس کی عمر کے بچے ہیں۔ اس ادب کے ضمن میں بچوں کی جسمانی نشوونما کے بجائے ذہنی نشوونما (Mental Growth)، معاشرتی نشوونما (Social Growth) اور جذباتی نشوونما (Emotional Growth Development) کے مختلف مدارج کا لحاظ رکھا جاتا ہے جس سے عمر کے

> 'نفسیات' بچوں کے جذبات و احساسات سے بھی بحث کرتی ہے جو بچوں کے کردار کی تشکیل اور ان کی شخصیت کی تعمیر میں اہم رول ادا کرتے ہیں. پیدائشی طور پر بچوں میں محبت, خوف اور غصے کے جذبات ہوتے ہیں.انانیت, نفرت, غصہ اور دیگر جذباتی الجھنیں جو پیچیدہ بن سکتی ہیں, عمر کے ساتھ بڑھ سکتی ہیں یا ان پر قابو پاکر انہیں تعمیری رخ پر ڈالا جا سکتا ہے. جذباتی ناآسودگی بچوں کی شخصیت کو غیرمتوازن بنا سکتی ہے. فرائیڈ کے مطابق ''بچپن کا دور جذباتی آسودگی کے لیے اہم ہے.

مختلف ادوار میں بچوں کی دلچسپیاں، رجحانات اور صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

بچوں کے ادب کی مناسبت سے اس Target Group کو تعلیمی نفسیات کے ماہر تین درجات میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلا درجہ سات آٹھ برس کی عمر کے بچوں کا ہے جو فطری طور پر بے انتہا متجسس ہوتے ہیں۔ دوسرا درجہ نو سے گیارہ برس کی عمر کے بچوں کا ہے جو بہت فعال ہوتے ہیں۔ تیسری منزل بارہ سے چودہ برس کے بالغین کی ہوتی ہے۔ اس منزل سے متعلق معین الدین صاحب لکھتے ہیں:

''مجرد تصورات کی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے اور ان کی ذہنی نشوونما اتنی پختہ ہوجاتی ہے کہ متخالف خیالات کو یکجا کرکے وہ مفہوم اخذ کرسکیں۔ ان کے تجربات میں بہت وسعت پیدا ہوجاتی ہے اور ان کے اندر اعتماد نفس پیدا ہوجاتا ہے۔ ان کے خیالات اور جذبات میں ٹھہراؤ نظر آنے لگتا ہے۔ اجتماعی وفاداری کا احساس جلوہ گر ہونے لگتا ہے۔ آزادی کی بڑھتی ہوئی خواہش اور زیادہ بیدار ہوجاتی ہے اور جنسی اختلافات رونما ہونے لگتے ہیں۔''[7]

'نفسیات' بچوں کے جذبات واحساسات سے بھی بحث کرتی ہے جو بچوں کے کردار کی تشکیل اور ان کی شخصیت کی تعمیر میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ پیدائشی طور پر بچوں میں محبت، خوف اور غصے کے جذبات ہوتے ہیں۔ انانیت، نفرت، غصہ اور دیگر جذباتی الجھنیں جو پیچیدہ بن سکتی ہیں، عمر کے ساتھ بڑھ سکتی ہیں یا ان پر قابو پاکر انھیں تعمیری رخ پر ڈالا جاسکتا ہے۔ جذباتی نا آسودگی بچوں کی شخصیت کو غیر متوازن بنا سکتی ہے۔ فرائیڈ کے مطابق ''بچپن کا دور جذباتی آسودگی کے لیے اہم ہے۔ ذہنی اور نفسیاتی کمزوری اس دور کی نفسیاتی نا آسودگی سے پیدا ہوتی ہے۔''[8]

بچوں میں عجائب پسندی، حصول پسندی، تعمیر پسندی، اپنے ہم جنسوں سے مطابقت اور مسابقت، خود پسندی، دوستی، نقل، تقلید، فرماں برداری، ان کی گوناگوں دلچسپیاں، تخیل، تصور وغیرہ امور نفسیاتی مطالعات کا حصہ ہیں۔ یہ مطالعے ہمیں بچوں کی ان مخصوص ضرورتوں، تقاضوں، صلاحیتوں اور مسائل سے متعارف کراتے ہیں جن کا راست تعلق بچوں کے ادب کی تخلیق سے ہے۔

حوالے:

1. اردو ادب اطفال کے معمار، ڈاکٹر خوشحال زیدی، بحوالہ وابسی، وکیل نجیب، ناگپور، 1999، ص10
2. Child Development, Elizabeth B. Hurlock, TaTa McGraw-Hill, New Delhi,2008,pg 3
3. بحوالہ اردو زبان کی تدریس، معین الدین، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 1997، ص92
4. http://news.vanderbilt.edu/2013/03/vandy-goes-potter/
5. Child Development, Elizabeth B. Hurlock, TaTa McGraw-Hill, New Delhi,2008,pg 420
6. اردو زبان کی تدریس، معین الدین، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 1997، ص93
7. اردو زبان کی تدریس، معین الدین، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 1997، ص96
8. بچے اور مسائل، مسرت اکرم، رائل بک کمپنی، کراچی، 1996، ص86

■

Prof. Zafruddin MANUU, Ghachibowli, Hyderabad - 500032 (Telangana)

محمد اسد اللہ

انشائیہ میں انکشافِ ذات اور منفرد نقطۂ نظر

انشائیہ میں انکشافِ ذات کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔اظہارِ ذات کا رجحان مغربی انشائیہ نگاروں کی تخلیقات میں اس قدر غالب رہا ہے کہ انھیں امتیازی طور پر Personal Essay کے نام سے بھی موسوم کیا گیا۔ انکشافِ ذات کو انشائیہ کے بنیادی محاسن میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ Essay کا محض رجحان ہی نہیں بلکہ انشائیہ نگاری کا بنظرِ غائر مطالعہ کریں تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انکشافِ ذات ایک ایسا سرچشمہ ہے جس سے انشائیہ کے دیگر اجزا کی گہری وابستگی ہے۔ خاص طور پر منفرد نقطۂ نظر جو انشائیہ میں اس قدر اہمیت کا حامل ہے جتنا انکشافِ ذات بلکہ ذاتی یا انفرادی تاثرات کی شمولیت کے بغیر بے معنی سی چیز ہے اور انفرادی نقطۂ نظر انکشافِ ذات ہی کا ایک پرتو ہے۔

انشائیہ میں انکشافِ ذات کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ یہ پیرایہ اظہار فرد کی نجی زندگی کے معاملات ہی سے سروکار رکھتا ہے بلکہ انشائیہ میں اپنی ذات کے حوالے سے زندگی کے جزو یا کل سے متعلق منفرد نقطۂ نظر پیش کرتا ہے حتیٰ کہ عمومی نظر جس گھسے پٹے طریقے سے اشیاء کو دیکھنے کی عادی ہوگئی ہے، اس سے انحراف کر کے نئے زاویہ نظر کی ایجاد ہی میں انشائیہ نگاری کا کمال مضمر ہے۔ خود نوشت سوانح سے یہ صنف اس لیے بھی ممتاز ہے کہ سوانح عمری ذات کے جس تنگنائے میں محدود ہوکر رہ جاتی ہے، انشائیہ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر دشتِ امکاں میں قدم رکھتا ہے اور انوکھے مفاہیم اور منفرد نقطۂ نظر کے اظہار کے ذریعے وسعتوں سے ہمکنار ہوجاتا ہے۔ انشائیہ میں شخصی ردِعمل کے اظہار کے سلسلے میں پی بی مارٹن کا خیال ہے کہ:

''انشائیہ نثر کا ایک ایسا ٹکڑا ہے جس میں مصنف دنیا کے کسی بھی موضوع کے باب میں اپنی ذات کا انکشاف کرتا ہے۔''[1]

گویا انشائیہ میں موضوع کی بہ نسبت انشائیہ نگار کی ذات توجہ کا مرکز ہے اسی بات کو مزید واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیہ نگار کے طریقہ کار کو اس طرح بیان کیا ہے:

''انشائیہ کا خالق نہ صرف رسمی طریقہ کار کے بجائے ایک غیر رسمی طریقہ کار اختیار کرتا ہے بلکہ غیر شخصی موضوعات پر نقد و تبصرے سے کام لینے کے بجائے اپنی روح کے کسی گوشے کو بے نقاب اور اپنے ردِعمل کے کسی پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔''[2]

پی بی مارٹن اور وزیر آغا کی بہ نسبت مشکور حسین یاد شخصی ردِعمل کے اظہار کو ایک وسیع تناظر میں دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک مشاہدۂ ذات مشاہدۂ کائنات کا ایک اہم وسیلہ اور انکشافِ ذات دراصل کائنات کی تفہیم نو ہی کی ایک کوشش ہے۔ اپنے موقف کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کائنات کا انوکھا پن بھی آپ کو اسی وقت محسوس و معلوم ہوگا جب کہ آپ نے اپنی ذات کے انوکھے پن کو تلاش کرلیا ہوگا اپنی طرف دیکھنے کا عمل کائنات کی طرف دیکھنے کے بے شمار باب وا کرتا ہے۔ مشاہدۂ ذات تو کائنات کے اسرار معلوم کرنے کی بڑی چابی ہے۔ کلیدِ ہزار جہت کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انشائیہ نگار کے لیے پرسنل ہونا اس لیے ضروری ہے کہ وہ اس طرح پرسنل ہوکر صرف اپنی ذات کا مشاہدہ نہیں کرتا بلکہ صحیح معنی میں کائنات کے مشاہدے کا آغاز کرتا ہے۔''[3]

ڈاکٹر سلیم احمد انشائیہ میں فنکار کی ذات کی شمولیت کو اس لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ اسی کے سبب اس کا منفرد نقطۂ نظر سامنے آئے گا۔ انشائیہ نگار کی شخصیت بھی انشائیہ کو ایک خاص رنگ میں رنگ سکتی ہے لیکن شخصیت کے یہ اثرات بالواسطہ طور پر اور زیریں لہروں کی صورت میں ہوں گے بلکہ اس لطیف انداز میں ظہور پذیر ہوں گے کہ محسوس بھی نہ ہوں گے اور یہی انشائیہ نگار کا کمال ہے کہ تخلیقی عمل میں سے شخصیت چھن کر تحریر میں آتی ہے:

''دراصل انشائیہ میں شخصیت کا اظہار اس نگاہ کی صورت میں ہوتا ہے جو انشائیہ نگار کو افراد، اشیا، وقوعات اور حوادث الغرض زندگی کو ایک خاص انداز میں دیکھنے کا زاویہ مہیا کرتی ہے۔ ایسا زاویہ جو تازگی نظر کا باعث بن کر چیزوں کو مانوس تناظر سے ہٹا کر نئے تناظر میں لے آتا ہے یوں کہ قاری چونک کر سوچتا ہے۔ کمال ہے اس چیز کو میں نے اب تک اس پہلو سے کیوں نہیں دیکھا تھا اور اس کے بارے میں یہ بات مجھے کیوں نہ سوجھی تھی۔ قاری کے اس چونکنے یا حیرت زدگی میں انشائیہ کی تازگی کا راز مضمر ہے۔ یہی وہ لطافت ہے جسے انشائیہ کے لیے بہت ضروری سمجھا جاتا ہے اور جس پر بطور خاص زور دیا جاتا ہے۔''[4]

انشائیہ میں اظہار ذات کا معاملہ نازک بھی ہے اور فنکاری کا مرہونِ منت بھی کیونکہ انشائیہ محض ذاتی معاملات یا تجربات کی فہرست سازی کا نام نہیں یہ زندگی کے متنوع مظاہر کی فنکارانہ پیش کش ہے۔ انشائیہ میں

انشائیہ میں اظہار ذات کا معاملہ نازک بھی ہے اور فنکاری کا مرہون منت بھی کیونکہ انشائیہ محض ذاتی معاملات یا تجربات کی فہرست سازی کا نام نہیں یہ زندگی کے متنوع مظاہر کی فنکارانہ پیش کش ہے۔ انشائیہ میں اظہار ذات کا عمل زندگی میں پیش آنے والے اظہار ذات سے مشابہ ہے۔ یوں تو ہماری زندگی بذات خود ایک انشائیہ ہے مثلاً ایجاز و اختصار، جامعیت، عدم تکمیلیت، اسلوب کی انفرادیت، بے ترتیبی میں ترتیب کی تلاش، ندرت اور اظہار ذات۔

اظہار ذات کا عمل زندگی میں پیش آنے والے اظہار ذات سے مشابہ ہے۔ یوں تو ہماری زندگی بذات خود ایک انشائیہ ہے مثلاً ایجاز و اختصار، جامعیت، عدم تکمیلیت، اسلوب کی انفرادیت، بے ترتیبی میں ترتیب کی تلاش، ندرت اور اظہار ذات۔

زندگی سراسر اظہار ذات ہے البتہ انشائیہ میں اس کی نوعیت فنی ہے لیکن طریقہ کار وہی ہے جو زندگی میں پایا جاتا ہے۔ یعنی مختلف ادارے، افراد اور حادثات و واقعات انسان کو مختلف رنگوں میں نمایاں کر کے بے نقاب کرتے ہیں۔

ایک شخص اپنے آفس میں جو اس کی جولان گاہ ہے، اپنے فرائض منصبی کے شعور کے تحت مخصوص صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتا ہے۔ افسر کے بلاوے پر بھی خوف کی ایک ہلکی سے لہر اس کے اعصاب سے گزر جاتی ہے۔ کسی خطا پر وہ سرزنش کر بیٹھے تو یہ بھیگی بلی بن جاتا ہے۔ باس کے آفس سے نکل کر غم خوار کلرکوں کے حلقے میں پہنچ کر شیر بن جاتا ہے اور جی کی بھڑاس نکالتا ہے۔ اپنے بچوں کے درمیان بچہ، والدین کے روبرو فرماں بردار بیٹا بن جاتا ہے، حلقہ احباب میں بے تکلف ہو کر اس کی شخصیت پر پرزے نکالتی ہے، قوی دشمن کے آگے وہ انکسار کا پتلا اور کمزور مقابل کے روبرو مختلف روپ اختیار کرتا ہے۔

یہ مختلف صورتیں ہیں جن میں ہر شخص اظہار ذات کا فطری عمل انجام دیتا ہے۔ انشائیہ فنکار کو ایک بڑا سماج مہیا کر دیتا ہے جس میں اس کی پسند، ناپسند، فطری خواہشات، محرومیاں، خوف، احساسِ کمتری، یا برتری حتیٰ کہ اس کا ماضی و مستقبل بالکل اسی طرح اس کے روبرو ہوتے ہیں جس طرح سماج میں عام آدمی کے دائرہ عمل کے اندر سماج میں پائے جانے والے مختلف ادارے (افراد) اسے متنوع رویوں کی دعوت دیتے ہیں۔ ان تمام امور کے پیش نظر انکشافِ ذات کو انشائیہ کی بنیاد کا پہلا پتھر قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ انشائیہ کے دیگر لوازمات مثلاً اسلوب زبان، ندرتِ خیال، فکر وغیرہ اظہار ذات کا پرتو ہیں۔

مشکور حسین یاد اظہار ذات کو پورے ادب کی بنیاد قرار دیتے ہیں اور انشائیہ چونکہ ان کے نزدیک اُمّ الاصناف اور ادب کا نقطہ آغاز ہے، یہ انشائیہ کا اہم جزو ہے۔ اس کے برعکس ڈاکٹر وزیر آغا کے مطابق انشائیہ ایک ایسی صنفِ نثر ہے جس کی امتیازی خصوصیت منفرد سوچ کا آزادانہ اظہار ہے۔ اوراق کے ایک اداریے میں لکھتے ہیں:

''اردو ادب میں انشائیہ کا طلوع تاریخی اہمیت کا حامل ہے وہ یوں کہ انشائیہ انفرادی سوچ کا محرک ہے اور اس لیے اس کی آمد سے ہمارے ادب میں فرد کی سطح پر سوچ کا وہ عمل جاری ہوگیا جس کی کمی ہم ایک مدت سے محسوس کر رہے تھے۔''[5]

یہاں وزیر آغا ایک دوسری انتہا تک جاتے ہوئے انشائیہ کو ذہنی سرگرمی کا سب سے بڑا آلہ سمجھ کر یہاں تک کہہ گئے کہ اس کی آمد سے ہمارے ادب میں فرد کی سطح پر سوچ کا وہ عمل جاری ہوگیا جس کی کمی ایک مدت سے محسوس کی جاتی رہی۔ یہ سچ ہے کہ جس قسم کی آزادانہ سوچ انشائیہ کا عطیہ ہے اس کا مکمل اظہار ہمارے ادب میں خال خال ہی نظر آتا ہے اور بیسویں صدی کے نثر نگاروں میں جہاں اس قسم کی خیال آرائیوں کی جھلکیاں ہمیں نظر آئیں ہم نے اسی بنیاد پر انھیں انشائیہ نگار قرار دیا۔

مشکور حسن یاد انشائیہ میں قلم کار کی ذات کی شمولیت

مشکور حسن یاد انشائیہ میں قلم کار کی ذات کی شمولیت کو لازمہ تحریر قرار دیتے ہیں۔ انکشاف ذات اور منفرد نقطۂ نظر، انشائیہ کے جدِّ امجد مانتین کی چھوڑی ہوئی وراثت ہے۔ اس نے اپنی شخصیت کے حسن بے پروا کی بے نقابی کے لیے دیگر اصناف ادب کے شہروں کو خیرباد کہا اور انشائیہ کا الگ قریہ آباد کیا۔ انگریزی انشائیہ نگاروں میں چارلس لیمب اور ابراھیم کاولے سے رابرٹ لنڈ تک بیشتر کے ہاں اس کا خصوصی التزام پایاجاتا ہے۔

کو لازمہ تحریر قرار دیتے ہیں۔ انکشافِ ذات اور منفرد نقطۂ نظر، انشائیہ کے جدِّ امجد مانتین کی چھوڑی ہوئی وراثت ہے۔ اس نے اپنی شخصیت کے حسنِ بے پروا کی بے نقابی کے لیے دیگر اصناف ادب کے شہروں کو خیر باد کہا اور انشائیہ کا الگ قریہ آباد کیا۔ انگریزی انشائیہ نگاروں میں چارلس لیمب اور ابراہیم کاولے سے رابرٹ لنڈ تک بیشتر کے ہاں اس کا خصوصی التزام پایا جاتا ہے۔

مانتین

''میرا خیال تھا کہ میری طویل زندگی نے مجھے بالغ نظر بنا دیا ہے۔ رزم گہہِ حیات سے میں نے جو تجربات سمیٹے تھے ان کے گہرے نقوش میرے ذہن پر مرتسم تھے اور اقتضائے وقت نے اب مجھے بے حد پختہ کر دیا تھا لیکن میں نے دیکھا کہ بے کاری تو ذہن کو منتشر کر دیتی ہے۔ اسے اضمحلال اور مایوسی کی آماجگاہ بنا دیتی ہے۔ حالانکہ

ذہن تو مغرور گھوڑے کی مثال ہے جو اپنے مالک کے اصطبل سے آزاد ہونے کے بعد زیادہ مستعد اور پھرتیلا ہوجاتا ہے اور جتنا کام پہلے وہ دوسروں کے لیے کرتا تھا اب اس سے سوگنا زیادہ اپنے لیے کرسکتا ہے۔''6

> آزادی ہند کے بعد کی ہولناکیاں اور اس کے بعد ہند و پاک میں زندگی کا نقشہ ابتری کی تصویر پیش کرتا ہے۔ اس زمانے میں ادیب و شاعر طنز و تشنیع اور زہرناکی کی زبان کے علاوہ کسی اور ذائقے سے خال خال ہی آشنا ہوپائے۔ بیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں انگریزی انشائیہ میں مروج ذاتی اور شخصی اظہار کو اردو میں متعارف کروانے کی کوششیں ہونے لگیں تب بطور خاص انکشاف ذات کا عمل دخل انشائیوں میں نظر آنے لگا۔

ورجینا وولف

''میں نے جب مرے ہوئے پتنگے کو دیکھا تو ایک عجیب سی حیرت نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ موت کی عظیم قوت نے کتنی حقیر سی مخلوق کو اپنا حریف سمجھ لیا تھا؟ اسے پنجہ آز میں دبوچ لیا، موت فتح یاب ہوگئی تھی؟ کیا اس کی یہ یلغار بہت بڑی کامیابی سے ہمکنار ہوچکی تھی؟ چند لمحے پہلے زندگی میرے لیے ایک پراسرار قوت تھی، لیکن اب موت مجھے ایک اجنبی طاقت نظر آنے لگی تھی۔''7

انگریز قوم اپنی فطری کم گوئی اور کم آمیزی کے سبب اپنے نہاں خانہ دل تک پہنچنے کی کسی کو بہت کم اجازت دیتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ بیکن کے ایسیز میں اظہار ذات کا عمل نمایاں نہیں ہوسکا۔ تاہم اس کے بعد آنے والے انشائیہ نگاروں کو اس صنف کی طبعی خصوصیات نے اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ اس کے اظہار کی فطری صلاحیتوں کے امکانات کو بروئے کار لائیں۔ چنانچہ بیکن کے فوراً بعد ابراہیم کاوے ایک ایسا موڑ ثابت ہوا جہاں سے انگریزی انشائیہ Personal Essay کی ڈگر پر گامزن ہوا۔

مشرق میں معاشرتی عوامل کے سبب انفرادی نقطۂ نظر اور اپنی ذات کو بے نقاب کرنے کا رجحان مستحسن نہیں سمجھا گیا۔ اسی لیے ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں کی

> انگریز قوم اپنی فطری کم گوئی اور کم آمیزی کے سبب اپنے نہاں خانہ دل تک پہنچنے کی کسی کو بہت کم اجازت دیتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ بیکن کے ایسیز میں اظہار ذات کا عمل نمایاں نہیں ہوسکا۔ تاہم اس کے بعد آنے والے انشائیہ نگاروں کو اس صنف کی طبعی خصوصیات نے اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ اس کے اظہار کی فطری صلاحیتوں کے امکانات کو بروئے کار لائیں۔

مصداق مذہبی اور معاشرتی اقدار ہمیشہ ذہنوں پر غالب رہیں، آزادیٔ افکار کو ابلیس کی ایجاد خیال کیا گیا۔ سوچ کا یہ آزادانہ انداز ہمارے معاشرے میں Taboo بن کر رہ گیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہمارے ہاں انشاپردازی فکری سرگرمی سے زیادہ لطفِ بیان کی چیز رہی ہے۔ اردو میں انشائیہ کی فکری جہت عہد سرسید میں روشن ہوئی۔ شخصیت کے اظہار کا آغاز کھلے بندوں غالب کے خطوط میں پہلی مرتبہ ہلکی پھلکی گفتگو کے انداز میں ہوا، خود کہا ہے: ''میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا۔ ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو، انشائیہ کا یہ جوہر جس مقدار میں خطوط غالب میں دستیاب ہے، اپنی مثال آپ ہے:

''سنو عالم دو ہیں، ایک عالم ارواح اور ایک عالم آب وگل.... ہر چند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالم آب وگل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ 8 رجب 1212 ہجری میں مجھ کو روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا۔ 13 برس حوالات میں رہا۔ 18 رجب 1235 ہجری کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا، ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زندان مقرر کیا اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا۔ نظم ونثر کو مشقت ٹھہرایا۔''8

غالب کے رقعات میں پایا جانے والا شخصی اظہار، مکالماتی زبان، برجستہ خیالات اور دلکش اسلوب اور زندگی کو ایک نئی نظر سے دیکھنے کا حوصلہ انشائی خصوصیات ہیں۔ ان سب سے بڑھ کر غالب کا اظہار ذات جس کے پس پردہ ایک زبردست عبقری شخصیت بھی موجود ہے۔

غالب کے بعد عہد سرسید میں انکشاف ذات 'اردو میں اپنے نگاری کے فروغ کے باوجود ابھر نہیں پایا۔ اس دور میں مغربی افکار کے خوش گوار جھونکے فکر وخیال کی بند کلیوں کو اذن سخن دے رہے تھے۔ معاشرتی تشخص، تہذیبی جڑوں کی تلاش اور تحریک آزادی اس ہنگامی دور میں شعوری بیداری کے اہم ذرائع تھے، مختلف تحریکوں نے مورچے سنبھال رکھے تھے۔ لہٰذا اس دور میں شخصیتوں کے منفرد زاویوں کی نمائندگی اور ادبی سطح پر اس قبیل کے اظہار کا سامان مہیا نہ ہوا۔

اس عہد میں افراد کی ذہنی اور ارادی قوتیں متعین مقاصد کے حصول کی خاطر صرف ہوئیں چنانچہ ادبی اظہار کا والہانہ پن اور انشائیہ کا کھلا کھلا انداز اس دور میں رائج خطابت اور پند ونصائح سے متاثر نظر آتا ہے۔

آزادی ہند کے بعد کی ہولناکیاں اور اس کے بعد ہند و پاک میں زندگی کا نقشہ ابتری کی تصویر پیش کرتا ہے۔ اس زمانے میں ادیب و شاعر طنز و تشنیع اور زہرناکی کی زبان کے علاوہ کسی اور ذائقے سے خال خال ہی آشنا ہوپائے۔

بیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں انگریزی انشائیہ میں مروج ذاتی اور شخصی اظہار کو اردو میں متعارف کروانے کی کوششیں ہونے لگیں تب بطور خاص انکشافِ ذات کا عمل دخل انشائیوں میں نظر آنے لگا۔

حواشی

1. پی بی مارٹن، بحوالہ انشائیہ، ایک ہمہ جہت صنف نثر، سلیم آغا قزلباش، لاہور، 1985، ص 139
2. ڈاکٹر وزیر آغا: انشائیہ کیا ہے؟ خیال پارے، سرگودھا، بار دوم، 1984، ص 10
3. مشکور حسین یاد: ممکنات انشائیہ، لاہور، 1983، ص 88
4. انشائیہ کی بنیاد: سلیم اختر، لاہور 1986، ص 238
5. ڈاکٹر وزیر آغا: اوراق، لاہور، بہار نمبر، اپریل مئی 1982، ص 6
6. موٹین: ''کچھ بے کاری کے بارے میں''، ترجمہ: انور سدید، اوراق، لاہور، انشائیہ نمبر 85، ص 312
7. ورجینا وولف: موت ایک پتنگے کی، ترجمہ، ایضاً، ص 300
8. مرزا اسداللہ خان غالب: عکس غالب، مرتبہ: آل احمد سرور، علی گڑھ، ص 17

■

Dr. Muhammad Asadullah ...
30, Gulistan Colony, Near Amrai Lawns
Jafar Nagar, Nagpur 440013 (MS)

اردو ہائیکو: فن و تکنیک

سہیل ارشد

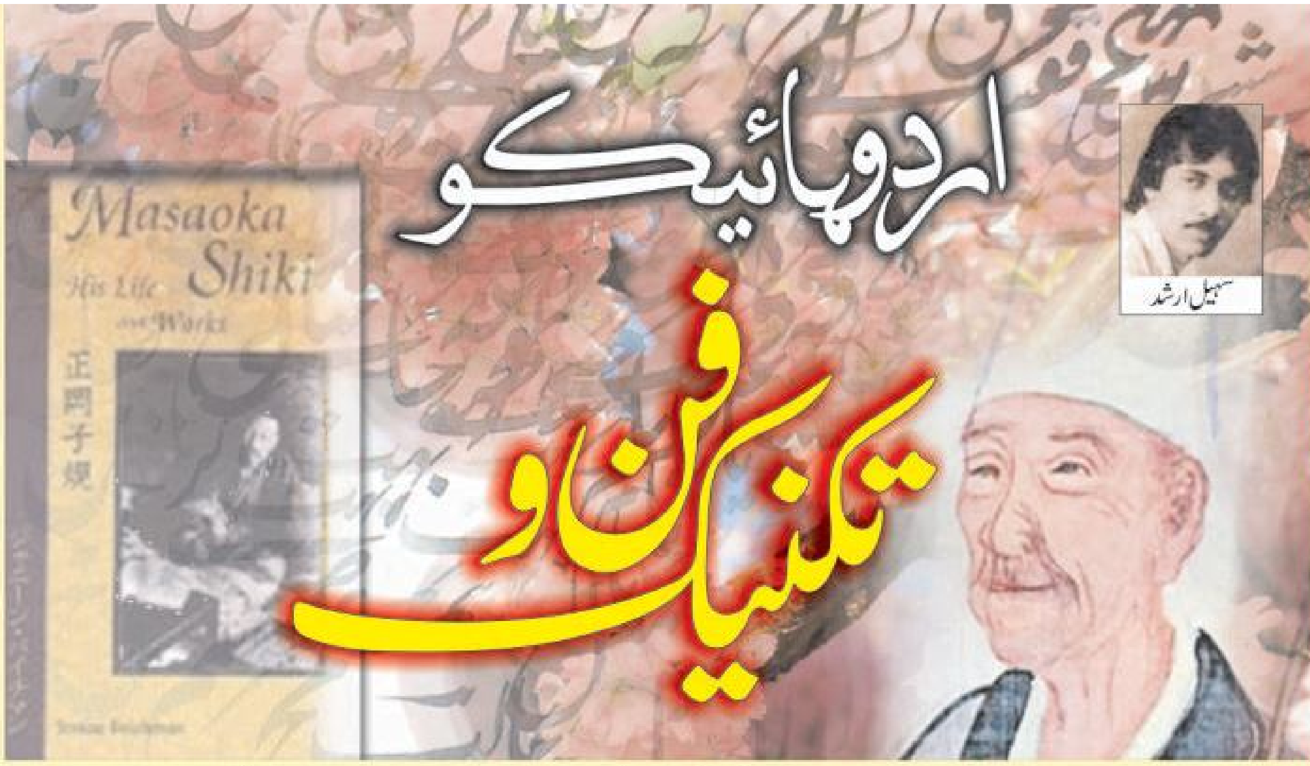

ہندوستان میں جاپانی شاعری کو سب سے پہلے بنگلہ کے نوبل انعام یافتہ شاعر رابندرناتھ ٹیگور نے متعارف کرایا۔ انھوں نے 1919 میں اپنے سفرنامے 'جاپان جاتری' میں جاپان کی تہذیب و ثقافت کا ذکر کرتے ہوئے اس کی مقبول شعری صنف ہائیکو کا تذکرہ کیا اور دو جاپانی ہائیکو نظموں کا آزاد ترجمہ پیش کیا۔ وہ ہائیکو تھے:

کہنہ تالاب/مینڈک کی جست سے/ پانی کی آواز

ویران خستہ شاخ پر/کوا آکر بیٹھ گیا
جاڑے کی شام

اس تذکرے کے بعد ہندوستانی زبانوں میں ہائیکو کے تراجم پیش کیے جانے لگے۔ کچھ شعرا نے طبع زاد ہائیکو بھی لکھے۔ گجراتی شاعر جھینا بھائی دیسائی اسنیہہ رشمی نے سب سے پہلے ہندوستان میں طبع زاد ہائیکو لکھے۔ ہندی کے عظیم شاعر اگئے نے ہائیکو گوئی کو سنجیدگی سے اپنایا۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے یہ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی مقبول ہونے لگی۔ پنجابی، بنگلہ اور بھوجپوری میں بھی ہائیکو لکھے جانے لگے۔

اردو میں ہائیکو کو ماہنامہ 'ساقی' دلی نے متعارف کرایا۔ 1936 میں شاہد احمد دہلوی نے ماہنامہ 'ساقی' کا جاپان نمبر شائع کیا جس میں دو جاپانی ہائیکو کا ترجمہ پیش کیا گیا تھا۔ اس شمارے کے ذریعے اردو شاعروں کو ہائیکو سے واقفیت ہوئی۔ بہر حال۔ دو تراجم آزاد تھے اور ہائیکو کی خصوصیات اور تکنیک کی کوئی جان کاری نہیں دی گئی تھی اس لیے اردو کے شعرا نے اسے سہ سطری نظم سمجھا اور ہائیکو کے نام پر سہ سطری نظمیں لکھی جانے لگیں۔ حمایت علی شاعر نے اپنے مضمون 'کچھ ہائیکو کے بارے میں' (ہائیکو انٹرنیشنل، اکتوبر 2000) میں میراجی کا ایک ترجمہ شدہ ہائیکو نقل کیا:

ہرکارو سیاں لایا/ جوہی کے پھولوں کی ڈالی
اور سندیسہ بھول گیا

پاکستان میں ہائیکو کے تئیں غیر معمولی دلچسپی کا مظاہرہ کیا گیا۔ کئی اردو شعرا نے سنجیدگی سے ہائیکو کو اپنایا مگر چونکہ وہ ہائیکو گوئی کی صحیح تکنیک، ہیئت اور خصوصیات سے واقف نہیں تھے (اور اب بھی بہت سے شعرا واقف نہیں ہیں) اس لیے انھوں نے سہ سطری نظمیں لکھیں۔ اردو کے کئی معیاری رسائل نے ان نظموں کو ہائیکو سمجھ کر شائع کیا جبکہ وہ صحیح معنوں میں ہائیکو نہیں تھے۔ اس ضمن میں قاضی سلیم، آفاق احمد صدیقی، محمد امین وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں جنھوں نے غلط بحر اور وزن میں ہائیکو لکھے۔ نیز ان کے ہائیکو میں ہائیکو کی تکنیک اور خصوصیات کو بھی نہیں برتا گیا تھا اس لیے ان کی نظمیں سہ سطری نظمیں ہیں۔ انھیں ہائیکو نہیں کہا جاسکتا۔ محمد امین نے تو 1980 میں 'ہائیکو' کا مجموعہ بھی شائع کیا اور اس کا دوسرا ایڈیشن بھی اگلے سال لے آئے۔ مگر ان کے مجموعے کو رد کردیا گیا۔

اس دوران پاکستان کے کئی ادبا و شعرا کو جاپان کی یونیورسٹیوں میں درس و تدریس کے مواقع ملے۔ انھوں نے وہاں ہائیکو کی مقبولیت سے متاثر ہوکر پاکستان میں بھی اس صنف کی اشاعت کی کوشش شروع کردی۔ اس سلسلے میں جناب ابوجعفر کشفی اور جاپانی سفارت خانے کے ایک اہل کار سی جے یواتا کا کی کوششیں اہم ہیں۔ ان کی کوششوں سے 1983 میں کراچی میں واقع جاپانی ثقافتی مرکز کے زیر اہتمام ایک ہائیکو مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس سلسلے میں سی جے یواتا کا اور جعفر کشفی نے اردو کے شاعروں سے ملاقات کی اور انھیں مشاعرے میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ اس مشاعرے میں اردو کے شاعروں نے سہ سطری نظمیں پڑھیں۔ حمایت علی شاعر جو ثلاثی کے موجد ہیں انھوں نے اس مشاعرے میں اپنی ثلاثیاں پڑھ دیں۔ مگر اگلے سال شعرا کو سختی سے ہدایت کردی گئی کہ صرف 5-7-5 سلیبل میں ہی ہائیکو لکھ کر لائیں ورنہ زحمت نہ فرمائیں۔ لہٰذا، 1984 سے پاکستان میں شعرا نے اسی سترہ سلیبل میں ہائیکو لکھنا شروع کیا۔ چونکہ جاپانی میں سلیبل کا تصور انگریزی اور اردو کے سلیبل کے تصور سے جدا ہے، اس لیے علامہ فرمان فتح پوری اور دیگر مقتدر شعرا اور نقادوں نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ ہائیکو کے لیے اردو کے ایک سبب کو ایک سلیبل مان لیا جائے اور اس طرح سترہ سبب میں ہائیکو لکھے جائیں۔ لہٰذا، شعرا نے اسی سترہ سبب میں ہائیکو تخلیق کرنا شروع کردیا۔ بہر حال، ابھی بھی بہت سے شعرا نے اس بحر اور وزن سے بے زاری کا اظہار کیا اور مختلف طوالت کی تین سطروں میں ہائیکو کے نام پر سہ سطری نظمیں کہتے رہے۔ اور یہ نظمیں ہائیکو کے نام سے مقتدر ادبی رسائل میں شائع ہوتی رہیں۔

چند نظمیں جو ہائیکو کے نام پر مقتدر رسائل میں شائع ہوئیں پیش ہیں:

چھوٹے چھوٹے ہرے ہرے پتے
اور کچھ بیر اس کی بیری کے
میرے آنگن میں آ کے گرتے ہیں
(اکرم عتیق، ادب لطیف)

نہ جانے کب بچھڑ جاتے ہیں دریا
مری زرخیز مٹی ساتھ لے کر
سمندر میں اتر جاتے ہیں دریا
(سلیم کوثر، اوراق خاص نمبر 1984)

برف گرتی ہے جب چٹانوں پر
اور وادی میں رات ہوتی ہے
ایک کٹیا میں دیپ جلتا ہے
(بشیر سیفی اوراق خاص نمبر 1984)

ننھے ہاتھ میں قلم/ آڑی ترچھی لائینیں سلیٹ پر
نرم و نازک انگلیاں
(خالد اقبال یاسر، ادب لطیف اپریل 2004)

دوست بھی چاہیں/ میں بھی منافق ہو جاؤں
میری الگ راہیں
(نسیم سحر، ادب لطیف 55 سالہ نمبر)

حالانکہ 5-7-5 سبب کی قید ہائیکو گوئی کے لیے واحد قید یا شرط نہیں ہے مگر ہائیکو کے لیے بنیادی شرط یہی ہے اور اس شرط کو قبول کرکے اردو کے ہائیکو گو شعرا نے درست وزن میں ہائیکو لکھنے کی سمت ایک قدم بڑھایا تھا مگر اب بھی کچھ شعرا نے اپنے ذہنی میلان کی وجہ سے سترہ سبب کی شرط کو نہیں اپنایا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ صرف سترہ سلیبل میں کوئی بامعنی نظم کہنا اگر ممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ اس لیے وہ اس بات کی وکالت کرنے لگے کہ اردو میں ہائیکو گوئی کے لیے سترہ سلیبل کی شرط کو لازمی نہ قرار دیا جائے۔

پاکستان میں جاپانی قونصل خانے کے زیر اہتمام یہ ہائیکو مشاعرہ ایک سالانہ تقریب میں تبدیل ہو گیا۔ اس مشاعرے نے پاکستان میں ہائیکو گو شاعروں کی ایک کھیپ پیدا کر دی۔

پاکستان میں محمد امین کے علاوہ بھی کئی شعرا کے ہائیکو کے مجموعے شائع ہوئے۔ ان میں سے چند شعرا کے نام ہیں آفتاب مضطر، شبہ طراز، ثروت سلطانہ ثروت، رونق حیات وغیرہ۔ پاکستان میں ہائیکو پر پی ایچ ڈی کا مقالہ بھی لکھا جا چکا ہے۔

ہندوستان میں بھی شعرا نے ہائیکو گوئی میں دلچسپی دکھائی حالانکہ وہ بھی ہائیکو کی خصوصیات، بحر اور تکنیک سے واقف نہیں تھے۔ انھوں نے بھی سہ سطری نظمیں ہائیکو کے نام پر لکھیں۔ اس سلسلے میں علیم صبا نویدی نے ہائیکو گوئی کو سنجیدگی سے اپنایا اور ہائیکو کے کئی مجموعے شائع کیے۔ انھوں نے 1986, 1987 اور 1989 میں تسلسل کے ساتھ تین ہائیکو مجموعے ترسیلے، شعاع شرق اور تشدید کے نام سے دیے۔ ان کے یہ ہائیکو بھی ہائیکو کی تعریف پر پورے نہیں اترتے۔ ان کے علاوہ ہندوستان میں اردو کے اس ارتقائی سفر میں مظہر امام، بلراج کومل، کرامت علی کرامت، شان الحق حقی، ساحل احمد، کرشن موہن، نینا جوگن، ششی بھوشن گپتا، سرشار بلند شہری، کاوش پرتاپ گڈھی، چراغ بے پوری، ڈاکٹر ولی چشتی، ڈاکٹر عبید ساحل، ڈاکٹر پرویز پیکر، ڈاکٹر ارشد کمال وغیرہ نے ہائیکو کی صنف میں طبع آزمائی کی۔ مگر ان کے ہائیکو وزن و بحر اور دیگر تکنیکی و معنوی خصوصیات سے عاری ہونے کی وجہ سے ہائیکو نہیں کہلا سکتے۔

1995 میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے ہندوپاک کے ہائیکو گو شاعروں کے ہائیکو کا ایک انتخاب شائع کیا۔ اس انتخاب میں شامل شعرا کے نام ہیں: اختر شمار، انور مسعود، سیدہ حنا، ارمان نجمی، خاور اعجاز، بلراج کومل، ماجد الباقری، مظہر امام، ناوک حمزہ پوری، علیم صبا نویدی، نسیم سحر، ساحل احمد، بشیر سیفی، شارق جمال، راغب مرادآبادی، ادا جعفری، مناظر عاشق ہرگانوی، کاوش پرتاپ گڈھی، اقبال حیدر، کرشن موہن، کرامت علی کرامت، شبنم رومانی، حمید الماس، محمد امین، محسن بھوپالی، شان الحق حقی، نصیر احمد ناصر۔

اس انتخاب میں شامل ہائیکو میں چند کو چھوڑ کر تمام ہائیکو میں 5-7-5 کی پابندی نہیں کی گئی ہے۔ حالانکہ صرف سترہ سلیبل کی پابندی کے باوجود سہ سطری نظموں کو ہائیکو نہیں کہا جا سکتا مگر 1995 تک آ کر بھی ہندوستان کے ہائیکو گو شاعر اس بنیادی شرط سے لاعلم تھے، ڈاکٹر کرامت علی کرامت کے استثنا کے ساتھ۔

بعد کے زمانے میں چند اور شعرا نے ہائیکو کے مجموعے شائع کیے جیسے مجیب نشتر اور حنیف کیفی ہیں۔

بہر حال، گذشتہ چند برسوں میں ہندوستان اور پاکستان میں 5-7-5 سلیبل کے وزن کو متفقہ طور پر جاپانی ہائیکو کے قریب ترین قرار دیا گیا ہے۔ اور شعرا اسی وزن پر ہائیکو لکھ رہے ہیں۔ چونکہ اردو کا عروضی نظام سلیبل شماری پر نہیں بلکہ افاعیل پر مبنی بحروں پر قائم ہے اس لیے اردو شعرا نے سہولت کے لیے ہائیکو کی ایک بحر بھی ایجاد کر لی ہے۔ وہ بحر ہے

فعلن فعلن فع
فعلن فعلن فعلن فع
فعلن فعلن فع

اس بحر کی کچھ خامیاں ہیں جس کی وجہ سے اردو ہائیکو ایک بے لوچ اور میکانیکی صنف بن گئی ہے۔ نیز اردو ہائیکو نگار شاعروں کو ہائیکو کو اس صنف کی دوسری اہم شرائط، اصول و خصوصیات کا بھی علم نہیں ہے۔ یہ تمام تکنیکی، معنوی و فلسفیانہ خصوصیات کا ایک مکمل نظام ہے جو ہائیکو کو عالمی شعری ادب میں ایک ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔ حیرت ہے کہ پاکستان کے چند اردو کے نقاد، شاعر اور استاذ جاپان میں رہ چکے ہیں اور جاپانی زبان بھی جانتے ہیں مگر انھوں نے اردو شعرا کے حلقے کو ہائیکو کی تمام تکنیکی و معنوی خصوصیات سے آگاہ کرنے میں ناکام رہے اور آج تک ناکام ہیں جس کی وجہ سے ہائیکو گوئی کا فن اردو میں ابتدائی مرحلے میں ہے اور اردو کے زیادہ تر ہائیکو تک بندی اور بچکانہ شعریت تک ہی محدود ہیں۔

اردو ہائیکو کی بحر

جاپانی ہائیکو سترہ صوتی ارکان پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان ارکان کو جاپانی اصطلاح میں مورا یا آن کہا جاتا ہے۔ مورا کا تصور انگریزی کے سلیبل کے تصور سے مختلف ہے۔ انگریزی میں کم از کم ایک واویل پر مشتمل لفظ کو ایک سلیبل کہتے ہیں۔ جبکہ جاپانی میں ایک متحرک یا ساکن حرف کو ایک مورا یا آن کہتے ہیں۔ جاپانی زبان یک صوتی ہے۔ اس میں عام طور پر سلیبل یا مورا یک صوتی ہوتے ہیں جبکہ انگریزی کے ایک سلیبل میں دو یا تین حرف کی آوازیں ہو سکتی ہیں۔ اردو میں سلیبل کی دو قسمیں ہیں۔
(الف) دو حرفی یعنی سبب اور سہ حرفی یعنی وتد۔

اردو میں سبب یک صوتی بھی ہوتے ہیں اور دو صوتی بھی۔ مثال کے طور پر جا، سو، کو، بھی، نے وغیرہ یک صوتی سبب یا لفظ ہیں جبکہ فن، گل، پر، اب، خط وغیرہ دو صوتی سبب یا لفظ ہیں۔ جاپانی مورا یک صوتی ہیں۔ اس میں صرف ایک استثنا ہے۔ کچھ سلیبل یا دو صوتی ارکان 'ن' کی آواز پر ختم ہوتے ہیں اور ان میں ن ساکن ہوتا ہے۔ پھر بھی اس ساکن 'ن' کو بھی ایک مورا گنتے ہیں۔ بقیہ تمام مورا پانچ واویل ساؤنڈ پر ختم ہوتے ہیں۔

جاپانی ہائیکو کی چند مثالیں پیش ہیں جن سے مورا کے تصور کو سمجھنے میں مدد ملے گی:

باشو کا مشہور ہائیکو ہے
فورو اکے یا
کاوازو توبی کومو
می زو نو اوتو

اب اس کی تقطیع پیش ہے

فو ۔ رو ۔ ا ۔ کے ۔ یا 5 مورا
کا ۔ وا ۔ زو ۔ تو ۔ بی ۔ کو ۔ مو 7 مورا
می ۔ زو ۔ نو ۔ او ۔ تو 5 مورا

(اس ہائیکو کا ترجمہ : کہنہ تالاب ۔ مینڈک کی جست سے ۔ پانی کی آواز)

مندرجہ بالا ہائیکو میں تمام سلیبل یا مورا یک حرفی ہیں یعنی ان کا پہلا حرف متحرک اور دوسرا حرف ،حرف علت ہے جو ساکن ہے ۔ اس طرح سارے 'سبب' یک حرفی ہیں اور ہر یک صوتی 'سبب' کو ایک مورا مانا گیا ہے ۔

اسی طرح جاپانی کے اور عظیم شاعر مساؤ کا شکی کا ہائیکو ہے :

باکا بارا یا / باکا ہی کوکوشی تے
کوساشی گے رو

اس ہائیکو کی تقطیع پیش ہے

با ۔ کا ۔ با ۔ را ۔ یا 5 مورا
با ۔ کا ۔ ہی ۔ کو ۔ کو ۔ شی ۔ تے 7 مورا
کو ۔ سا ۔ شی ۔ گے ۔ رو 5 مورا

اس ہائیکو میں بھی تمام 'سبب' یک صوتی ہیں کیونکہ ان کا پہلا حرف متحرک اور دوسرا حرف ، حرف علت ہے اس لیے اس کی آواز پہلے حرف میں ضم ہوگئی ہے ۔

(اس ہائیکو کا ترجمہ : قبروں کا میدان ۔ قبریں زمین سے لگی ہوئی ۔ گھاس بلند)

جاپانی زبان میں صرف ایک حرف ہے جس کی آواز ساکن ہوتی ہے اور وہ ہے 'ن' کی آواز ۔ کئی الفاظ ہیں جس کا آخری حرف یا آواز 'ن' کی ہوتی ہے اور یہ ن ساکن ہوتا ہے ۔ مگر اس ساکن ن کی آواز کو بھی ایک مورا یا سلیبل مانا جاتا ہے ۔ اسے نظر انداز نہیں کیا جاتا ۔ اس سے جاپانی کے صوتی نظام کی نزاکت یا حساسیت ظاہر ہوتی ہے ۔

ایک ہائیکو پیش ہے ،جس میں 'ن' کی ساکن آواز موجود ہے

رنگو کواو تے / بو تن تو مائے نی / شی نن کانا

رن ۔ گو ۔ کو ۔ او ۔ تے
بو ۔ تن ۔ نو ۔ ما ۔ ئے ۔ نی
شی ۔ نن ۔ کانا

اس ہائیکو میں 'ن' ساکن دو موقعوں پر آیا ہے ۔ مگر دونوں موقعوں پر اسے ایک مورا تسلیم کیا گیا ہے ۔ پہلے مصرعے میں یہ نون غنہ ہے اس لیے اسے ایک مورا شمار نہیں کیا گیا ۔ دوسرے اور تیسرے مصرعے میں ن ساکن ہے اس لیے اسے ایک مورا تسلیم کیا گیا ہے ۔

مندرجہ بالا مثالوں سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جاپانی زبان میں ایک حرف کی آواز کو ایک مورا تسلیم کرتے ہیں خواہ وہ متحرک ہو یا ساکن ۔ بہر حال ، ایسے سلیبل بہت کم ہیں اور استثنائی ہیں جو دو صوتی ہیں ۔ عام طور پر جاپانی سلیبل یک صوتی ہوتے ہیں ۔ لہٰذا ، اگر ہم جاپانی کی طرح ہر متحرک اور ساکن حرف کو ایک سلیبل یا مورا مانیں تو پھر اردو کے مصرعے بہت مختصر ہو جائیں گے اور ترسیل کا مسئلہ درپیش ہوگا ۔ اس لیے لسانی تقاضوں کے تحت اردو کے یک صوتی اور دو صوتی دونوں طرح کے سبب کو ایک سلیبل مان لیا جائے ۔ یہ کلیہ اردو ہائیکو میں پہلے سے مروج ہے ۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ متحرک اور ساکن حرف کو بھی ایک مورا تسلیم کیا جائے ۔ اردو کے نقادوں نے 5-7-5 سبب کی ترتیب کو اردو ہائیکو کی بحر کی سند عطا کی ہے اور کچھ لوگوں نے فعلن فعلن فع ۔ فعلن فعلن فعلن فع ۔ فعلن فعلن فع کو ہائیکو کی بحر قرار دیا ہے ۔ مگر اس بحر کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس نے ہائیکو کو سترہ سبب کی شاعری بنا کر رکھ دیا ہے ۔ جب ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور دیگر شعرا نے 5-7-5 سبب کو اردو کی بحر قرار دیا تو انھوں نے اس امر کو نظر انداز کر دیا کہ کسی بھی جملے میں صرف سبب پر مبنی الفاظ نہیں ہوتے ہیں بلکہ کچھ جملے وتد پر بھی مشتمل ہوتے ہیں یا ایک ساکن یا متحرک حرف کی آواز بھی ہوتی ہے ۔ اس وقت ساکن یا متحرک حرف کے متعلق کوئی کلیہ یا قانون نہیں بنایا گیا ۔ لہٰذا ، اردو کے شعرا نے یہ سمجھ لیا کہ ہائیکو میں صرف سبب آنے چاہئیں ۔ وتد کے متعلق یا وتد میں موجود ساکن یا متحرک حرف کے متعلق کوئی کلیہ نہ ہونے کی وجہ سے شعرا نے وتد کو بھی ایک سلیبل شمار کرنا شروع کیا جبکہ وتد میں ایک سبب اور ایک ساکن یا متحرک حرف ہوتا ہے ۔ اس طرح مصرعے طویل ہو جاتے ہیں ۔ فرض کیجیے کہ کسی مصرعے میں صرف وتد آ جائیں تو مصرعے بہت طویل ہو جائیں گے ۔

سرد رات خوف ناک نا گ سی

جاپانی کا نازک اور حساس صوتی نظام ایک وتد کو جس میں تین حروف ہوتے ہیں ایک مورا قبول کرنے کا متحمل نہیں ہوسکتا ۔ اس بے اصولی کا نتیجہ یہ ہے کہ شعرا اپنے اپنے صواب دید کے مطابق ہائیکو کہہ رہے ۔ وہ وتد کو بھی ایک سلیبل مانتے ہیں اور صرف سبب کو بھی ۔ کچھ شعرا ایک حرف کو ایک سلیبل مانتے ہیں جیسے کرامت علی کرامت صاحب کیونکہ وہ جاپانی کے مورا کے تصور کو آغاز ہی میں سمجھنے میں کامیاب ہوگئے تھے ۔ ناوک حمزہ پوری بھی اسی کلیے پر عمل کرتے ہیں ۔ مگر زیادہ تر شعرا ہائیکو کو سترہ سبب کی نظم سمجھتے ہیں اور شعوری طور پر ایسے الفاظ لاتے ہیں جن میں صرف سبب ہوں ، متحرک یا ساکن حرف نہ ہو ۔ ایسے ہائیکو کو پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تین ڈبوں کی کوئی ٹرین کھٹ کھٹ کرتی نظر کے سامنے سے گزر گئی ہو ۔ اس کے علاوہ شعرا شعوری یا غیر شعوری طور پر صرف آخر میں وتد لاتے ہیں جس کا آخری حرف ساکن ہوتا ہے جیسے بہار ، جام ، خواب وغیرہ ۔ جبکہ یہ ضروری نہیں کہ مصرعے کے آخر میں کوئی سہ حرفی لفظ ہی آئے :

مت کر اچھا کام / ہو جائے گا دنیا میں
مجھ سا تو بدنام

لہٰذا ، اردو کے ہائیکو کے لیے یہ کلیہ جاپانی ہائیکو کے مورا کے اصول کے قریب تر ہوگا کہ ایک سبب کو تو ایک سلیبل یا رکن مانا جائے مگر اس کے ساتھ وتد میں موجود ایک حرف کی متحرک یا ساکن آواز کو بھی ایک صوتی رکن تسلیم کیا جائے ۔ عام طور سے ہائیکو کے مصرعے کا آخری لفظ اگر سہ حرفی ہو جیسے جام وغیرہ تو اس کے آخری ساکن حرف کو شمار نہیں کرتے ۔ اس معاملے میں یہ رعایت برتی جاسکتی ہے کہ شاعر اگر آخری حرف کو شمار کرنا چاہے تو کرے نہ کرنا چاہے تو نہ کرے ۔ غزل میں بھی تسبیغ کا اصول ہے ۔ مگر سطر کے درمیانی حصے میں ہر سبب کے علاوہ ہر متحرک یا ساکن حرف کو شمار میں لانا جاپانی مورا کے اصول کے مطابق ہوگا ۔ غزل میں بھی ہم مصرعے کے درمیان اصوات کو نظر انداز نہیں کر سکتے تو پھر ہائیکو میں کیسے کر سکتے ہیں ۔

اس بحث سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ سترہ سلیبل کی جو بحر شعرا نے ایجاد کی ہے وہ صرف اسی صورت میں قابل عمل ہے جب تمام سترہ سلیبل سبب پر مبنی ہوں ۔ یعنی یہ بحر ہر طرح کے مصرعوں پر مبنی ہائیکو کے لیے نہیں ہے ۔ اگر مصرعوں میں وتد یا صرف وہ الفاظ ہوں جو سبب ہوں مگر ان کا دوسرا حرف گر جائے جیسے نہ ، کہ ، وہ ، یہ ، تو ، ایسی صورت میں اس بحر کو کھینچ تان کر ہی لاگو کیا جاسکتا ہے ۔

جاپانی زبان میں شاعری کے لیے بحر کا تصور نہیں ہے ۔ جاپانی اصناف میں مصرعوں کی طوالت مورا کی تعداد پر منحصر ہوتی ہے ۔ انگریزی میں بھی میٹر کا تصور ہے مگر انگریزی کے شعرا نے ہائیکو کے لیے کوئی میٹر ایجاد نہیں کی ۔ وہ 5-7-5 سلیبل کی پابندی کو ہی کافی سمجھتے ہیں ۔ انگریزی شعرا کا ایک طبقہ یہ اعتراف کرتا ہے کہ انگریزی کے کچھ سلیبل بہت طویل ہوتے ہیں اس لیے کبھی کبھی سترہ سلیبل کا ہائیکو بہت طویل ہو جاتا ہے اور انحصار کی

صفت مجروح ہوتی ہے۔ لہٰذا، وہ بارہ سلیبل کے ہائیکو کہتے ہیں جو کہ ان کے مطابق جاپانی کے سترہ مورا کے قریب تر ہوتا ہے۔ اس لیے ہائیکو کے لیے کوئی بحر ایجاد کرنا یا کسی مروجہ بحر کے استعمال پر اصرار کرنا درست نہیں ہے۔ صرف سبب، متحرک یا ساکن حرف کو ایک مورا تسلیم کرتے ہوئے ہائیکو تخلیق کرنا ہی جاپانی ہائیکو گوئی کے اصول کے مطابق ہوگا۔ چونکہ اردو اور جاپانی کی لسانی ساخت بالکل مختلف ہے اس لیے اس سلسلے میں انگریزی کی طرح لوچ دار رویہ اپنانا ہوگا۔ یعنی مصرعوں میں سلیبل کی تعداد کو زبردستی ملحوظ رکھنا ضروری نہ ہو۔ اگر پہلے مصرعے میں چار سلیبل ہی میں مفہوم پورا ہو جاتا ہے تو بلا ضرورت ایک مورا نہ بڑھایا جائے۔ اس سلسلے میں محسن بھوپالی کا ایک ہائیکو کا تجزیہ پیش ہے۔

دور کونج کی ڈار/ اوجھل ہوتے ہوتے بھی

کہہ گئی جیون راز

اس ہائیکو کو انھوں نے فعلن فعلن فع کی بحر کے مطابق کہنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے غیر ضروری الفاظ لانے پڑے ہیں۔ نیز پہلا مصرع طویل ہو گیا ہے۔ جبکہ جاپانی میں صرف اتنے ہی الفاظ لائے جاتے ہیں جو معنی کی ترسیل کے لیے کافی ہوتے ہیں بلکہ کچھ گنجائش قاری کی ذہنی ریاضت کے لیے بھی رکھی جاتی ہے۔ اس ہائیکو کو اگر اس طرح کہتے تو زیادہ بہتر ہوتا

کونج کی ڈار/ اوجھل ہو کر کہہ گئی/ راز حیات

محسن بھوپالی کے ہائیکو کے آخری مصرعے میں جیون راز کی ترکیب غیر فصیح ہے اور صرف اس لیے لائی گئی ہے کہ اردو کے شعرا یہ سمجھتے ہیں کہ ہائیکو صرف سبب کی شاعری ہے اس لیے حیات کی جگہ جیون بحر کے مطابق بیٹھتا ہے۔ لفظ 'دور' بھی غیر ضروری ہے۔ 'اوجھل ہو گئی' سے مفہوم مکمل ہو جاتا ہے۔ 'راز حیات' میں پانچ مورا ہیں۔ اگر 'راز حیات' کے بجائے 'راز ہستی' لکھیں تو صرف چار مورا ہوں گے۔ اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اگر چار مورا میں مفہوم مکمل ہو سکتا ہے تو ضروری نہیں کہ سترہ کی تعداد مکمل کرنے کے لیے پانچ مورا لائے جائیں۔ ہاں، شعری حسن کے تقاضے کے مطابق شاعر دونوں میں سے ایک کا انتخاب کر سکتا ہے۔ جاپانی ہائیکو نگاری کا اصول ہے کہ مورا کی تعداد سترہ یا اس سے کم ہو۔ اس لیے اگر سولہ یا پندرہ میں مفہوم کی ترسیل ہو جاتی ہے تو سترہ کی تعداد پوری کرنے کے لیے غیر ضروری الفاظ یا سبب لانا ممنوع ہے۔ اس لیے جب ہم مروجہ بحر فعلن فعلن فع کے مطابق ہائیکو کہنے کی کوشش کرتے ہیں تو صرف بحر کے مصرعے مکمل کرنے کے لیے الفاظ کی فضول خرچی کرتے ہیں اور اکثر ایسا قافیہ ملانے کے چکر میں کرنا پڑتا ہے۔ جبکہ جاپانی میں سارا زور موضوع کی ترسیل یا منظر کی تصویر کشی پر صرف کیا جاتا ہے۔

ہائیکو کی تکنیکی خصوصیات

ہائیکو کی تکنیکی خصوصیات میں مورا کی تعداد کے علاوہ موسمی لفظ اور کرے جی اہم ہیں۔ ان دونوں کے بغیر کوئی بھی سہ سطری نظم ہائیکو نہیں کہلا سکتی۔

موسمی لفظ یا کگو ہائیکو کا اہم ترین جزو ہے۔ اس کے بغیر کسی نظم کو ہائیکو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ ہائیکو اور سین ریو میں فرق کگو کا ہی ہے۔ اسے محور لفظ بھی کہتے ہیں۔

فطرت کے ساتھ ساتھ موسم بھی جاپانی شاعری کا جزو لاینفک رہا ہے۔ آٹھویں اور نویں صدی میں جاپانی شاعری کے جو دو مجموعے مان یوشو اور کوکن شو ترتیب دیے گئے ان میں موسم پر کئی باب مخصوص تھے۔ خاص طور پر جن اصناف میں شعرا اشتراک کرتے ہیں ان میں موسم کا حوالہ ایک ضروری حصہ ہوتا ہے۔ بہر حال، کگو کی اصطلاح 1908 ہی میں وضع کی گئی۔ کگو وہ الفاظ ہیں جو کسی خاص موسم کی طرف اشارہ کرتے ہیں جیسے بہار، خزاں، برسات، گرمی وغیرہ۔ ان کے علاوہ وہ الفاظ یا مظاہر فطرت بھی کگو کی حیثیت سے استعمال ہو سکتے ہیں جو کسی خاص موسم سے منسوب یا مخصوص ہیں اور ان کا ذکر یا دیدار کسی خاص موسم کی طرف توجہ مبذول کر دیتا ہے۔ جیسے خشک پتا، خزاں کا پتہ دیتا ہے، کوٹ جاڑے کی علامت ہے، کوئل موسم بہار کی آمد کا پتہ دیتی ہے بارش یا سیلاب یا بوندا باندی موسم باراں کی طرف اشارہ کرتی ہے اور خشک سالی یا پسینہ گرمی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اسی طرح سیکڑوں ثقافتی، مذہبی یا فطری مظاہر ہیں جو کسی خاص موسم سے منسوب ہیں۔ لہٰذا، ہائیکو میں براہ راست کسی موسم کا ذکر ہوتا ہے یا پھر کسی خاص موسم سے منسوب کوئی مظہر کا ذکر ہوتا ہے۔ اکثر ایک کہنہ مشق ہائی جن (ہائیکو گو شاعر) اپنے موضوع ہی میں موسمی لفظ کو پرو دیتا ہے کہ وہ ہائیکو کا ایک اٹوٹ حصہ بن جاتا ہے اور اسے ہائیکو کے موضوع سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر باشو کا مشہور ہائیکو:

کہنہ تالاب/ مینڈک کی جست سے/ پانی کی آواز

اس ہائیکو میں مینڈک بہار کگو یا موسمی لفظ ہے۔ جاپان میں مینڈک موسم بہار کی علامت ہے۔ اس میں مینڈک ہائیکو کے موضوع میں پیوست ہے اس لیے عام قاری جو ہائیکو کی اس خصوصیت (کگو) سے واقف نہ ہو وہ یہ نہیں سمجھ سکتا کہ شاعر نے کس خوبی سے ہائیکو میں موسمی لفظ اور ہائیکو کے اصل موضوع کو ایک ساتھ پرو دیا ہے۔ مینڈک برصغیر ہندو پاک میں برسات کی علامت ہوگا۔

ایک اہم نکتہ جس سے اردو کے شاعر ناواقف ہیں وہ یہ ہے کہ کگو کا لزوم ہائیکو میں اس لیے ہے کہ اس میں تازہ مشاہدے یا موجودہ لمحے کے کسی تجربے کے بیان کو یقینی بنایا جا سکے۔ ماضی کے واقعات یا تجربے یا وہ واقعات جو حسب معمول ہوتے ہیں ہائیکو کا موضوع نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا، ہائیکو میں تازہ مشاہدے کے بیان کو یقینی بنانے کے لیے موسمی لفظ کی شرط رکھی گئی ہے تا کہ شاعر پچھلی گرمی کا واقعہ اس برسات میں نہ بیان کرے جیسا کہ اردو شاعری خصوصاً غزل میں ہوتا ہے۔ ہائیکو میں اسی موسم کا ذکر لازمی ہے جس موسم کا مشاہدہ شاعر کر رہا ہے۔ ہائیکو ڈرائنگ کی تصوراتی شاعری نہیں ہے۔ نیز، موسم گرما میں لکھے جانے والے ہائیکو میں موسم سرما کا کگو نہیں ہو سکتا کیونکہ اس سے ظاہر ہوگا کہ شاعر نے موسمی لفظ کو صرف رسمی طور پر استعمال کیا ہے اس میں تازگی نہیں ہے۔ موسمی لفظ کا مقصد ہی ہائیکو کو تازگی بخشنا ہے۔ اگر ہائیکو موسم خزاں میں تخلیق کیا گیا ہے تو اس میں موسم خزاں کا کگو ہی لازمی ہے۔

چند مثالیں:

موسم بہار کا دن۔۔
نقوش پا کی لمبی قطار
ساحلی ریت پر (شکی)

اس ہائیکو میں براہ راست موسم بہار کا ذکر ہے لیکن رسمی طور پر نہیں۔ شاعر نے اس میں قاری کے لیے غور و فکر کا سامان چھوڑ دیا ہے۔ یعنی جہاں سے شاعر نے ہائیکو کو چھوڑا ہے وہاں سے قاری کا کام شروع ہوتا ہے۔ دراصل شاعر موسم بہار میں نقوش پا کی لمبی قطار دیکھ رہا ہے۔ وہ وہ سوچ رہا ہے کہ خزاں کے موسم میں اس سے قبل کتنے لوگ اس ساحل سے گذرے ہیں تب جا کر اسے موسم بہار دیکھنا نصیب ہوا ہے:

بوڑھا شخص/ جو کی بالیاں کاٹتا ہے
اس کا جسم ہنسوے سا

اس میں کسی موسم کا براہ راست ذکر نہیں ہے۔ مگر جو کی بالیاں کاٹنے کا ایک خاص موسم ہوتا ہے۔ لہٰذا، جو کی بالیاں کاٹنے میں کگو پوشیدہ ہے۔

زرد پتے/ پیڑ کے بکھرتے ہوئے
احساسات ہیں (کوجی)
'زرد پتے' خزاں کگو ہے
طوفانی ہوا اڑا لائی ہے

کافی پتے
آگ جلانے کے لیے
(ریوکان)

اکثر ہائیکو کی اس خصوصیت نے یعنی موسمی لفظ کو ہائیکو کے موضوع میں فنکارانہ چابکدستی سے پیوست کردینا کہ موسمی لفظ لگو ہائیکو سے غائب معلوم ہو اردو کے بڑے نقادوں کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر عنوان چشتی اپنی کتاب 'اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے' میں لکھتے ہیں:

''فضل حق قریشی نے ایک ہائیکو کا آزاد ترجمہ کیا ہے:

چاول کے ایک پورے کی پال
جھک گئی ہے بوجھ سے کیوں کہ
ایک مکوڑا اس پر آبیٹھا ہے

اس ترجمے میں خارجی خصوصیات تو کجا بعض دوسری خصوصیات بھی موجود نہیں ہیں۔ اس ترجمے میں نظم کے پس منظر کے طور پر موسم، منظر اور فطرت نہیں ہے۔ کوئی مخصوص لفظ بھی نہیں ہے کہ ہائیکو میں یہ تمام چیزیں ضروری ہیں۔''

یہاں دھان کی بالیاں ظاہر ہے کسی خاص موسم کی طرف اشارہ کررہی ہیں یعنی دھان کی بالیاں لگو ہیں۔ ایک مکوڑا اس پر آکر بیٹھ گیا ہے۔ پھر بھی عنوان چشتی صاحب کہتے ہیں کہ اس میں موسم، منظر اور فطرت نہیں ہے۔

کرے جی

ایک روایتی اور کامیاب ہائیکو کی تخلیق کے لیے جو اصول وشرائط وضع کیے گئے ہیں ان میں سے ایک کرے جی بھی ہے۔ اسے کٹنگ ورڈ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو تین سطری ہائیکو کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں تاکہ ہائیکو ایک سپاٹ جملہ نہ معلوم ہو۔ اس کے علاوہ یہ الفاظ ہائیکو میں اتار چڑھاؤ اور ڈرامائی کیفیت پیدا کرتے ہیں، احساس کی نزاکت اور تحیر کا عنصر ڈالتے ہیں۔ جاپانی زبان میں کرے جی اٹھارہ ہیں۔ ان کا اردو یا انگریزی متبادل نہیں ہے۔ مگر اردو میں علامت اوقاف، حرف فجائیہ یا حرف ندا کرے جی کی حیثیت سے استعمال ہوسکتے ہیں۔ کرے جی ہائیکو کو ساختیاتی سہارا دیتے ہیں کیونکہ ان کے بغیر ہائیکو تین سطروں کا ایک سپاٹ بیان یا خبر بن جائیگا۔ کرے جی ہائیکو کے کسی بھی سطر میں آسکتے ہیں اور ایک ہائیکو میں ایک ہی کرے جی ہونا چاہیے۔ کلاسیکی شعرا کے یہاں کبھی کبھی ضرورتاً دو یا تین کرے جی آگئے ہیں مگر وہ بے حد استثنائی حالت میں ضرورت شعری کے تحت ہی آئے ہیں۔ ایک سے زیادہ کرے جی ہائیکو کا نقص ہے۔

کچھ کرے جی ہیں:
یا، کانا، کیری، کا، راموو غیرہ

مثال کے طور پر باشو کا یہ ہائیکو
فوروا کے یا

اس مصرعے میں یا کرے جی ہے۔ فورواکے کا معنی کہنہ تالاب۔ اس لیے فوروا کے سے جملہ مکمل ہوجاتا ہے۔ مگر کرے جی 'یا' کا مقصد یہ باور کرانا ہے کہ اس مصرعے کا دوسرے مصرعے سے کوئی نحوی تعلق نہیں ہے۔ مصرع اپنے آپ میں مکمل ہے:

اس کا دوسرا اور تیسرا مصرع
مینڈک کی جست سے
پانی کی آواز

دوسرا مصرع تیسرے مصرعے سے مربوط ہے اس لیے دوسرے مصرعے میں کرے جی 'یا' نہیں لایا جاسکتا ہے۔

اکثر تیسرے مصرعے میں کرے جی 'کانا' لایا جاتا ہے۔ جب جملہ مکمل ہوتا ہے مگر شاعر چاہتا ہے کہ قاری کی توجہ پھر سے ابتدائی مصرعے کی طرف مبذول کی جائے۔

کرے جی سے اردو کے ہائیکو نگار شعرا اب تک لاعلم رہے اور ان کی کسی بھی تحریر میں اس سے قبل اس کا تذکرہ نہیں ملتا۔

ہائیکو کی جمالیات

جاپانی جمالیات کے دو تصورات وابی اور سابی ہیں جو زین بدھ ازم کے اثر سے ہائیکو کا حصہ بن گئے ہیں۔ سابی سے مراد وہ حسن ہے جو فطری بے ترتیبی اور دنیا کی بے ثباتی اور غیر مکمل ہونے کے احساس میں ہے۔ وابی سے مراد وہ فطری حسن ہے جو عمر رسیدگی، کہنگی اور خستگی میں مضمر ہے۔ جاپانی جمالیات میں چہرے کی جھریاں، ہوا کے جھونکوں سے الجھے ہوئے بال، فطرت کا حسن اور سکوت، موسم گزیدگی کی وجہ سے کپڑوں کا دھندلاتا رنگ، باغ کے سرسبز فرش پر بکھرے ہوئے خشک پتے، راستے کے کنارے فطری بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے چھوٹے بڑے پتھر، جوتے کی کہنگی اور خستگی اور اس پر موسم کے سرد وگرم کا اثر، مکانوں کی دیواروں پر موسم اور کہنگی کے نشان، سادہ اور فطری طرز زندگی، فقر اور خلوت نشینی وغیرہ وابی اور سابی کے تصورات کے مظہر ہیں۔ اس لحاظ سے جاپانی جمالیات مغربی جمالیات سے یکسر مختلف ہے جہاں دنیا اور اشیا میں رکھ رکھاؤ، مصنوعی زیب وزینت، میک اپ اور چیزوں میں پرفیکشن کی توقع جمالیاتی احساس کے تقاضے ہیں۔ وابی اور سابی کے تصور کو بہتر طور پر واضح کرنے کے لیے جاپان کے کلاسیکی شاعر اور بودھ سادھو ریکو کی زندگی سے دو واقعات پیش ہیں۔

ایک دفعہ ریکو کے ایک شاگرد نے باغ کو بکھرے ہوئے خشک پتوں سے بالکل صاف کردیا۔ اس پر ریکو نے شاگرد سے اپنی ناراضی کا اظہار کیا اور اس سے کہا کہ اسے سابی کا علم نہیں ہے۔ اس کے بعد انھوں نے درخت کی ایک شاخ کو ہلایا جس سے کچھ پتے گر کر زمین پر بکھر گئے۔ ایک دوسرے موقع پر جب ایک ٹی ماسٹر (چائے کی تقریب میں چائے پیش کرنے والا شخص) نے اسے ایک خوب صورت اور قیمتی چائے دانی سے چائے پیش کی تو اس نے اس چائے دانی کی کوئی تعریف نہیں کی۔ اس پر ٹی ماسٹر نے مایوس ہوکر چائے دانی کو پھینک دیا جس سے وہ ٹوٹ گئی۔ مگر بعد میں اسے اٹھا کر گوند سے جوڑ دیا گیا۔ ایک دوسرے موقع پر جب اسی چائے دانی سے ریکو کو چائے پیش کی گئی تو انھوں نے اسے دیکھ کر کہا ''ہاں اب یہ وابی کا نمونہ بن گئی ہے۔''

وابی سابی کا یہ جمالیاتی تصور شاعری کے علاوہ جاپان کے دوسرے فنون میں بھی داخل ہوگیا۔ خاص طور پر اس تصور نے جاپانی فیشن کی دنیا میں بھی اثر ڈالا۔ جہاں لباس میں کہنگی، خستگی اور موسم گزیدگی کو مصنوعی طور سے اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ ان پر اصل کا گمان ہو۔ فیشن میں وابی سابی کا یہ رجحان مغربی فیشن پر بھی اثر انداز ہوا۔ جینز پینٹ میں پھٹے ہوئے یا گھسے ہوئے حصے ہونے کا تاثر مصنوعی طور پر پیدا کرنے کا رجحان دراصل مغرب میں جاپانی کے وابی سابی کے تحت ہی آیا ہے۔ یہ مغرب کا اوریجنل فیشن نہیں ہے۔ ہندوستانی فلمی گیت کار شیلندر نے ستر کی دہائی میں جب فلم شری چار سو بیس کا گانا 'میرا جوتا ہے جاپانی' لکھا تھا تو دراصل انھوں نے جاپانی جمالیات سے اپنی واقفیت کا اظہار کیا تھا۔ ''میرا جوتا ہے جاپانی'' سے مراد راجکپور کا امپورٹڈ، قیمتی اور پالش سے چم چم کرتا جوتا نہیں تھا بلکہ کہنگی، خستگی اور موسم گزیدگی یعنی وابی اور سابی کے 'حسن' سے مملو جوتا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ راجکپور کا پورا گٹ اپ ہی وابی سابی کے تصور پر وضع کیا گیا ہو اور راج کپور ہی نے ''جوتا ہے جاپانی'' کا تھیم شیلندر کو دیا ہو۔ بہرحال، یہ حقیقت ہے کہ جاپانی جمالیات نے مغربی اور مشرقی جمالیات کو کسی نہ کسی طرح متاثر ضرور کیا۔

■

Sohail Arshad
Mirza Ghalib Street, Raja Bandh
P.O. Raniganj-713347 (WB)
Mob.:9339373391

ادبی مباحث

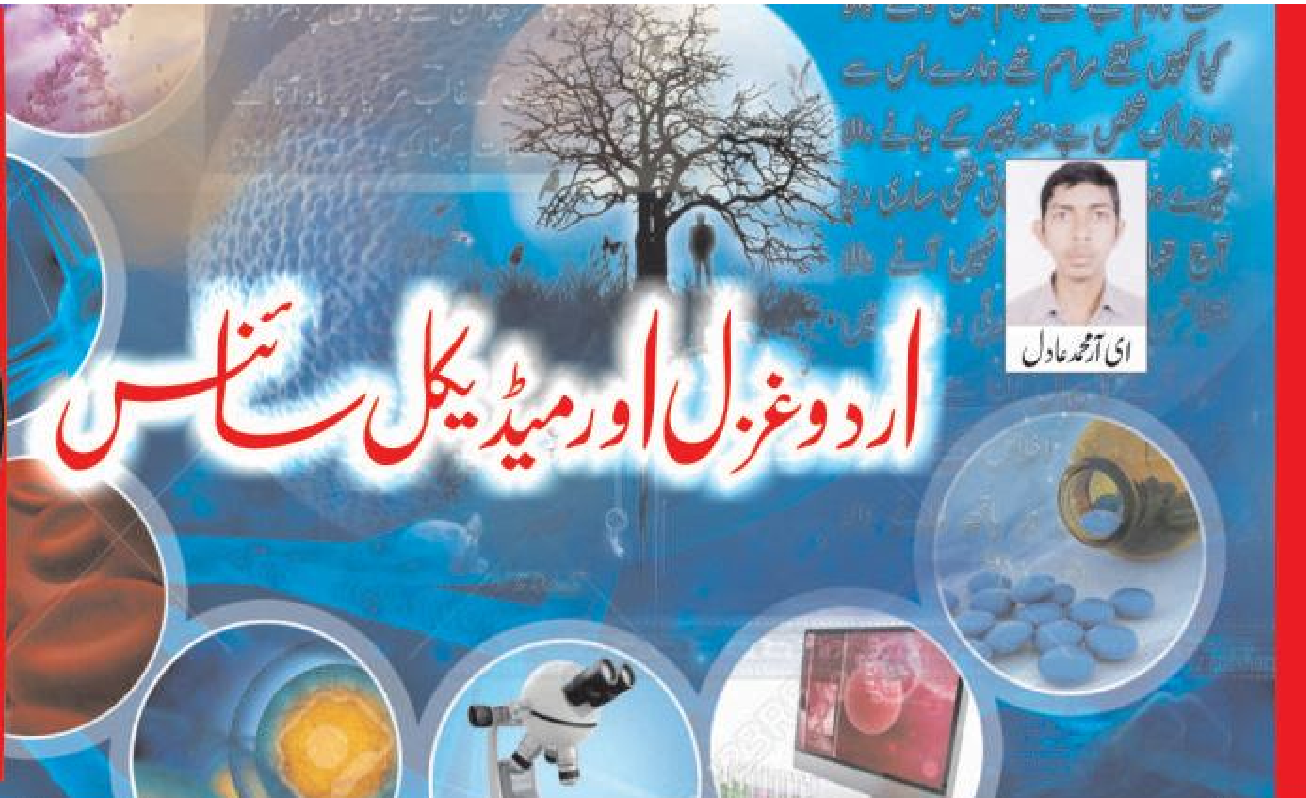

اردو غزل اور میڈیکل سائنس

ای آر محمد عادل

تاریخ کے گوشوں کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچے گی کی میڈیکل سائنس اور ادب کا دیرینہ تعلق رہا ہے۔ دورِ قدیم سے لے کر ادب یا شاعری کی ابتداء اور اس کے بام ارتقا تک ہم کو ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ جو اس بات کی روشن دلیل ہیں کہ قدیم دور کا انسان مختلف صلاحیتوں کا حامل تھا۔ وہ بیک وقت فلسفہ، مابعد الطبعیات، مذہب، تاریخ، تہذیب، تقویم، آرٹ، لسانیات، انشاء، شاعری، ارضیات، جغرافیہ، علم الادویہ، معدنیات، علم طبعیات، کیمیا، علم ہیئت وریاضی سے واقفیت رکھتا تھا۔ اس کی شخصیت میں تحقیق اور تجسس کے بھی عناصر ہوا کرتے تھے۔ اس سلسلے سے ارسطو کا نام پیش کیا جا سکتا ہے کہ اس کی ذات میں فلسفہ، علم و حکمت اور ادب کی دلچسپی یکجا تھی۔ اردو کا دور آیا تو ہم دیکھتے ہیں کہ اردو ادب کے مشہور و معروف شاعر حکیم مومن خاں کی مثال بھی اس ضمن میں نمایاں ہے جو اپنے دور کے ایک بہترین حکیم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بے مثل ادیب و شاعر کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔ میڈیکل سائنس کے حوالے سے اردو شاعری کا مطالعہ ایک حیرت انگیز اور دلچسپ موضوع ہے۔ کیونکہ میڈیکل سائنس کا تعلق انسانی زندگی سے ہے اور ادب اس زندگی کی ترجمانی کرتا ہوا نظر آتا ہے تو یہ بات غور و فکر پر آمادہ کرتی ہے کہ کس طرح اس کا دامن اس موضوع سے گریز کر سکتا ہے۔ دیکھنے میں شاعر اور طبیب ایک دوسرے سے بہت مختلف لگتے ہیں لیکن دریافت کا ایک مشترکہ احساس اور قدریں دونوں میں پائی جاتی ہیں۔ جس طرح ایک ماہر طبیب غور و فکر اور تجزیہ سے کسی شے کو دریافت کرتا ہے اسی طرح ایک شاعر بھی اپنے تجربات کا اظہار اپنے اشعار میں کرتا ہے۔

سائنس کے حوالے سے دیکھا جائے تو ہمارے جسم میں متفرق اکائیاں موجود ہیں ان اکائیوں کو بیان کرنے کے لیے لفظ خلیہ (Cell) کا استعمال ہوتا ہے۔ سب سے پہلے رابرٹ ہک (Robert Hook) نے 1665 میں اپنی بنائی ہوئی خوردبین کے ذریعے اس کی دریافت کی۔ سیل کا مطلب لاطینی زبان میں چھوٹے کمرے ہوتا ہے۔

یہ ہمارے جسم کے بلڈنگ بلاکس کہلاتے ہیں۔ جس طرح کوئی بلڈنگ اینٹوں سے مل کر بنتی ہے اسی طرح ذی حیات کے اجسام بھی خلیات سے جڑنے سے وجود میں آئے ہیں۔ نرم و نازک مہکتے ہوئے پھول ہوں، یا تناور درخت، یا پھر ہری ہری گھاس، انسان ہوں، چرند ہوں، یا پرند زندگی کی ہر شے کا وجود خلیہ کے سبب ہی ممکن ہے۔

خلیہ کی بہت سی قسمیں، شکلیں، اور سائز ہوتے ہیں سب سے بڑا خلیہ شترمرغ کا انڈا تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور سب سے چھوٹے خلیہ کا سائز اتنا ہوتا ہے کہ اگر دس لاکھ خلیات کو ایک جگہ رکھا جائے تو پن کے سر کے برابر جگہ میں سما جائیں گے۔ انسانی جسم کی ہر حرکت، جنبش، اور فعل خلیات کے سبب ہی وجود میں آتے ہیں۔ کچھ خلیات پھیپھڑوں کو بناتے ہیں تو کچھ دل کی تشکیل کرتے ہیں۔ نیورون نامی خلیات ہاتھ، پیروں، آنکھوں وغیرہ سے آنے والے پیغاماتی سگنل کو دماغ تک پہنچانے میں مدد کرتے ہیں۔ ہمارے خون میں پائے جانے والے سرخ خلیات (RBC) آکسیجن کو لانے لے جانے کا کام انجام دیتے ہیں۔ ہر خلیے کا اپنا ایک مکمل نظام ہوتا ہے جو کسی خاص کام کو انجام دیتا ہے۔ اس میں مائٹو کانڈریا نام کا پاور پلانٹ موجود ہوتا ہے جس سے اس کو توانائی ملتی رہتی ہے۔ یہ خون کے سرخ خلیات کو چھوڑ کر جسم کے تمام خلیات میں پایا جاتا ہے۔ نیوکلیس نامی کنٹرول روم بھی موجود ہوتا ہے۔ گالگی باڈیز پروٹینس کو اسٹور کر کے رکھتی ہے۔ ویسیکلس چیزوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتی ہے۔ یہ مکمل طور سے ایک حفاظتی پیکٹ نما جھلی میں محفوظ رہتا ہے۔ احمد فراز کا یہ شعر اس بات کی ترجمانی میں پیش کیا جا سکتا ہے:

ذرّے ذرّے میں ہے آباد جہاں
خود کو ہر شے میں سمو کر دیکھو

شعر میں استعمال الفاظ 'ذرّے ذرّے میں ہے آباد جہاں' خلیات کی بناوٹ اور اس میں آباد جہاں یعنی اس کے مختلف حصّوں کو سمجھنے کی دعوت دیتا ہوا نظر آ رہا ہے۔

ہر شخص اوسطاً ایک سو کھرب (100 Trillion) خلیات اپنے جسم میں رکھتا ہے۔ زندگی کے وقوع پذیر ہونے سے لے کر تا حیات انسانی جسم میں تبدیلی رونما ہوتی رہی ہے۔ کسی بھی ذی حیات کا جسم کبھی بھی ایک جیسا نہیں رہتا ہے۔ سائنس دانوں کے مطابق ہمارے جسم میں ہر لمحہ کچھ نہ کچھ بدلاؤ ہوتا رہتا ہے۔ ہمارے جسم

میں یہ تغیر کا عمل جسم کے خلیات کے سبب وجود میں آتا ہے۔ اس عمل کے دوران پرانے خلیات کا خاتمہ ہونے پر نئے خلیات ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ سائنس دانوں نے اس بات کو اپنے تجربات سے ثابت کیا ہے کہ جسم کی بافتیں (Tissues) مسلسل دوبارہ پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ اس عمل میں 20 کروڑ خلیات ہر منٹ وجود میں آتے ہیں اور یہ خلیات ان خلیات کی جگہ لیتے ہیں جو خلیات مردہ ہو چکے ہیں۔ اس طرح ہماری زندگی کی بقا کے لیے ان خلیوں کا اہم کردار ہے۔ دراصل ہماری زندگی ان نئے خلیوں کے بننے اور پرانے خلیوں کے مرنے پر قائم ہے۔ فانی کا یہ شعر اس عمل پر روشنی ڈالتا ہوا نظر آتا ہے:

ہر نفس عمرِ گزشتہ کی ہے میّت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

زندگی اور موت کا دار و مدار اُن خلیات پر ہی منحصر ہے۔ زندگی خلیات کے بننے اور خاتمے کے سبب رواں دواں رہتی ہے۔ اگر یہ سلسلہ قائم نہ رہے تو زندگی کسی طرح ممکن نہیں ہو سکتی۔ جگر بھی اپنے ایک شعر میں اس موضوع کو سمیٹتے ہوئے نظر آتے ہیں

زندگی اک حادثہ ہے اور کیسا حادثہ!
موت سے بھی ختم جس کا سلسلہ ہوتا نہیں

زندگی اور موت کے اس سفر میں یہ بات بہت دلچسپ ہے کہ ایک دن اس پوری دنیا کو فنا ہونا ہے اور اس بات کو دورِ حاضر میں سائنس بھی تسلیم کرتی ہے۔ ہمیں مر جانا ہے اور یہی ہماری زندگی کی اصل حقیقت ہے۔ جب سے اس کائنات کا وجود ہے نہ جانے کتنی زندگیاں زیورِ حیات سے مزیّن ہوئیں اور کتنی روحیں اس جہانِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف کوچ کر گئیں۔ زندگی اور موت کا یہ سفر انسان کے عالمِ وجود میں آنے سے لے کر اس کی وفات ہونے تک مسلسل رواں دواں رہتا ہے۔ کسی جاندار کے تمام تر جسمانی افعال کا جب خاتمہ ہوتا ہے تو اس کو طبیعی اعتبار سے موت کہا جاتا ہے۔

تمام تر جانداروں کے خلیات کے اندر ایسے کیمیائی تعملات صادر ہوتے ہیں جو رفتہ رفتہ موت کا سبب بنتے ہیں۔ خلیات کو فعال کرتے رہنے کے لیے توانائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ مختلف قسم کے کیمیائی مرکبات (Compounds) سے مل کر وجود میں آتے ہیں۔ مثلاً پروٹین، کاربوہائیڈریٹ، چکنائی (چربی) وغیرہ۔ یہ خلیات بہت حرکی ہوتے ہیں ان میں کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے۔ یہ ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کرتے ہیں اور جو حرکت پذیر نہیں ہوتے ان میں مرمت کا کام چلتا رہتا ہے۔ نئے خلیات وجود میں آتے رہتے ہیں۔ جب کسی چوٹ کے سبب خلیہ اپنے اندرونی اور بیرونی ماحول میں توازن برقرار نہیں رکھ پاتا ہے تو اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ الغرض ان کو اپنی زندگی برقرار رکھنے کے لیے عناصر (Elements) اور مرکبات (Compounds) کے ایک توازن کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ان عناصر میں آکسیجن، نائٹروجن، کاربن، گندھک وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ خلیہ میں پلازمہ یا خون کے درمیان مختلف کیمیائی عناصر اور مرکبات کا تبادلہ اس کی ضرورت کے سبب ہوتا رہتا ہے۔ جب تک یہ توازن برقرار رہتا ہے ان کے افعال برقرار رہتے ہیں اور جب اس میں تبدیلی رونما ہونے لگتی ہے تو ان کی موت واقع ہو سکتی ہے۔

اب تک 118 عناصر کی دریافت ہو چکی ہے۔ تمام عناصر میں تین چوتھائی حصہ دھاتیں اور ایک چوتھائی ادھاتیں ہیں۔ ہماری صحت کی حفاظت اور زندگی کے لیے بھی یہ بہت اہم ہیں۔ انسانی جسم میں 99% عناصر جو بڑی تعداد میں موجود ہوتے ہیں ان میں ''آکسیجن، کاربن، ہائیڈروجن، نائٹروجن، کیلشیم اور فاسفورس'' قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ 'پوٹاشیم، گندھک، سوڈیم، میگنیشیم، تانبے، زنک، سیلینیم، مولبڈینم، فلورین، کلورین، آئیوڈین، مینگنیج (Manganese) کوبالٹ، آئرن'' جیسے عناصر بھی ہمارے انسانی جسم میں موجود ہوتے ہیں جو اس کی نشو و نما میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ان عناصر کی کمی یا زیادتی کے سبب انسانی صحت متاثر ہو سکتی ہے۔ اور ہمارے جسم کو بہت سی بیماریاں لاحق ہو سکتی ہیں۔ مثلاً 'ہڈیوں کا کمزور ہونا، اوسموٹک توازن کا بگڑنا، دانتوں کی بیماریاں، لیور کا متاثر ہونا، ہیموگلوبین کی کمی ہونا، گھینگھوا (Goitre) کا بننا' وغیرہ وغیرہ۔ برج نارائن چکبست نے زندگی اور موت میں ان کیمیائی عناصر کی افادیت کو کچھ اس انداز میں بیان کیا ہے

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انھی اجزا کا پریشاں ہونا

چکبست کا یہ شعر ہم کو اس طرف غور کرنے کی دعوت دے رہا ہے کہ زندگی کس شے کو کہتے ہیں۔ زندگی کا ہونا اس شے کے زندہ ہونے کی نشان دہی کرتا ہے۔ زندگی صرف انسانوں میں ہی نہیں بلکہ حیوانات، اور نباتات میں بھی پوشیدہ ہے۔ انسانی زندگی میں اس کے جسمانی وجود سے لے کر موت آنے تک ظاہری، باطنی تبدیلی مسلسل ہوتے رہنا اس کی زندگی کی علامت ہے اور اس سلسلے کا رک جانا ہی موت ہے:

اُس مرحلے کو موت بھی کہتے ہیں دوستو
اک پل میں ٹوٹ جائے جہاں عمر بھر کا ساتھ
(شکیب جلالی)

ہمارے جسم کے خلیوں میں پایا جانے والا ڈی این اے ایک حیران کرنے والی شے ہے۔ بچے کی تخلیق کے عمل سے لے کر اور زندگی کے آخری لمحات تک یعنی تاحیات جسم کے افعال کو رواں دواں رکھنے کے لیے ڈی این اے کے دو ایک دوسرے پر لپٹے ہوئے دھاگوں پر وہ ہدایات موجود ہوتی ہیں جنھیں سائنس کی زبان میں جینز (Genes) یا کوڈز (Codes) کہتے ہیں۔ اگر تحقیق سے پہلے یہ ہدایات موجود نہیں ہوں گی تو انسان ہی کیا کسی بھی ذی حیات کی تخلیق ممکن ہی نہیں ہو سکتی۔

ہر خلیے میں ایک ڈی این اے سالمہ موجود ہوتا ہے اور ہر ایک ڈی این اے میں تین ارب مختلف موضوعات سے متعلق معلومات موجود رہتی ہیں۔ ماہرین کے مطابق ہمارے جسم کے اندر موجود ڈی۔ این۔ اے کی لمبائی بہت ہی حیرت انگیز اور دلچسپ ہے اگر اس کے ایک دوسرے پر لپٹے ہوئے دھاگوں (Double Helix) کو نکال کر ایک لائن میں رکھا جائے اور اس کی پیمائش کی جائے تو اس دھاگے کی لمبائی زمین اور چاند کے درمیان موجود فاصلے سے دس ہزار گنا زیادہ نکلے گی۔ یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ چاند اور زمین کے درمیان کا فاصلہ 3,84,400 کلومیٹر ہے۔ اور انسانی ڈی۔ این۔ اے کی لمبائی اس فاصلہ سے دس ہزار گنا زیادہ ہے۔ اردو غزل کا یہ شعر اس بات کی طرف توجہ مرکوز کرتا ہوا نظر آتا ہے:

سمٹا ہوا ہے جو میرے اندر وجود میں
پھیلے تو آسمان کی وسعت سے جا ملے
(ہلال نقوی)

خون ہمارے جسم میں گردش کرنے والا ایک سیال مادہ ہے جس میں مختلف اقسام کے خلیات، غذائی و دیگر مادے تیرتے رہتے ہیں اور پورے جسم میں خون کے ساتھ چکر لگاتے ہیں اس عمل کو دورانِ خون (Blood circulation) کہتے ہیں۔ اس میں موجود سیال (Fluid) کو پلازمہ (Plasma) کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ خون میں تین اقسام کے خلیات بھی موجود ہوتے ہیں جن کو سرخ خونی خلیات (Red blood cells)، سفید خونی خلیات (White blood cells) سوئم صفیحات (Thrombocytes) کے نام سے جانا جاتا ہے۔

عام آدمی کے لیے خون صرف ایک سرخ رنگ کا سیال مادہ ہے جو اس کی رگوں میں بہتا ہے۔ لیکن یہ بات

بہت دلچسپ اور حیرت انگیز ہے کہ کس طرح یہ سیال مادہ ہمارے پورے جسم میں سفر کرتا ہے۔اس دوران بہت سے حیران کن معجزے ہمارے جسم میں رونما ہوتے ہیں۔مثلاً جتنی دیر میں ہم پلکیں جھپکتے ہیں اتنی دیر میں کم سے کم بارہ لاکھ سرخ خلیے اپنے افعال مکمل کر کے مرجاتے ہیں اور اسی دوران اتنے ہی نئے خلیے بن کر ہمارے خون میں شامل ہو جاتے ہیں۔یہ کام ہماری ہڈیوں کا گودا (Bone Marrow) انجام دیتا ہے۔سرخ خلیوں کی عمر 120 دن ہوتی ہے اس دوران ہمارا خون 75 ہزار مرتبہ ہمارے دل سے جسم تک اور جسم سے دل تک کا سفر طے کر چکا ہوتا ہے۔ہمارے جسم میں موجود پلازمہ اور سرخ خلیے ایک منٹ میں تقریباً 72 مرتبہ اپنے صارفین کو اُن کی ضرورتیں مکمل کرتے ہیں۔اس دوران انھیں 75 ہزار لمبی شریانوں اور وریدوں سے گزرنا ہوتا ہے۔

غالب بڑے فلسفیانہ طریقے سے لہو یعنی خون کے بارے میں سوچنے کی دعوت دیتے ہیں۔عام طور سے اس دور میں یہی تصور کیا جاتا تھا کہ لہو ایک سیال شے ہے جو ہماری رگوں میں دوڑتا پھرتا ہے اور اس میں بہنے اور ٹپکنے کی خصوصیت ہوتی ہے۔یعنی اس دور کے طبیب اس کی بہت سی خصوصیات سے واقف نہیں تھے جس کی معلومات آج کی جدید میڈیکل سائنس رکھتی ہے۔لیکن غالب اپنے ایک شعر میں لہو کی ماہیت کے بارے میں سوچنے کی دعوت دیتے ہوئے نظر آرہے ہیں:

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکے تو پھر لہو کیا ہے

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے قائل نہیں ہونے سے مراد غالب لہو کو صرف رگوں میں دوڑنے پھرنے والی شے نہیں سمجھتے بلکہ وہ اس کو اس سے بھی بالاتر سمجھتے ہیں وہ اس کے دوڑنے پھرنے کی اصل وجہ کی طرف سوچنے کی دعوت دے رہے ہیں۔بہنے اور ٹپکنے کے بارے میں بتا کر اس بات پر زور دیتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ کیا سبب ہے جس کی وجہ سے لہو ان خصوصیات کا حامل ہے یعنی وہ سیال مادہ ہے تو اس کی وجہ کیا ہے یعنی لہو کے بارے میں تحقیق کرنے کی ضرورت ہے۔شعر میں استعمال ہوا جملہ 'لہو کیا ہے' اس بات کی ترجمانی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

ہماری زندگی کو رواں دواں رکھنے میں دل کا بہت بڑا کردار ہے۔اس کی تعریف میں شاعروں اور ادیبوں نے بہت کچھ تحریر کیا ہے۔دراصل یہ چار چیمبرز پر مشتمل ایک عضو ہے جو ایک پمپنگ مشین کی طرح کام انجام دیتا ہے۔یہ خون کو جسم کے مختلف اعضاء تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔یہ عمل جسم میں ایک منٹ میں تقریباً 72 مرتبہ ایک گھنٹے میں 4320 مرتبہ اور ایک دن میں

غالب بڑے فلسفیانہ طریقے سے لہو یعنی خون کے بارے میں سوچنے کی دعوت دیتے ہیں۔عام طور سے اس دور میں یہی تصور کیا جاتا تھا کہ لہو ایک سیال شے ہے جو ہماری رگوں میں دوڑتا پھرتا ہے اور اس میں بہنے اور ٹپکنے کی خصوصیت ہوتی ہے۔ یعنی اس دور کے طبیب اس کی بہت سی خصوصیات سے واقف نہیں تھے جس کی معلومات آج کی جدید میڈیکل سائنس رکھتی ہے۔

103680 مرتبہ عمل میں آتا ہے۔ہر مرتبہ خون اوسطاً 60 ہزار میل لمبی خون کی نالیوں کے ذریعے جسم کے مختلف حصوں تک گردش کرتا ہے۔اگر چند منٹوں کے خون کی فراہمی بند ہوجائے تو ہماری زندگی کے لیے بڑے خطرے کی بات ہوگی۔عابد علی عابد کی غزل کے ایک شعر کو اس بات کی ترجمانی میں پیش کیا جاسکتا ہے:

حرکت زندگی کا ہے معیار
فلسفہ یہ نہاں ہے گردش میں

ہماری آنکھیں قدرت کا حیرت انگیز معجزہ ہیں۔بظاہر یہ عضو ہے جس کی مدد سے ہمیں دیکھنے میں مدد ملتی ہے۔ ہماری آنکھیں گیند نما شکل کی ہوتی ہیں جن کا قطر تقریباً ایک انچ ہوتا ہے۔یہ سفید رنگ کے ایک سخت غلاف یا پردے میں محفوظ لپٹی ہوئی ہوتی ہیں۔آنکھ کے سامنے کی طرف غلاف میں ایک شفاف گول حصہ موجود ہوتا ہے۔اس کے پیچھے ایک چھوٹے سے حصے میں ایک سیال بھرا ہوتا ہے۔اس چھوٹی سی جگہ کے پیچھے ایک گول شکل نما بافت پائی جاتی ہے اس میں ایک سوراخ موجود ہوتا ہے۔اس بافت کو آئرس (Iris) اور اس میں موجود سوراخ کو آنکھ کی پتلی (Pupil) کہتے ہیں۔

آئرس آنکھ کا رنگ دار حصہ ہے۔اس کے اندر کے کنارے پر پتلی کے گرد چھوٹے، چھوٹے عضلات کا ایک دائرہ ہے۔یہ عضلات بہت حساس ہوتے ہیں اور روشنی ان پر اثر انداز ہوتی ہے۔کم روشنی ہونے پر آنکھوں کے یہ عضلات پتلی کو پھیلانے لگتے ہیں اور جب ہماری آنکھیں تیز روشنی یا دھوپ میں ہوتی ہیں تو یہ عضلات سکڑنے لگ جاتے ہیں یا ہم اچانک کم روشنی سے یا اندھیرے سے کسی ایسی جگہ میں آتے ہیں جہاں روشنی زیادہ ہے تو ہماری آنکھیں چندھیانے لگتی ہیں یعنی آنکھیں صاف طور سے نہیں دیکھ پاتی۔اس بات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ زیادہ اجالا یا روشنی بڑھنے پر ہماری آنکھیں دیکھنے سے قاصر ہونے لگتی ہیں اظہر عنایتی بہت ہی خوب صورت ڈھنگ سے اس فعل کو بیان کرتے ہوئے نظر آرہے ہیں:

نظر آئے نہ کچھ بھی روشنی میں
اجالے یوں بڑھائے جارہے ہیں

انسانی دماغ ایک حیرت انگیز معجزہ ہے۔بظاہر یہ ہمارے جسم کا ایک حصہ ہے لیکن ہماری شخصیت، ہمارے ردِعمل، پسند اور ناپسند، صلاحیتوں، سوچ اور فکر، جذبات، احساسات، خیالات سے اس کا گہرا رشتہ ہے۔آنکھ، ناک، کان، ہاتھ، پیر کا چلنا اور کام کرنا سب دماغ کے احکامات کے تابع ہے یعنی ہمارے جسم کی ہر حرکت اس کے حکم کے طابع ہے۔بھوک، پیاس کا لگنا، سردی، گرمی کا محسوس ہونا، ڈر اور خوف، گھبراہٹ وغیرہ یعنی ہر خواہش اور موڈ کے بارے میں یہی ہم کو معلومات فراہم کرتا ہے۔جب انسان جذبات و احساسات کی منزل سے گزرتا ہے یا بہت زیادہ خوش ہوتا ہے تو اس مرحلے پر انسان کے دل کی دھڑکن بڑھنا لازمی ہے کیونکہ اس وقت دوران خون میں تیزی آجاتی ہے جو ایک فطری عمل ہے۔لیکن اس عمل کا تعلق بھی ہمارے دماغ کے سبب ہی ممکن ہے۔جب کہ عام فہم لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کا تعلق ہمارے دل سے ہے۔جب انسان کسی کے عشق میں مبتلا ہوتا ہے یا اس پر جنونی کیفیت طاری ہوتی ہے تو اس کا سبب دماغ سے ہوتا ہے نہ کہ دل سے۔اس وقت انسانی دماغ میں خلل پیدا ہوتا ہے۔غالب اس بات کی ترجمانی اپنے ایک شعر میں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

غالب کے شعر کا یہ مصرع 'کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا' میڈیکل سائنس کی ترجمانی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔اس بات کی تصدیق آج کے Neurologists بھی کرتے ہیں برطانوی Neurologists کا یہ کہنا ہے کہ عشق ایک خاص دماغی عمل ہے جس کے دوران دماغی حصے متاثر ہوتے ہیں اور دماغی حصوں میں تحریک تیز ہوجاتی ہے۔

آج کے دور میں میڈیکل سائنس نے ناقابل فراموش ترقیاں کی ہیں۔آج ہمارے ڈاکٹر اس قابل ہو

گئے ہیں کہ کسی بڑے آپریشن سے پہلے دواؤں کے ذریعے دماغ کو بے ہوش کرنے اور جسم کے حصوں کو سن کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔اس عمل کو طبی اصطلاح میں اینستھیسیا (Anesthesia) کہا جاتا ہے۔کوئی بھی آپریشن کرنے سے قبل اس عمل کو انجام دیا جاتا ہے اس کے بعد ڈاکٹر اگر جسم میں چیر الگاتے ہیں یا نسوں میں سوئیاں چبھوتے ہیں تو ہمارے جسم کو ذرا سا بھی احساس نہیں ہوتا۔بشیر بدر اپنی غزل کے ایک شعر میں اس کی ترجمانی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

یقین جانئے احساس تک نہ ہوگا ہمیں
نسوں میں سوئیاں کوئی اگر چبھوتے بھی

میڈکل سائنس اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ اگر ہمارے جسم کو لو لگ جائے تو ہمارے لیے خطرہ ہوسکتا ہے یہاں تک کہ ہماری جان بھی جاسکتی ہے۔لو لگنے کے بعد بخار آتا ہے اور جلد کا رنگ سرخ پڑنے لگتا ہے دماغ درد محسوس کرتا ہے نبض تیزی سے چلنے لگتی ہے۔یہ بھی ممکن ہے جس شخص کو لو لگ گئی ہے وہ بے ہوش ہو جائے۔لو لگنے کی وجہ سے جسم میں پانی کی کمی بھی ہو جاتی ہے۔جب ہمارا جسم پانی کی کمی (Dehydration) میں مبتلا ہوتا ہے تو دل پر کھچاؤ ہوتا ہے اور گردے بھی متاثر ہوتے ہیں۔جس کے نتیجے میں ہمارے جسم کا کیمیائی نظام درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے۔پوٹاشیم،سوڈیم،فاسفورس اور کلورائڈ کے تناسب میں تبدیلی ہوسکتی ہے جو ہمارے جسم کے خلیوں کے افعال کے لیے بے حد لازمی ہیں۔اس سے بچنے کے لیے ہمیں کچھ احتیاط کی بھی ضرورت ہے کہ گھر سے نکلتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ زیادہ دیر تک دھوپ میں نہ رہنا پڑے۔اردو غزل کا یہ شعر اس خدشہ اور احتیاط کو بیان کرتا ہوا نظر آتا ہے:

جب ستم خیز نکلتی ہے ہوا گرمی میں
جان لینے کا ہنر اور ادا رکھتی ہے
(عادل فراز)

ان کے علاوہ اردو غزلوں میں جگہ جگہ ایسے اشارات ملتے ہیں جو میڈیکل سائنس کی ترجمانی کرتے ہوئے ظاہر ہوتے ہیں۔جن کی مثال حسب ذیل ہے:

گھروں میں آئے پلٹ کر تو یہ ہوا احساس
ہمارے ساتھ ہمارے لہو کی ہجرت تھی
(وفا نقوی)

'ہمارے ساتھ ہمارے لہو کی ہجرت تھی' یعنی یہ مصرع خون کے رواں دواں ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ بشیر بدر کی غزل کا ایک شعر ملاحظہ فرمایئے۔شاعر کہتا ہے:

ہزاروں میل کا منظر ہے اس نگینے میں
ذرا سا آدمی دریا ہے اور صحرا بھی

اس شعر سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انسانی جسم کا یہ چھوٹا سا نگینہ ہزاروں میل کا منظر اور وسعتیں رکھتا ہے۔

مثلاً انسانی جسم کے ڈی۔این۔اے کی لمبائی،جسم میں موجود تمام شریانوں اور وریدوں کی لمبائی وغیرہ وغیرہ۔ساتھ ہی 'دریا' اور 'صحرا' کے استعارے انسانی جسم میں موجود رقیق اور سیال مادّوں اور انسانی جسم میں پائے جانے والے عناصر جو صحرا کی مٹی میں بھی موجود ہوتے ہیں اور کم و بیش انسانی جسم میں بھی پائے جاتے ہیں کی ترجمانی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔جس طرح صحرا میں پیڑ پودے اور ہریالی اگتی ہے اسی طرح ہمارے جسم پر بھی بال رونما ہوتے ہیں اور جس طرح 'صحرا' میں نشیب و فراز

ماہرین کے مطابق کھانے اور پینے کی جو اشیاء ہمارے جسم میں جاتی ہیں وہ فوراً ہمارے جسم کا حصہ نہیں بنتیں بلکہ اس میں کچھ دنوں کی مدت لگتی ہے اس عمل کے دوران وہ ہمارے جسم کے خلیات میں اسٹور رہتا ہے جس کو ضرورت کے وقت استعمال کرتے ہیں۔ بیماری کے وقت جب ہم غذا نہیں کھا پاتے تو اس وقت ہمارے جسم میں موجود چربی خون میں شامل ہوتی رہتی ہے۔

پائے جاتے ہیں اسی طرح ہمارے جسم کی بناوٹ میں بھی نشیب و فراز موجود ہیں۔ بظاہر شاعر آدمی کے جسم میں 'دریا' اور 'صحرا' سے ملتی جلتی خصوصیات پر زور دیتا ہوا نظر آرہا ہے۔'ذرا سا آدمی' میں 'ذرا سا' لفظ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

ہمارے جسم میں ایک ایسا نظام موجود ہے جو کھانے اور پینے کی اشیاء کے ذریعے توانائی لیتا ہے۔جب ہم کھانا کھاتے ہیں تو ہمارے جسم میں موجود ہاضمے کا سسٹم (Digestive System) اپنا عمل کرنے لگتا ہے اور کھانے کو ہضم کرنے میں تقریباً 24 سے 72 گھنٹوں کی مدت لیتا ہے۔کھانا جب معدہ میں ہوتا ہے گیسٹرک ایسڈ اس کو مکمل طور سے گلا دیتا ہے چھوٹی آنت میں جب انزائم اور پنکریاس رس اس میں ملتے ہیں تو اس عمل کے دوران کھانا چھوٹے چھوٹے مولیکولس میں تبدیل ہو جاتا ہے اس کو چھوٹی آنت کی دیواروں کے ذریعے جذب کر لیا جاتا ہے جس کو جسم کے خلیات میں منتقل کر دیا جاتا ہے جس کا استعمال خلیات جسم کو توانائی اور پروٹین مہیا کرانے میں کرتے ہیں۔ماہرین کے مطابق کھانے اور پینے کی جو اشیاء ہمارے جسم میں جاتی ہیں وہ فوراً ہمارے جسم کا حصہ نہیں بنتیں بلکہ اس میں کچھ دنوں کی مدت لگتی ہے اس عمل کے دوران وہ ہمارے جسم کے خلیات میں اسٹور رہتا ہے جس کو ضرورت کے وقت استعمال کرتے ہیں۔ بیماری کے وقت جب ہم غذا نہیں کھا پاتے تو اس وقت ہمارے جسم میں موجود چربی خون میں شامل ہوتی رہتی ہے۔ غالب اپنے ایک شعر میں اس بات کی ترجمانی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

کیا کہوں بیماریِ غم کی فراغت کا بیاں
جو کہ کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس تھا
(غالب)

اس کے ساتھ ساتھ ایک اہم مرحلے یعنی کیموس (Chyle) کی بھی نشاندہی کرتے ہیں۔ دراصل یہ غذا کے ہضم ہونے سے پہلے کے دو اہم مرحلے ہوتے ہیں جس کو کیلوس (Chyme) اور کیموس (Chyle) کہتے ہیں۔پہلے غذا کیلوس کی منزل سے گزرتی ہے اور پھر کیموس کے مراحل میں آتی ہے،جس سے خون کی تشکیل ہوتی ہے اور اس کے ذریعے ہمارے جسم کو توانائی ملتی ہے اور بیماری کے وقت جب ہم غذا نہیں کھا پاتے تو یہ عمل پیش نہیں آتا ہے اس وقت ہمارے جسم میں موجود چربی خون میں شامل ہوتی رہتی ہے۔شعر میں آئے لفظ 'جو کہ کھایا' اور 'کیموس' اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

الغرض میڈیکل سائنس ایک طویل موضوع ہے جس کو ایک مختصر مضمون میں نہیں سمیٹا جاسکتا ہے۔اس کے لیے ایک مدت اور بے شمار صفحات درکار ہیں۔آخر میں اس شعر پر اپنی بات کو ختم کرنا مناسب ہوگا:

سرسری ہم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا
(میر درد)

کتابیات

(1) 'جسم کے عجائبات' تحقیق' جے ڈی ریٹ کلف' ترجمہ 'محمد علی سید' کراچی پاکستان

DNA(2) جسم کی کتاب ہدایت، تحقیق' رچرڈ واکر' ترجمہ 'محمد علی سید' کراچی پاکستان

(3) 'خلیہ اک کائنات' ہارون یحییٰ' مترجم 'عبدالخالق ہمدرد' لاہور پاکستان

■

ER. Mohd Adil , Hilal House, H.N: 4/114,
Jagjeevan Colony Naglah Mallah Civil Line
Aligarh - 202002 (UP)

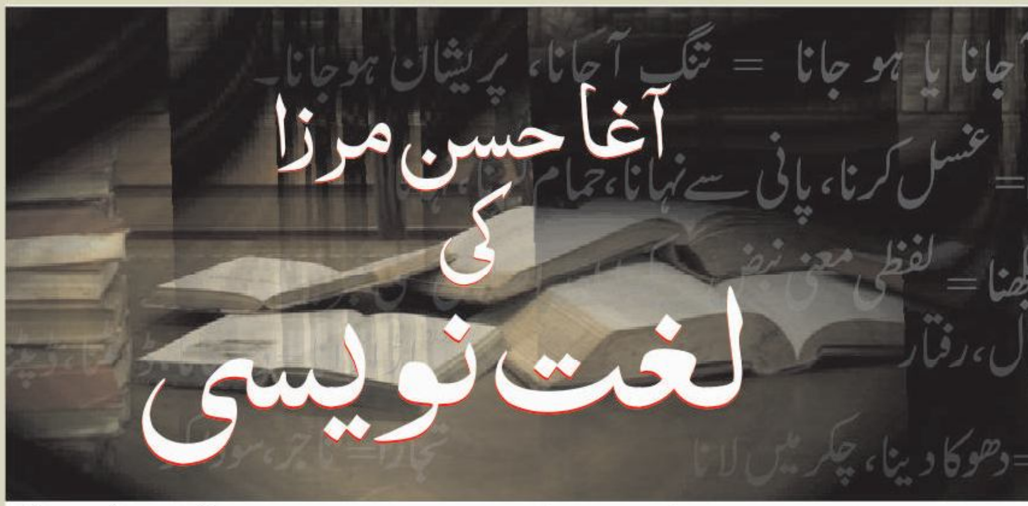

آغا حسن مرزا کی لغت نویسی

فریدہ تبسم

آغا حیدرحسن مرزا زبان کے بادشاہ ہیں۔ خصوصاً ان کی زبان لال قلعہ کی ٹکسالی سمجھی جاتی ہے، انھیں بیگماتی زبان پر بھی دسترس حاصل ہے، وہ مختلف زبانوں کے الفاظ سے اچھی واقفیت رکھتے ہیں۔ وہ اپنی تحریروں میں محاوروں، تشبیہات، استعارے اور ضرب الامثال وغیرہ کے ذریعے اپنی بات پیش کرتے ہیں۔ انھیں زبان و بیان پر خاصی گرفت تھی، یہی نہیں بلکہ وہ اپنی زبان پر ناز بھی کرتے تھے۔ یہی وجہ رہی کہ انھیں جہاں کہیں موقع ملتا اپنی زبان کے جوہر دکھاتے نظر آتے ہیں اور ان کی اسی خوبی کی وجہ سے لوگ ان کی زبان دانی کے قائل ہوجاتے ہیں۔ وہ اردو کے استاد تھے اور اپنے شاگردوں کی زبان کی اکثر اصلاح بھی کیا کرتے تھے۔ آغا حیدر کو نئے نئے الفاظ ومحاوروں کو جمع کرنے کا بے حد شوق تھا جہاں کہیں وہ کسی نئے لفظ یا محاورے کو کسی سے سنتے تو فوراً اسی وقت دریافت کرنے لگ جاتے تھے یہ لفظ کہاں سے آیا ہے اور اس کے کیا معنی ہیں۔

غرض انھیں اپنی بیگماتی زبان پر ناز تو تھا ہی لیکن جب وہ دکن منتقل ہوئے تو انھیں حیدرآباد کی تہذیب، رسم ورواج اور یہاں پر بولی جانے والی زبان سے لگاؤ ہوگیا۔ یہی وجہ رہی ہے کہ انھوں نے 'حیدرآباد کی سیر' نامی کتاب تصنیف کردی جس میں یہاں کے رسم ورواج، لباس وزیورات، رہن سہن، طور طریقے اور یہاں بولی جانے والی زبان کے مخصوص الفاظ کا اس کے پس منظر میں جائزہ لیا۔ جس سے دیگر علاقوں کی تہذیب خصوصاً زبان سے ان کی دلچسپی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کی کتاب 'حیدرآباد کی سیر' سے ایک مثال دیکھیے جہاں انھوں نے لفظ 'حمال' کی تحقیق وکھوج کے بعد اس کی وضاحت بڑی عمدگی سے کی ہے یہ لفظ کہاں سے آیا ہے اور اس کا استعمال کیسے ہوا ہے، مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''حمال! حمال! بھئی یہ حمال کیا ہے؟ قلی کو یہاں حمال کہتے ہیں ترکی لفظ کو ترک کرکے عربی کے لفظ حمال کا یہاں لہجہ متحمل ہوگیا ہے۔ عربی فارسی کے بکثرت مغلق الفاظ یہاں کے عام روزمرہ میں داخل ہیں۔ ثمرہ بہ معنی باغ کے پھلوں کا ٹھیکہ افزود بہ معنی زیادہ اور اسی قبیل کے سیکڑوں لفظ رستہ چلتے سن لیجیے۔ ایسے لفظ صرف دو ہی شہروں میں سننے میں آتے ہیں ایک لکھنؤ دوسرا حیدرآباد۔''

اس اقتباس سے آغا حیدرحسن مرزا کی نئے الفاظ کے سلسلے میں تحقیق وجستجو کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھیں کسی بھی علاقے کی تہذیب اس کے تاریخی پس منظر اور اس کی زبان کے محفوظ الفاظ کو جاننے اور ان کے معنی ومفہوم تک رسائی حاصل کرنے کا بڑا شوق تھا، یہی وجہ رہی ہے کہ وہ حیدرآبادی تہذیب اور دکنی زبان کو پسند کرنے لگے اور پھر دکنی لغت پر کام کرنے کا ارادہ کیا۔ جس سے حیدرآبادی تہذیب اور دکنی زبان سے ان کی محبت و واقفیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ پروفیسر مغنی تبسم ایک جگہ آغا حیدرحسن مرزا کی حیدرآبادی تہذیب اور یہاں کی زبان سے محبت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آغا صاحب کو حیدرآباد کی تہذیب اور حیدرآباد میں بولی جانے والی زبان سے گہری محبت تھی اس کا اندازہ ان کی تصانیف، ندرت زبان اور حیدرآباد کی سیر، سے بخوبی ہوتا ہے۔''

اس اقتباس سے اس بات کی تصدیق ہوجاتی ہے کہ حیدرآبادی تہذیب اور یہاں بولی جانے والی زبان کس قدر پسند تھی۔ یہی وجہ رہی کہ انھوں نے دکنی لغت کی تدوین کا ارادہ کیا۔ چنانچہ آغا حیدرحسن مرزا نے دکنی لغت اور تذکرہ دکنی مخطوطات کو مرتب کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے بڑی حد تک کام مکمل کرلیا تھا لیکن اپنی زندگی میں اس کو وہ مرتب نہ کرسکے۔ بعد کو ان کے داماد میر معظم حسین اور ان کی اہلیہ نے اس سلسلے میں پروفیسر مغنی تبسم سے مشورہ لیا اور مغنی تبسم ہی کے مشورے سے ان کے داماد اور بیٹی نے اسے شائع کروانے کا فیصلہ کیا اور اس طرح 2002 میں دکنی لغت و تذکرہ دکنی مخطوطات کے عنوان سے آغا حیدرحسن مرزا ریسرچ سنٹر، حیدرآباد سے شائع ہوئی۔

پروفیسر مغنی تبسم اس بات پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میر معظم حسین صاحب نے آغا حیدرحسن مرزا کے چند مسودات دکھائے جو ان کے کاغذات میں دستیاب ہوئے تھے، اس میں ایک مختصر سی دکنی لغت تھی اور آغا حیدرحسن مرزا کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ چند مخطوطات کا تذکرہ کیا تھا۔ انھیں دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ آغا حیدرحسن مرزا نے دکنی لغت کی تدوین کا کام شروع کیا تھا۔ جسے وہ مکمل نہ کرسکے۔ اسی کے ساتھ وہ اپنے کتب خانے میں محفوظ دکنی مخطوطات کی وضاحتی فہرست یا تذکرہ تحریر کررہے تھے یہ کام بھی ادھورا رہا، یہ دونوں کتابیں نامکمل تھیں اور آغا صاحب مرحوم کو ان پر نظر ثانی کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ قیاس کہتا ہے کہ انھوں نے یہ کام اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے سے شروع کیا تھا اور زندگی نے ان سے وفا نہیں کی کہ وہ اسے پایہ تکمیل کو پہنچاتے۔ میں نے میر معظم حسین صاحب اور ان کی اہلیہ محترمہ سے عرض کیا کہ یہ آغا صاحب کی نادر تحریریں ہیں اور انھیں شائع کردینا چاہیے۔ انھوں نے میری تجویز سے اتفاق کیا اور ان کتابوں کو مرتب کرنے کی ذمے داری مجھے سونپی۔''

لہٰذا مغنی تبسم نے ان تحریروں کی اہمیت کے پیش نظر

اپنے عالمانہ مقدمہ کے ساتھ اس کو مرتب کیا۔ اس طرح مغنی تبسم کی کوشش سے آغا حیدر حسن مرزا کی یہ دکنی لغت، منظر عام پر آئی۔ مغنی تبسم نے جب اسے مرتب کرنا شروع کیا تو دکنی کی دیگر لغات سے اس کا تقابل کیا تو انھیں ایک تہائی سے زیادہ ایسے الفاظ ملے جو بالکل نئے تھے یہی وجہ رہی کہ مغنی تبسم نے اس لغت کو مرتب کرنے میں اپنی دلچسپی کا اظہار کیا وہ نہیں چاہتے تھے کہ دکنی زبان سے متعلق یہ قیمتی سرمایہ ضائع ہو جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں مغنی تبسم نے اپنے دیباچے میں اس کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے بتایا کہ:

'' آغا حیدر حسن مرزا کی دکنی لغت کی اہمیت اور انفرادیت کو اجاگر کرنے کے لیے اس کا تقابل دکنی کی دیگر لغات سے کیا گیا تو انکشاف ہوا کہ اس میں ایک تہائی سے زیادہ الفاظ ایسے شامل ہیں جو کسی اور دکنی لغت میں نہیں ملتے۔''

غرض مغنی تبسم کے اس اقتباس سے ہم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آغا حیدر حسن مرزا کی یہ دکنی لغت کتنی اہمیت کی حامل ہے۔ ساتھ ہی آغا کی علمی صلاحیتوں اور تحقیق و جستجو کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ حالانکہ دکن کی تہذیب، زبان، رسم و رواج ان کے لیے بالکل نئے تھے۔ لیکن بہت ہی قلیل عرصے میں انھوں نے دکن کے رسم و رواج، طور طریقوں اور یہاں کی بول چال کی زبان اور محاوروں سے واقفیت حاصل کر لی، آغا حیدر حسن مرزا کی زبان خود قلعہ معلی کی تھی وہ خود بڑے شستہ و شائستہ الفاظ استعمال کرتے تھے۔ وہ جہاں کہیں بھی جایا کرتے وہاں کے نئے الفاظ کو سنتے ہی فوراً اس کے معنی تلاش کر کے اپنی بیاض میں لکھ لیتے تھے اور یہی سبب ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں انھوں نے الفاظ کی فہرست مرتب کر دی تھی جسے بعد میں لغت کی شکل دی گئی۔ آغا حیدر جس وقت اپنی لغت تدوین کر رہے تھے تو ان کے پاس کوئی دوسری دکنی لغت

آغا حیدر حسن مرزا کی زبان خود قلعہ معلی کی تھی وہ خود بڑے شستہ و شائستہ الفاظ استعمال کرتے تھے۔ وہ جہاں کہیں بھی جایا کرتے وہاں کے نئے الفاظ کو سنتے ہی فوراً اس کے معنی تلاش کر کے اپنی بیاض میں لکھ لیتے تھے اور یہی سبب ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں انھوں نے الفاظ کی فہرست مرتب کر دی تھی جسے بعد میں لغت کی شکل دی گئی۔

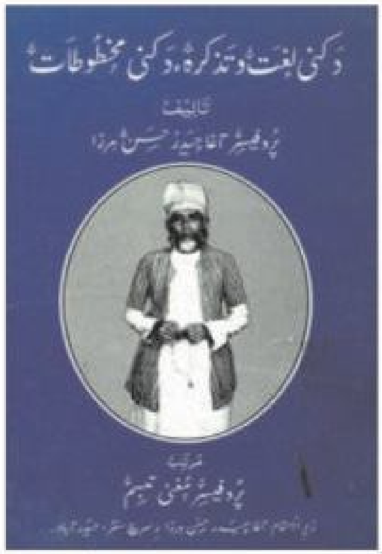

نہیں تھی۔ اس عہد میں صرف سید شعار احمد ہاشمی نے ایک چھوٹی سی جیبی سائز کی دکنی لغت شائع کروائی تھی، جس میں صرف مقامی زبان کے الفاظ جمع کیے گئے تھے اس وقت پروفیسر مسعود حسین خاں، پروفیسر غلام عمر خاں اور ڈاکٹر جمیل جالبی کی مرتب کردہ لغت ابھی منظر عام پر نہیں آئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد میں جب کہ کوئی دوسری لغت موجود نہیں تھی آغا نے یہ کام کیا۔ شعار احمد ہاشمی کی لغت کو آغا نے دیکھا نہ تھا ورنہ اس کے الفاظ اپنی لغت میں ضرور شامل کر لیتے۔ مغنی تبسم نے اپنے دیباچے میں اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

'' آغا حیدر حسن مرزا نے جب دکنی لغت کی تدوین کا کام شروع کیا ان کے سامنے دکنی لغات کا کوئی نمونہ نہیں تھا۔ پروفیسر مسعود حسین خاں اور پروفیسر غلام عمر خاں کی مرتب کردہ دکنی اور ڈاکٹر جمیل جالبی کی قدیم اردو کی لغت شائع نہیں ہوئی تھی۔ ایک مختصر سی دکنی الفاظ کی لغت سید شعار احمد نے جیبی سائز پر شائع کروائی تھی۔ آغا صاحب کی لغت سے مقابلہ کرنے پر اندازہ ہوا کہ وہ لغت آغا صاحب کے پیش نظر نہیں تھی ورنہ وہ اس لغت کے مشمولہ الفاظ اپنی لغت میں شامل کر لیتے۔''

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آغا حیدر حسن مرزا جس وقت اپنی لغت تدوین کر رہے تھے ان کے سامنے کوئی دکنی کی دوسری لغت نہیں تھی۔ اس طرح اندازہ ہوتا ہے کہ اس ابتدائی دور میں جب کہ کوئی معتبر اردو دکنی لغت موجود نہ تھی آغا نے یہ کارنامہ انجام دے کر بہت اہم کام انجام دیا۔ آغا حیدر حسن مرزا نے اپنی اس لغت میں جتنے الفاظ شامل کیے۔ انھیں اپنے پاس موجود مخطوطوں سے ان کا انتخاب کیا اور پھر دکن کی روزمرہ کی بول چال سے تقابل کر کے پیش کیا۔ انھوں نے اس بات کی بھی وضاحت کی کہ یہ لفظ انھوں نے کہاں سے انتخاب کیا اور اس کے معنی و مفہوم بتاتے ہوئے ان مخطوطات کی بھی نشاندہی کی جہاں سے یہ لفظ لیا گیا۔ مثال کے طور پر یہاں چند ایسے الفاظ دیکھیے جہاں آغا نے ان کے معنی درج کرتے ہوئے ان مخطوطات سے اشعار بھی مثال کے طور پر دیے ہیں اور اس مخطوطے کا نام بھی درج کیا ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

'' اڑاڑانا = دھمکانا، ڈانٹنا، ڈپٹنا
دو فرشتے گزرے کر آتشیں
اڑاڑا کر صبح کو پوچھے از کمیں
(قصہ تجاہ)

اسف = تاسف، افسوس، غم
سنے جب کہ بھٹکا وہ جنگل طرف
چلے ڈھونڈنے اس کو با صد اسف
(چندر بدن مہیار)

اکھاڑا = شکست، تزلزل، اکھڑنا سے بنایا گیا ہے
خبر پہنچی سلطاں کوں ان کے وکیل
اکھاڑے پو لشکر کے ہو کے ذلیل
(اضراب سلطانی)

تجارا = تاجر، سوداگر
تجارا گیا ایک دن ہور رات
دیا بیٹی کو اپنی عورت کے ہات
(مینا ستونتی ولورک)

چلک = چال، رفتار
برق سا چلک اس دلیں خوش جھلک
ہوئی دنگ خلق سب فلک پر ملک
(بذن نامہ)

مندرجہ بالا مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ آغا حیدر نے اپنی دکنی لغت کے لیے مختلف دکنی مخطوطات کا مطالعہ کر کے نئے الفاظ کی نشاندہی کی ہے اور پھر ان کے معنی تلاش کر کے اپنی لغت میں جمع کر دیے ہیں۔ یہاں ہم آغا حیدر حسن مرزا کی تحقیقی صلاحیتوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ انھوں نے کتنی محنت سے دکنی مخطوطات کا مطالعہ کیا اور ان الفاظ کا بھی انتخاب کیا جو انھیں نئے لگے۔ اس طرح لغت سازی کے سلسلے میں ان کی یہ کاوش اہمیت رکھتی ہے۔

چونکہ آغا حیدر حسن مرزا زبان کے بادشاہ کہلاتے ہیں سبھی ان کی زبان پر رشک کرتے ہیں۔ اردو کے محاوروں، ضرب الامثال اور کہاوتیں سبھی انھیں از بر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں میں محاوروں کا بڑا عمدہ استعمال کیا ہے۔ اور آغا جب دکن آئے تو انھیں دکنی زبان اور یہاں کے لوگوں کی گفتگو کا انداز بھی بہت پسند آیا اور اس طرح انھیں ان کے محاوروں سے بھی خصوصی دلچسپی شروع ہوئی۔ انھوں نے ان محاوروں کو جمع کرنا شروع کیا۔ اس طرح اپنی اس لغت میں انھوں نے نئے نئے الفاظ کے ساتھ ساتھ محاورے بھی منتخب کیے، اور ان کی مثالیں بھی اپنے عہد کی بولی جانے والی دکنی زبان سے پیش کی ہے، ان کی لغت سے ایک مثال دیکھیے :

غلفی دینا= دھوکا دینا، چکر میں لانا

یہ محاورہ آج کل حیدرآباد میں بولا جاتا ہے

واہ یار خوب غلفی دیتے ہو

یہاں آغا نے محاورے کے معنی دیتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ یہ محاورہ آج بھی حیدرآباد کی عام بول چال کی زبان میں مستعمل ہے۔ ایک اور مثال دیکھیے :

''ناڑی دیکھنا= لفظی معنی نبض دیکھنا اور اصلاحی معنی خبر لینا۔

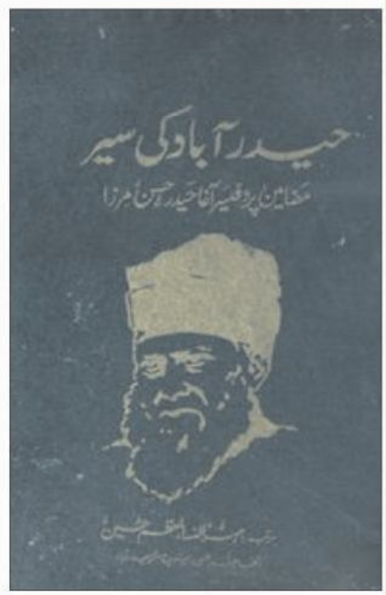

یہ محاورہ آج کل حیدرآباد میں بولا جاتا ہے، مجھے اعلیٰ حضرت حضور نظام خلد اللہ ملک، سے اس محاورے کے سننے کا شرف حاصل ہوا، اعلیٰ حضرت نے رحیم خاں مہراجی کو مخاطب فرما کے فرمایا:

دیکھ رے رحیم خاں کوئی پتلی ٹوٹی تو تیری ناڑی دیکھ لوں گا۔''

غرض اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ آغا حیدر حسن مرزا کس قدر ذہین تھے۔ وہ لوگوں کی باتیں ان کا لہجہ اور ان کی گفتگو کا بڑا غور سے مشاہدہ کرتے اور ان کے الفاظ و محاوروں کو ذہن نشین کر لیتے تھے، ایک اور اقتباس ملاحظہ جہاں آغا حیدر حسن مرزا اس دکنی محاورے کا ذکر کرتے ہیں جو انھوں نے حضور نظام یعنی میر عثمان علی خاں کی زبان سے سنا تھا چنانچہ اس کی وضاحت کے ساتھ اس محاورے کو انھوں نے درج کیا ہے:

''چندیاں ہوجانا = پرخچے اڑ جانا، پرزے پرزے ہوجانا، چکنا چور ہوجانا، ٹوٹ جانا۔

یہ محاورہ آج کل حیدرآباد میں بولا جاتا ہے، میں نے اس محاورے کو اعلیٰ حضرت حضور نظام میر عثمان علی خاں کی زبان مبارک سے سنا تھا جیسے:

''آئینہ چھوٹ گیا تو چندیاں ہوجائیں گا۔''

آغا حیدر حسن مرزا کا یہ شوق یا عادت تھی کہ جہاں کہیں محاوروں کو سنتے انھیں یاد کر لیتے تھے۔

ایک اور مثال ملاحظہ ہو جہاں آغا حیدر حسن مرزا نے ان الفاظ کے معنی بتاتے ہوئے یہ بھی وضاحت کی کہ حیدرآباد اور دہلی دونوں مقامات پر اس کا استعمال کس طرح سے ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''بیزار آجانا یا ہو جانا = تنگ آجانا، پریشان ہوجانا۔

یہ محاورہ حیدرآباد میں آج کل بولا جاتا ہے، جیسے:

''میں تار کرتے کرتے بیزار آگیا''

دلی میں بیزار ہوجانا یا بیزار ہونا۔ متفرق ہوجانا کے معنوں میں بولا جاتا ہے۔ ان کا جائے استعمال حیدرآبادی اردو سے قدرے جدا ہے، جیسے'' اچھی بیٹی آخر میری صورت سے کیوں بیزار ہے'' تمھاری اس دن کی حرکت سے تمھارے نام سے بیزار ہوگئی ہوں۔''

اس اقتباس سے واضح ہوجاتا ہے کہ آغا حیدر حسن مرزا کو نہ صرف دہلی کی زبان و محاوروں پر دسترس حاصل تھی بلکہ وہ دکن کے محاوروں پر بھی خاصی گرفت رکھتے تھے۔ مغنی تبسم نے اپنے دیباچے میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ آغا حیدر حسن مرزا کو جب لفظ کا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا تو وہ اپنے ملاقاتی، حیدرآباد کے شرفاء اور امرا سے اس کی تصدیق کر لیتے تھے۔

آغا حیدر حسن مرزا اپنی اس دکنی لغت میں الفاظ کے معنی کو دیتے ہوئے ان لفظوں سے جڑی روایت کو بھی سمجھاتے ہیں اور بے تکلف انداز میں ان لفظوں کی تشریح

آغا حیدر حسن مرزا زبان کے بادشاہ کہلاتے ہیں سبھی ان کی زبان پر رشک کرتے ہیں۔ اردو کے محاوروں، ضرب الامثال اور کھاوتیں سبھی انہیں از بر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی تحریروں میں محاوروں کا بڑا عمدہ استعمال کیا ہے۔ اور آغا جب دکن آئے تو انہیں دکنی زبان اور یہاں کے لوگوں کی گفتگو کا انداز بھی بہت پسند آیا اور اس طرح انہیں ان کے محاوروں سے بھی خصوصی دلچسپی شروع ہوئی۔ انہوں نے ان محاوروں کو جمع کرنا شروع کیا۔ اس طرح اپنی اس لغت میں انہوں نے نئے نئے الفاظ کے ساتھ ساتھ محاورے بھی منتخب کیے۔

بھی کرتے ہیں۔

آغا حیدر حسن مرزا نے اس فقرہ کے مفہوم کی تشریح بھی بڑی وضاحت کے ساتھ دکنی تہذیب کے پس منظر میں کی ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:

پانی نھانا= غسل کرنا، پانی سے نہانا، حمام کرنا، نہانا

مت کر اسراف پانی نھان اے جان

کہ خدا نے کیا ہے یہ فرمان

یہ آج کل حیدرآباد میں بولا جاتا ہے، جیسے: ''انو پانی نہاتے ہیں'' غیر ملکیوں کو یہ ترکیب عجیب معلوم ہوتی ہے لیکن اگر دکنیوں کی تاریخ کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوجائے گا کہ یہ لوگ پھل نیر گلاب اور کیوڑے بید مشک سے بھی نہاتے تھے۔ ان کے حوض خانے عطریات سے لبریز رہتے تھے۔ تو یہ عطر و گلاب سے نہانے والی قوم جب ان خوشبوئیات سے نہانے کے علاوہ پانی سے نہائی ہوگی، تو اس غسل کی بھی تخصیص کر دیتی ہوگی۔ اب وہ عطر گلاب، کیوڑہ تو اڑ گئے، نرا پانی رہ گیا۔ اللہ اس کو ہی رکھے۔ تانا شاہ کے عظیم الشان گلاب کیوڑے کے حوض تا ایں دم باقی ہیں جن میں کیوڑے کی بجائے اب کیچڑ نظر آتی ہے۔''

غرض آغا حیدر حسن مرزا نے بڑے ہی عمدہ طریقے سے اس لفظ کی مثال دکنی کے ایک شعر کے حوالے سے بھی پیش کی ہے اور پھر شمالی ہند اور دوسرے علاقے کے لوگوں کی نکتہ چینیوں کے جواب میں غالباً اس کی توضیح بھی کی ہے۔ آغا حیدر حسن مرزا نے اپنی دکنی اردو لغت میں نہ صرف دکن کی زبان کے الفاظ کے معنی و مفہوم درج کیے بلکہ انھوں نے دکن کی تہذیب و تمدن، رسم و رواج اور

عقیدوں کی بھی مختصر طور پر الفاظ کے مفہوم سمجھاتے ہوئے حاشیے میں اس کی وضاحت بھی کی ہے۔ مثلاً ایک مثال ملاحظہ ہو:

''گھوڑے پکانا = رجب کے مہینے میں مراد مند پکاتیں، روغنی آٹے کی ٹکیاں تل کر شیرے میں چھوڑتے ہیں۔ گھوڑا اس تیار شدہ شیرانی کا نام ہے، یہ رسم دکن میں عام ہے۔ معلوم نہیں کیوں گھوڑے کہتے ہیں۔ حالانکہ شکل بالکل گھوڑے کی نہیں ہوتی بلکہ گنواری بالوشاہی کی سی گول تکیا گھی میں تلی شیرے میں ڈوبی ہوتی ہے۔

کیوں پکاتی ہے بنا گھوڑے ٹٹو
ہونکوتو حق کنے شر کھٹو

(تنبیہ النساء)

اس اقتباس کے ذریعے نہ صرف معنی و مفہوم سے آگہی ہوتی ہے یہاں کے رسم و رواج اور عقیدوں کا بھی پتہ چلتا ہے کہ کس طرح لوگ اپنی مراد پوری ہونے پر گھوڑے پکا کر فاتحہ دلواتے ہیں۔

آغا حیدر حسن مرزا نے اس دکنی لغت میں الفاظ کے معنی درج کرتے ہوئے اس بات کی بھی وضاحت کردی ہے دوسرے علاقوں خصوصاً دہلی میں کس طرح استعمال ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے لسانی اعتبار سے اس لغت کی اہمیت ہے۔ کیوں کہ ہمیں الفاظ کے مفہوم کے ساتھ ساتھ یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ دوسرے علاقے میں اس لفظ کے معنی کس طرح استعمال ہوتے ہیں۔

آغا حیدر حسن مرزا اپنی لغت میں دکن کی زبان و الفاظ کا دوسرے علاقے کی زبانوں کے الفاظ سے معنی دیتے ہوئے وضاحت کرتے ہیں۔ حیدرآباد کی تہذیب میں شادی بیاہ کی رسموں کے ناموں کو دہلی میں کس طرح بولتے ہیں اس کی وضاحت کرتے ہوئے لفظ جمعگی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جمعگی = چالا

دلہن جو چوتھی کے بعد اپنے عزیز قریب کے رشتے داروں میں چاروں جمعوں کو جاتی ہے۔ وہاں اس کی اور اس کے سسرال والوں کی دعوت ہوتی ہے۔ اسے دکن میں جمعگی اور دلی میں چالا کہتے ہیں۔ دلی میں جمعگی جمعہ کو جیب خرچ ملتا ہے اسے کہتے ہیں''۔

یہاں ہم پروفیسر یوسف زئی کی بات سے اتفاق کرسکتے ہیں:

''جب انھوں نے لفظ اور اس کے معنی درج کیے تو ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ یہ لفظ دلی میں کس طرح بولا جاتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بنیادی طور پر یہ لفظ دلی میں عموماً بولا جاتا رہا تھا لیکن جب دکن میں آیا تو اس میں قدرے تبدیلی واقع ہوگئی۔ یہ حقیقت ہے کہ حیدرآباد میں بولی جانے والی زبان پر دلی کا خاص گہرا اثر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دلی اور حیدرآباد کے مابین گہرا رشتہ رہا ہے۔ خلجی دور سے لے کر آصفیہ دور تک حیدرآباد اور اس کے اطراف و اکناف کے علاقوں میں دلی کے فوجی دستے تاجر صوفی، صناع جوق در جوق آتے رہے اور بیشتر نے دکن کی زر زمین کو اپنا وطن ثانی بنالیا۔ پھر وہ یہاں کی تہذیب و ثقافت میں ایسے گھل مل گئے کہ یہیں کی بول چال اور روز مرہ ان کی زندگی کا جزو بن گئے اور ان کی بول چال کے الفاظ قدرے تبدیلی کے ساتھ یہاں استعمال ہونے والے ذخیرہ الفاظ کا حصہ بن گئے''۔

آغا حیدر حسن مرزا کی دکنی لغت کے اس جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ لسانی اعتبار سے اس کی کیا اہمیت ہے۔ انھوں نے یہاں کے مخصوص الفاظ کے مطالعے کے علاوہ مخطوطات سے بھی بعض اہم الفاظ کا انتخاب کیا جو آغا کے عہد میں بھی رائج تھے۔ انھوں نے حیدرآبادی تہذیب و تمدن، رسم و رواج، عقیدوں کو بھی ان الفاظ کے استعمال اور ان کی ادائیگی کی وضاحت کرتے ہوئے تشریح و توضیح کی ہے اگر چہ کہ یہ لغت نا مکمل ہے ،لیکن انھوں نے جتنا بھی لکھا اس میں حیدرآباد کی مخصوص تہذیبی تاریخ درج کردی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ان کا اہم کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔

رحمت یوسف زئی کے اس اقتباس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ نقل مکانی سے زبان ایک علاقے سے دوسرے علاقے کی زبان میں گھل مل کر نئے لفظ میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔

آغا حیدر حسن مرزا کی دکنی لغت کے اس جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ لسانی اعتبار سے اس کی کیا اہمیت ہے۔ انھوں نے یہاں کے مخصوص الفاظ کے مطالعے کے علاوہ مخطوطات سے بھی بعض اہم الفاظ کا انتخاب کیا جو آغا کے عہد میں بھی رائج تھے۔ انھوں نے حیدرآبادی تہذیب وتمدن، رسم و رواج، عقیدوں کو بھی ان الفاظ کے استعمال اور ان کی ادائیگی کی وضاحت کرتے ہوئے تشریح و توضیح کی ہے اگر چہ کہ یہ لغت نا مکمل ہے، لیکن انھوں نے جتنا بھی لکھا اس میں حیدرآباد کی مخصوص تہذیبی تاریخ درج کردی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ان کا اہم کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ آغا نے خواتین کے محاورے ہوں یا مختلف طبقے کے لوگوں کی زبان کی مخصوص اصطلاحیں ان کو بڑی ریاضت و مشقت سے تحقیق کر کے اس کے مفہوم تک مکمل رسائی حاصل کی پھر اس کی وضاحت وصراحت مختلف واقعات کے حوالے سے کردی ہے۔

مغنی تبسم نے اس لغت کو مکمل کرتے وقت پروفیسر مسعود حسین خاں، پروفیسر غلام عمر اور جمیل جالبی، سید شعار احمد ہاشمی اور فیروز الدین کی فیروز اللغات کا تقابلی مطالعہ کر کے مرتب کردی ہے۔ اس لغت کی اہمیت بتاتے ہوئے پروفیسر مغنی تبسم رقم طراز ہیں:

''آغا حیدر حسن مرزا کی مرتبہ دکنی لغت اگر چہ مختصر اور نا مکمل ہے پھر بھی دکنی کے محققین اس سے مستفید ہو سکتے ہیں اور دکنی لغت پر آئندہ کام کرنے والوں کے لیے ایک اچھا نمونہ فراہم کرتی ہے۔''

مغنی تبسم کی وضاحت اور آغا حیدر حسن مرزا کی لغت کے اس مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے۔ اگر چہ کہ آغا نے اس کو ترتیب دینے کے ارادے سے کام شروع کیا تھا لیکن ان کی زندگی نے اور وفا نہ کی اور وہ اپنے کام کو ادھورا رکھ کر دنیا سے چل بسے اگر وہ اور زندہ رہتے تو یقیناً اپنا کام مکمل کرتے اور اس سے زیادہ اور بڑی فہرست مرتب کر کے جامع اور مکمل لغت ترتیب دیتے۔ بہر حال انھوں نے جو کام کیا وہ بھی دکنی ادب کے سلسلے میں خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ دکنی ادب کی تحقیق کے ابتدائی دور میں انھوں نے دکنی کے نئے نئے الفاظ کا انتخاب کر کے مخطوطات سے مثالیں دے کر ان کے معنی و مفہوم کی تفصیلی وضاحتیں پیش کی۔

غرض حیدرآبادی تہذیب، یہاں کے رسم و رواج اور عقیدوں میں استعمال ہونے والے الفاظ کی بھی مختلف واقعات کے ذریعے تشریح و توضیح کی ہے۔ ان کی دکنی لغت اپنی خصوصیات کی بدولت دیگر دکنی لغت کے مقابلے میں اہمیت کی حامل ہے، اور دکنی ادب کی تحقیق کے سلسلے میں آغا کی لغت کو فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ بلاشبہ آغا حیدر حسن مرزا دکنی لغت نویسی کی تاریخ میں بھی ایک اہم نام ہے۔

■

Dr.Fareeda Tabassum
H.No.8-1-402/195,flat No.503.
gulshan colony hyderabad-500008
mujtaba463@gmail.com

مراٹھی اردو ترجموں میں قومی یکجہتی

معین الدین عثمانی

تخلیق اور ترجمہ دو الگ الگ اصناف ہیں، فنی اعتبار سے تخلیق کو ترجمے پر اولیت حاصل ہے مگر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو ترجمے کا فن بھی بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ حالانکہ اِسے ہمیشہ دوسرے درجے کی چیز سمجھ کر نظرانداز کیا گیا ہے مگر ادبی تاریخ گواہ ہے بڑے سے بڑے فنکاروں نے بھی ایک وقفے کے لیے کیوں نہ سہی اِس جانب توجہ ضرور دی ہے۔ ترجمہ نگاری کا فن دو زبانوں، تہذیبوں، اور فکر و سوچ کے سمندروں کو باہم پیوست کرنے کا مشکل ترین کام ہے۔ بظاہر سہل اور آسان محسوس ہونے والا یہ فن تخلیق سے کسی درجہ کم محنت کا متقاضی نہیں ہوتا۔ فکر و خیال کے علاوہ اِس میں بھی انھیں لوازمات سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے جو تخلیق کے مرحلے میں درپیش ہوتے ہیں بلکہ بعض مراحل میں تو یہ فن تخلیق سے بھی زیادہ دشوار کن مرحلوں سے گزرتا ہے مگر اردو کا یہ المیہ ہے کہ ترجمے کے ساتھ ہمیشہ سے سوتیلا سلوک ہوا ہے۔ بقول سلام بن رزاق:

''ترجمے کو ہمیشہ دوسرے درجے کا ادب سمجھا گیا ہے جبکہ یہ بات خاطر نشان رہنی چاہیے کہ ایک عمدہ ترجمہ ایک ناکام تخلیق سے بدرجہ بہتر ہوتا ہے۔''

ترجمہ نگاری کا عمل عرصے سے جاری ہے۔ ہر زمانے میں ایک زبان کے ادب کو دوسری زبان کے ادب نے ترجمہ نگاری کے ذریعے مالا مال کیا ہے۔ زندہ زبان کی علامت یہ ہے کہ وہ دیگر زبانوں کی روایات کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہو۔ زبان کی وسعت میں ترجمہ نگاری کا رول بھی اہمیت کا حامل ہے۔ اگر ایسا کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ جہاں تک مراٹھی زبان کا تعلق ہے بظاہر کھردری اور اکھری محسوس ہونے والی یہ زبان انگریزی زبان کی طرح وسیع اور پھیلی ہوئی زبان ہے۔ اگرچہ کہ اِس کے بولنے والوں کا حلقۂ ریاست مہاراشٹر تک ہی محدود لگتا ہے مگر اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ بھارت کی دیگر چند ریاستوں نیز دنیا کے کچھ ممالک میں اس کے چاہنے والوں کا حلقہ دن بہ دن بڑھتا جا رہا ہے۔ مہاراشٹر میں اِسے سرکاری حیثیت حاصل ہونے سے یہاں یہ پوری طرح سے اپنے برگ و بار نکال کر پروان چڑھ رہی ہے۔ اس کے بعد زیادہ بولی جانے والی زبان ریاست میں اردو ہی ہے۔ چونکہ ایک ہی ریاست میں مختلف زبانیں بولنے والے افراد باہم مخلوط ہو کر ہی زندگی گزارتے ہیں اِس بنا پر ایک دوسرے کی زبان سے متاثر ہونا لازمی ہو جاتا ہے۔ اردو مراٹھی کے ذخیرہ الفاظ کا جب ہم باریک بینی سے مطالعہ کرتے ہیں تو بے شمار ایسے الفاظ مل جاتے ہیں جو دونوں زبانوں میں یکساں طور پر استعمال ہوتے ہیں البتہ ادائیگی میں تھوڑا بہت فرق آ جاتا ہے۔

کون سا لفظ کِس زبان میں پہلے رائج ہوا یہ سمجھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ سرکاری سطح پر مراٹھی کو پشت پناہی حاصل ہونے کی بنا پر ہر ایک کو اِس کی تعلیم ضروری قرار دی گئی ہے۔ اب ریاست میں جگہ جگہ آپ کو چند اردو دداں ایسے ضرور مل جائیں گے جو مراٹھی اس روانی سے پڑھتے لکھتے ہیں کہ ان پر اہلِ زبان ہونے کا گمان گزرتا ہے۔ اردو داں حضرات کی مراٹھی کی جانب یہ توجہ خوش آئند اس لیے بھی ہے کہ ضرورتوں کی تکمیل میں یہ زبان اب ناگزیر ہو گئی ہے۔ دوسرے مراٹھی داں طبقے سے قربت کا ذریعہ بن کر لسانی اتحاد کے لیے بھی موثر کام انجام دے رہی ہے۔ جب دو تہذیبوں کے پروردہ افراد لسانی بنیاد پر قریب آتے ہیں تو ظاہر ہے کہ فرد ایک دوسرے کے ہی نہیں بلکہ دو طبقات کے خیالات وطرزِ فکر کو سمجھنے میں مدد فراہم کرتے ہیں۔

ہمارا ملک بھارت مختلف تہذیبوں، روایتوں اور زبانوں کا گہوارہ ہے۔ لسانی اعتبار سے یہ ملک دوسرے ممالک سے مختلف ہے۔ یہاں ہر ریاست کے باشندوں کی زبان، پوشاک یہاں تک کہ کھانے پینے کے لوازمات میں بھی نمایاں فرق ہے۔ ایسی صورت میں دو زبانوں کے بولنے والے مختلف افراد ساتھ مل کر خیالات کا لین دین کرتے ہیں تو اِس ملک کی یکجہتی کو استحکام ہی ملتا ہے۔

بقول جناب سید امجد حسین — قومی یکجہتی ہمارے ماضی کی وراثت ہے اور ہمارے مستقبل کی امانت ہے۔ ہماری تاریخ گواہ ہے کہ ہمارے دکھ سکھ، خوشیاں اور غم مسرتیں اور مصیبتیں مشترک رہے ہیں اور کوئی بھی طاقت ہمیں مذہبی لسانی یا نسلی بنیاد پر تقسیم نہیں کر سکتی ہے۔ اس لیے کہ ہماری تہذیبی روایت ایک ہی رہی ہے۔ ہمارے میلے، تہوار، رسم و رواج، رقص، موسیقی اور سب سے بڑھ کر زندگی کے بارے میں ہمارا زاویہ نظر مشترک رہا ہے۔ ہماری ہندوستانی قومیت کی اساس یہی اشتراک ہے اور ہندوستانیت کا یہی احساس اقوام عالم میں ہماری شناخت اور پہچان ہے۔ اقبال نے بہت پہلے کہا تھا:

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دور زماں ہمارا

ہماری ہستی یا ہمارا قومی تشخص آج اسی قومی یک جہتی کی دین ہے۔ ہماری زبانیں، ہماری بولیاں، ہماری عبادتیں غرض کہ زندگی کے بہت سے گوشے ایک دوسرے سے الگ ہو سکتے ہیں لیکن یہ اختلاف نہیں ہماری تہذیبی رنگا رنگی ہے۔ قومی یکجہتی کا سچا تصور اسی کثرت میں وحدت سے عبارت ہے۔

علی جواد زیدی کے مطابق ثقافوں کا امتیاز نشان زبان ہے اور بعض مفکرین نے اسے ملتوں کی بنیاد قرار دیا ہے۔ لیکن جاندار ترجموں نے اس کا کردار بین الملکی بنا دیا ہے۔ کسی دور میں زبانوں نے ملتوں اور قوموں کی دیواریں کھڑی کی تھیں۔ ترجمے ان دیواروں کو گرا کر دلوں کی زبان بولنے لگتے ہیں۔ اور ہم ایک دوسرے کی نبضوں کی دھمک خیالات کی فلک سیروں اور محسوسات کی بنیادی ہم آہنگی

سے آشنا ہوتے ہیں یہ ہمارے مترجمین کا کارنامہ ہے۔

اردو مراٹھی ترجموں کی روایت کافی پرانی ہے۔ اس کی ابتداء کب اور کہاں ہوئی اس بارے میں یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ البتہ ڈاکٹر یونس اگاسکر کے مطابق 1750 میں غالباً پہلی بار ترتاملی مدراس کے ایک صوفی شاعر شاہ تراب چشتی نے مراٹھی کے سنت شاعر سحر رام داس کی طویل منظوم تخلیق 'مناچے اشلوک' کا 'من سمجھاون' کے نام سے آزاد ترجمہ کیا اور بیجاپور کے وجودی تصوف کو اس میں پرو دیا۔ لیکن یہ روایت اس وقت پروان نہ چڑھ سکی۔ پھر 1893 میں انیسویں صدی کے مشہور مصلح اور پہلی مہاراشٹری خاتون ڈاکٹر آنندی بائی جوشی کی خودنوشت سوانح عمری کا اردو ترجمہ شائع ہوا جو مشہور شاعر احمد علی شوق کے قلم سے نکلا تھا۔ لیکن یہ سلسلہ بھی آگے نہ بڑھ سکا۔

جب ہم موجودہ صدی کے کام پر نظر ڈالتے ہیں تو قدرے اطمینان کا احساس ہوتا ہے۔ ترجمے کا معاملہ دو طرفہ لین دین کا معاملہ ہوتا ہے۔ مراٹھی سے اردو میں تراجم کی بے شمار مثالیں ہمیں مل جاتی ہیں البتہ اردو سے مراٹھی میں تراجم کی مثالیں موجودہ دور میں خال خال ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر رفیق زکریا کا اقتباس قابلِ غور ہے۔

اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ ہم اردو والے اپنی زبان کو مراٹھی کے ساتھ ہم آہنگ کرنے میں کوشاں رہیں۔ اس سلسلے میں جو بھی کام ہوا ہے وہ اتنا کم ہے کہ ہنوز اس سے کہیں زیادہ قابلِ اعتنا کاموں کی گنجائش باقی ہے۔ اردو والوں نے مراٹھی ادب کی اچھی واقفیت حاصل کرکے اُسے اردو میں پیش کرنے کے سلسلے میں چند بکھری ہوئی کوششوں سے قطع نظر کوئی بڑی پیش قدمی یا ٹھوس اقدام نہیں کیا۔ اس کے برعکس مراٹھی کے چند اردو داں عالم اور ادیب اپنے فرض سے غافل نہیں رہے اور وہ بڑی باقاعدگی سے اردو شہ پاروں کو مراٹھی ادب کی زینت بناتے رہے ہیں۔ ہمارے سامنے شری سیتو مادھو راؤ پگڑی، پروفیسر رادھی جوشی، ودیا دھر گوکھلے، گروناتھ دیوے کر، شری پاد جوشی اور دیوی سنگھ چوہان جیسے مصنفین و مترجمین کے نام نمایاں ہیں۔

متذکرہ بالا ناموں کے علاوہ ایک نام گذشتہ دو دہائیوں میں اردو سے مراٹھی تراجم کے ضمن میں ان کے کام کے لحاظ سے کافی اہمیت اختیار کرگیا ہے اور وہ نام ہے شری رام پنڈت کا۔ افسوس ہے کہ اس کے علاوہ کوئی قابلِ ذکر نام بعد کے زمانے میں اُبھر کر سامنے نہیں آسکا ہے۔ رام پنڈت کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے ہندوستان کے ہی نہیں پاکستان کے بھی فنکاروں کی تخلیقات کو مراٹھی کے قالب میں ڈھالا ہے اور معاملہ صرف نثر کی حد تک محدود نہیں ہے منظوم تخلیقات بھی بڑی عمدگی کے ساتھ پیش کرکے ایک کارنامہ انجام دیا ہے۔

اردو اکادمی مہاراشٹر کا خصوصی شمارہ امکان کا حوالہ بھی اس ضمن میں دیا جاسکتا ہے مگر چونکہ وہ مشترکہ افراد کی کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ اس لیے اکادمی کو ہی اس کا کریڈٹ جاتا ہے۔ اردو سے مراٹھی اور مراٹھی سے اردو میں ڈھالنے کا یہ عمل اکادمی کے ارباب کے ذریعے آج بھی جاری ہے جسے ستائش کی نظر سے دیکھا جارہا ہے۔

ایک عرصہ قبل دیوالی نمبر کے طور پر سلام بن رزاق اور احباب کی کاوشوں سے آکھنٹ کے عنوان سے ایک خصوصی شمارہ ترتیب دیا گیا تھا جو اردو کی نمایاں کہانیوں کا اچھا خاصا ذخیرہ تھا مگر افسوس کہ یہ سلسلہ بھی ایک سال سے زیادہ نہ چل سکا۔

جناب اکبر رحمانی نے معاصر روزنامہ لوک مت کے توسط سے اردو زبان وادب نیز مسلمانوں کے عمومی مسائل کے سلسلے میں اپنے کالم 'اکبرنامہ' کے ذریعے بھی فضا کو ہموار کرنے کی کوشش کی تھی۔ بعدازاں راقم الحروف نے مشرقی اور مغربی خاندیش کے فنکاروں کو مراٹھی حلقے میں متعارف کرانے کی غرض سے اسی روزنامے میں 'تعارف نامہ' کے نام سے ایک عرصے تک متعدد فنکاروں کو متعارف کرواکے اردو سے قریب لانے کی کوشش کی۔ افسوس کہ یہ سلسلہ بھی ڈیڑھ سال سے زیادہ نہ چل سکا۔ اس کے علاوہ قاضی سلیم کی شاعری کا مراٹھی ترجمہ بھی شائع ہوا۔

شری پاد جوشی کی اردو مراٹھی شبدکوش کے علاوہ پونہ کے شیخ عبداللہ نے مراٹھی داں افراد کے لیے 'اردو شکویا' نامی کتاب، تو ڈاکٹر عصمت جاوید نے اردو داں حضرات کے لیے مراٹھی آموز کے عنوان سے جو کتابیں ترتیب دی ہیں ان کی اہمیت مسلم ہے۔

1976 میں ڈاکٹر یونس اگاسکر کی تصنیف 'مراٹھی ادب کا مطالعہ' منظرِ عام پر آئی۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اُس کے مندرجات سے لگایا جاسکتا ہے۔ مہاراشٹری تہذیب کی مراٹھی شاعری بشمول سنت کاویہ، پنڈت کاویہ، شاہیری کاویہ، سنت گیانیشور اور گیانیشوری، سنت تکارام اور ابھنگ وانی کے علاوہ قدیم مراٹھی نثر کی آبرو بکھر۔ جدید مراٹھی نثر کا مقدمہ الجیش، مراٹھی فکشن کا آغاز، مراٹھی کے ابتدائی ناولوں پر ایک نظر، مراٹھی اسٹیج اور ڈرامہ۔ مراٹھی لوک ناٹیہ وشاہ او تارو وغیرہ۔ درج بالا عنوانات مراٹھی سے واقفیت کے لیے بھی کافی ہیں۔ مسرت اس بات پر بھی ہے کہ ڈاکٹر را۔ بھی۔ جوشی جیسے مراٹھی کے ادیب نے اس کا مقدمہ قلم بند کیا ہے اور شنکر راؤ چوہان جیسے اردو داں سیاسی مفکر نے اس کی حمایت میں لکھا ہے۔ سردار جعفری نے ان کے کام کو سراہتے ہوئے اسے وقت کا دلکش نقطہ عروج قرار دیا ہے اور مراٹھی ادب کا کئی صدیوں پر حاوی مطالعہ بتلایا ہے۔

اس کے علاوہ علاقہ کوکن ہی سے مرحوم شاعر جناب بدیع الزماں خاور کی تصنیف 'مہاراشٹر کی تہذیبی اور ادبی قدریں' بھی خاصی اہم کتاب ہے۔ اس کے بیشتر مضامین کے مطالعے سے ہندو مسلم اتحاد کی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ مثلاً شیخ محمد ایک عظیم مراٹھی شاعر، مراٹھی کے مسلم ادیب، ایسی تخلیقات ہیں جو اردو مراٹھی ادب کو قریب لانے کا موثر ذریعہ بن سکتی ہیں۔ اہلِ اردو کو مراٹھی ادب پاروں، مراٹھی تاریخ وتہذیب سے روشناس کرانے کی خاور صاحب کی یہ کامیاب ترین کوشش ہے۔ اردو پڑھنے والوں میں ان کی تحریروں سے ایک ایسا حلقہ قائم ہوسکتا ہے جو محض ادبی چٹخاروں کے لیے وقف ہوکر نہ رہتے ہوئے عہدِ حاضر کی آگہی بخشنے والے نظامِ ادب سے عشق کرنے لگے گا۔ خاور مضمون کی معنویت میں اتنا سرشار ہوجاتے ہیں کہ ایک نیا اسلوبِ تحریر ابھرنے لگتا ہے۔ سلاست و ربط نے ان کی تحریر کو حسنِ نگاہ سے ہم کنار کردیا ہے۔ بلاشبہ یہ تصنیف اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

> **مراٹھی کے چند اردو داں عالم اور ادیب اپنے فرض سے غافل نہیں رہے اور وہ بڑی باقاعدگی سے اردو شہ پاروں کو مراٹھی ادب کی زینت بناتے رہے ہیں. ہمارے سامنے شری سیتو مادھو راؤ پگڑی، پروفیسر رادھی جوشی، ودیا دھر گوکھلے، گروناتھ دیوے کر، شری پاد جوشی اور دیوی سنگھ چوہان جیسے مصنّفین و مترجمین کے نام نمایاں ہیں.**

اس کے بعد جو تصنیف تاثر اور معلومات کے اعتبار سے سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ ڈاکٹر یحییٰ نشیط کی کتاب 'اردو مراٹھی کے تہذیبی رشتے' جو حال ہی میں منظرِ عام پر آئی ہے جس کا انتساب ان نفوسِ قدسیہ کے نام ہے جنھوں نے اپنی روحانی تعلیمات کے ذریعے اتحاد واتفاق اور امن وآشتی کو فروغ دیا۔ ساتھ ہی کتاب

کے دیباچے میں وہ یوں رقم طراز ہیں ''مہاراشٹر میں حسنِ خلق اور بھائی چارگی کے شجر سایہ دار کی گہری جڑیں ہیں جن سے قومی یک جہتی اور باہمی رواداری کو فروغ حاصل ہورہا ہے اور اس کے ثمرات سے اہل مہاراشٹر متمتع ہورہے ہیں۔

اتحاد و اتفاق و آپسی میل جول اور اشتراک وارتباط کی بدولت یہاں کا ہندو کلچر، مسلم کلچر ایک دوسرے سے متاثر ہوتا رہا ہے اور ایک دوسرے کو متاثر کرتا رہا ہے۔ اِس پر مستزاد یہاں کی روحانی تعلیم ہے جس کے سوتے صوفی سنتوں کے اندرون سے پھوٹے۔ انھوں نے ظاہری رنگ ڈھنگ کو اجالنے کی بجائے باطن کو مجلی کیا اور نفس کا تزکیہ کرتے رہے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ظاہری اعتبار سے تو ہر آدمی کا مذہب الگ الگ ہوسکتا ہے۔

باطن میں البتہ اُس کی ایک ہی روح ہے۔ لہٰذا روح کے تصفیہ پر انھوں نے بڑا زور دیا۔ مٹھ اور خانقاہی تہذیب کا یہ اثر ہوا کہ مسلمانوں کے گرو ہندو اور ہندوؤں کے مرشد مسلمان آپس میں ایسے خلط ملط دکھائی دینے لگے گویا یک جان دو قالب ہوں۔

مراٹھی ادب میں پواڑے اور اردو میں مرثیہ کا رواج تھا۔ مراٹھی میں مرثیہ کے انداز میں روایتی لکھی گئی۔ روایتی کے چلن کو عام کرنے والوں میں عبداللہ ابالعل، کریم قاسم، جوہر شاہ بابا صاحب، فتح شاہ، غریب عبدل اور راجے بابو معروف ہیں۔ اسی طرح مسلمان شعرا میں شاہ علی قادر، مدح شاہ، لاڈن شاہ، لہری حیدر اور امر شیخ مشہور ہوئے۔ آگے چل کر غزل اور رباعی میں سریش بھٹ اور راجہ مہاجن نے اپنے فن کا لوہا منوایا۔ یہاں تک کہ نعت گوئی میں سریش بھٹ نے اپنی شاہکار تحریر کے ذریعے محمدؐ سے محبت کا ثبوت بھی فراہم کردیا ہے۔

ملاحظہ ہو:

اُجاڑ ویران، واڑونٹی کھڑاڑ نارا جھرا محمدؐ
جگات لیا دین ڈُکھینیا نچا اکھیرچا آسرا محمدؐ
بھلے برے پاہیلے کتی می کتی کھرے ان کتیک کھوئے
بھلیات ماجھا بھلا محمدؐ کھریات ماجھا کھرا محمدؐ

رام پنڈت نے ترجمہ کے عنوان سے اردو کی منتخب کہانیاں پیش کی ہیں۔ حصہ اول میں ہندوستانی فنکاروں کو پیش کیا ہے جبکہ حصہ دوم میں پاکستانی فنکاروں کے شاہ کار پیش کرکے یک جہتی کی ایک نادر مثال قائم کی ہے۔ بانو قدسیہ کا 'دریا'، اشفاق احمد کا 'دھنگر' (گڈریا)، انور سجاد کا 'سینڈریلا'، اِس کے علاوہ مظہرالاسلام 'اے حمید'، غلام عباس کا 'آنندی' سعادت حسن منٹو کا کھول دو'، ممتاز مفتی کا ''آپا'، انتظار حسین کا 'زناری' وغیرہ شامل ہیں۔ سعادت حسن منٹو کا 'کھول دو' فسادات کے موضوع پر لکھا ہوا شاہ کار افسانہ ہے جو انسانیت کی انتہا پر جاکر قاری کے دل میں گھر کرلیتا ہے۔ 'آنندی' بظاہر طوائفوں کے حالاتِ زندگی کا نمونہ پیش کرتا ہے مگر انسانی نقطۂ نظر سے ہمارے معاشرے کی کڑوی سچائی پیش کرکے ہر ایک کے دلوں کے تاروں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ طوائف بظاہر ایک جسم فروش طبقے کی عکاسی کرتی ہے مگر یہاں مذہب نام کی تفریق ختم ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ رام پنڈت نئی نسل کے فنکار ہیں انھوں نے مراٹھی تراجم کے ذریعے اردو مراٹھی قارئین کو قریب لانے کی جو سعی فرمائی ہے اُس کی نظیر بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔

ناگپور کے ڈاکٹر محمد اسداللہ نے تراجم کے میدان میں طنز و مزاح کے موضوع کا انتخاب کیا ہے۔ ان کی پہلی

> **رام پنڈت نئی نسل کے فنکار هیں انهوں نے مراٹهی تراجم کے ذریعے اردو مراٹهی قارئین کو قریب لانے کی جو سعی فرمائی هے اُس کی نظیر بهت کم دیکهنے کو ملتی هے۔**

پیش کش 'جمال ہم نشیں' میں مزاحیہ مضامین کے نیز ڈراموں کی شمولیت نے ایک نئے در کو وا کیا ہے۔ بعد ازاں مراٹھی کے معروف فنکار شری رمیش منتری کے طنزیہ مضامین کو 'دانت ہمارے ہونٹ تمھارے' کے عنوان سے یکجا کرکے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا انوکھا اور پہلا کارنامہ ہے۔ طنز کے نشتر معاشرے کے حالات زار پر ہلکے پھلکے انداز میں وار کرتے ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ معاشرے کی صورت حال دونوں طرف یکساں ہے۔ گاندھی جی بیسویں صدی میں اور سہیادری کی چوری، ایسے عنوانات ہیں جو بلا تفریق مذہب دونوں زبانوں کے معاشرے کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ موصوف نے انتساب بھی ان بے خبر لوگوں کے نام کیا ہے جو زبان و ادب پر ہنسنے کا جواز ڈھونڈتے ہیں۔

راقم الحروف کا مجموعہ 'صورتِ حال' مراٹھی کہانیوں کا اردو انتخاب ہے۔ اِس میں مراٹھی کے معروف نام جیسے وجیا راجادھکش، لکشمن لونڈھے، ساتیا وغیرہ شامل ہیں۔ وجیہ راجادھکش کی 'سات سمندر' اور لکشمن لونڈھے کی 'بیمہ ایجنٹ' انسانی رشتوں کی داستان ہے۔ تو نیل کنٹھ مہاجن کی 'عذاب گزیدہ' موجودہ صورت حال کی تصویر کا عمدہ نمونہ ہے۔ ساتیا نے دو نسلوں کے درمیان واقع خلیج کی تصویر کشی کی ہے۔ چونکہ مسائل ہر دو زبانوں میں یکساں ہوتے ہیں اِس لحاظ سے جو تصویر ادب کے ذریعے ابھرتی ہے وہ ایک ہی کہانی پیش کرتے ہوئے دکھائی دیتی ہے۔

متفرق نوعیت کا کام جو اِس میدان میں جاری ہے اُس میں کہانیوں کے باب میں نور پرکار، قاسم ندیم، وقار قادری، معین الدین جینابڑے، انجم عباسی وغیرہ کی کاوشیں لائق تحسین ہیں۔ تنقید اور شاعری کے تحت ڈاکٹر عبدالستار دلوی، ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی، انیس چشتی، بانو سرتاج وغیرہ کے علاوہ دلت ادب میں یعقوب راہی کا دم غنیمت ہے۔

کلاسیکی ادب میں سجادی بیگم نے 'شیام چی آئی' کا ترجمہ بہت پہلے پیش کردیا ہے۔

آج ہمارا معاشرہ جس نہج پر جارہا ہے اس سے ہر خاص و عام واقف ہے۔ ہندوستانی تناظر میں اگر جائزہ لیا جائے تو یہاں قدم قدم پر ایک دوسرے کی تہذیب سے عدم واقفیت کے سبب غلط فہمیوں کے امکانات ہوسکتے ہیں۔ ایسی صورت میں تراجم ہی دو تہذیبوں نیز دو دلوں کو جوڑنے کا کام بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔ اگرچہ کہ یہ کام مشکل ہے مگر ناممکن نہیں۔

آخر میں اِس بات کی بھی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ زبانیں کسی فرد یا معاشرے کی میراث نہیں ہوا کرتیں۔ جو اِسے سیکھ لے وہ اُسے اپنا لیتی ہے۔ آزادی سے قبل اردو کا بول بالا تھا مگر بعد میں صورت حال یکسر بدل گئی۔ جس کے سبب اردو کا رشتہ صرف مسلمانوں تک ہی محدود ہوگیا۔ اِس پر ستم ظریفی یہ ہوئی کہ مہاراشٹر کے مسلمانوں نے شروع شروع میں مراٹھی کو قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ مگر اب کچھ حالات کے تحت اور کچھ ضروریات زندگی کے تحت سوچ و فکر کے دائرے رفتہ رفتہ تبدیل ہورہے ہیں۔ مسلم طبقہ مراٹھی سے اپنی انسیت کا اظہار کرنے لگا ہے مگر مراٹھی داں اردو کی جانب کافی سست روی سے آگے بڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔ آدان پردان کا یہ عمل دونوں سمتوں سے مناسب سطح پر اگر ہونے لگے تو وہ دن دور نہ ہوگا کہ بھارت پھر سے سونے کی چڑیا بن جائے۔

زبانیں انسانوں کی سہولت کے لیے وجود میں آیا کرتی ہیں۔ اور مسائل مشرق سے مغرب تک یکساں ہوتے ہیں۔ ہر زبان کا ادب اپنے معاشرے کی عکاسی کرتا ہے۔ تراجم کی کوششیں ہمیں مسائل کا ادراک کرا کے ایک دوسرے کے غم میں شریک کرواتی ہیں۔ اس لحاظ سے ایسی کاوشوں کو فروغ دینا ہی انسانیت کا اہم تقاضا اور وقت کی ضرورت ہے۔

■

Moinuddin Usmani
264, Shahu Nagar, Jalgaon - 425001 (MS)
Mob.:09420390562

منظور احمد ملا

انٹرویو اور اس کی اہمیت

انٹرویو (Interview) لفظ انٹر (Inter) اور ویو (View) سے مل کر بنا ہے'انٹر' تعلق، رشتہ، ربط، واسطہ، نسبت وغیرہ کو ظاہر کرنے والا جزو ہے اور'ویو' کا مطلب دیکھنا، ذہنی ونفسیاتی جائزہ، حسب مراتب جانچ، امتحان، سوال وجواب، منظر کشی، کسی کے سوال وجواب کے متعلق خاص طور پر غور وخوض کرنا ہے۔

انٹرویو لینے والے کو (Interviewer) اور انٹرویو دینے والے کو (Interviewee) کہا جاتا ہے۔ جو شخص ملاقات کے ذریعے جانکاری اکٹھا کر کے اسے پیش کرتا ہے وہ انٹرویو نگار، ملاقات نگار، انٹرویو کرنے والا، اخبار کا نمائندہ، بات چیت کرنے والا، رائے جاننے والا وغیرہ کہلاتا ہے۔ دراصل انٹرویو سے مراد اُس تخلیق سے ہے جس میں مضمون نگار، مخصوص شخص کے ساتھ ملاقات کرنے کے بعد اہم سوالات کی بنیاد پر اس کی شخصیت اور اس کے کارنامے سے متعلق معلومات حاصل کرتا ہے اور پھر انھیں قلم بند کرتا ہے۔

'انٹرویو' میں کسی شخص سے مل کر کسی خاص زاویہ نظر سے یا کسی پہلو پر سوال پوچھے جاتے ہیں۔ اس میں انٹرویو نگار زندگی کی جھلک پیش کرتا ہے، تبادلۂ خیالات کرتا ہے اور جوابات سے خاص نقطہ نظر سامنے آتا ہے۔

انٹرویو ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہم کسی شخصیت کے مختلف زاویوں کا عکس دیکھتے ہیں۔ عموماً کسی شخص کو دیکھ کر ہم کسی حد تک اس کے مزاج کا اندازہ کر لیتے ہیں مگر ہمارا یہ اندازہ اس کی ظاہری شکل وصورت پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کے باطن یعنی ذہنی رویے، نفسیاتی عمل، فکر و تصور، حاضر جوابی اور ذہانت کا اصل اندازہ اس سے گفتگو کرنے کے بعد ہی ہو پاتا ہے۔ اس باہمی گفتگو کے عمل میں جب مقصد شامل ہو جاتا ہے تب ہم اسے انٹرویو کا نام دے دیتے ہیں۔ انٹرویو اخبارات میں شائع کرنے یا ریڈیو، ٹیلی ویژن پر نشر کرنے کے لیے کیے جاتے ہیں۔ ملازمت کے لیے بھی انٹرویو لیے جاتے ہیں لیکن اس کا تعلق صحافت سے نہیں ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے انٹرویو کی تکنیک مشینی تقاضوں اور پیش کش کے مختلف انداز کی وجہ سے مختلف ہوتی ہے البتہ مواد اور مقصد کے اعتبار سے اخبارات ریڈیو، ٹیلی ویژن کے انٹرویو میں کافی حد تک یکسانیت اور مماثلت ہوتی ہے۔

''صحافت میں 'انٹرویو' کے معنی ہیں کسی منتخب شخص سے رسمی طور پر سوالات پوچھ کر جوابات حاصل کرنا، ایک دوسرے سے بات چیت تو ہمیشہ ہوتی رہتی ہے مگر پہلے سے طے شدہ وقت پر، طے شدہ مقام پر، رسمی طور پر مل بیٹھ کر روبرو سوال وجواب کا سلسلہ جاری رکھ کر معلومات حاصل کرنے کا عمل صحافتی اصطلاح میں 'ملاقات' یا 'انٹرویو' کہلاتا ہے۔'' (رہبر اخبار نویسی، ص 365)

انٹرویو کا لفظی معنی اگر 'باطنی نظارہ' یا 'اندرونی ملاقات' مان لیا جائے تو اس کا حقیقی مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ چونکہ انٹرویو میں داخلی تجزیہ ہوتا ہے اس لیے اس میں سطحی باتوں کے بجائے مخفی معلومات مہیا کی جاتی ہیں:

''اکسفورڈ انگلش ڈکشنری'' میں ملاقات کرنے کو

'انٹرویو' کا نام دیا گیا ہے۔ ''دی ویبڈم ہاؤس ڈکشنری آف دی انگلش لینگویج'' میں انٹرویو اس ملاقات یا بات چیت کو کہا گیا ہے، جس میں مصنف مضمون نگار یا نامہ نگار کسی شخص یا اشخاص سے سوال پوچھ کر کسی اخبار یا رسالے میں اشاعت کے لیے یا ٹیلی ویژن سے ٹیلی کاسٹ کرنے کے لیے مواد جمع کرتا ہے۔'' (آمنے سامنے، ص 10)

انٹرویو میں ادب، آرٹ، سیاست، فلسفہ، سائنس یا کسی بھی فیلڈ کی اہم مشہور و معروف یا قابل ذکر شخصیت سے مل کر سوالات کی روشنی میں ان کے خیالات جاننے اور اسی انداز، اسلوب اور زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

'' امریکن سوشیولوجیکل ریویو' کے مطابق جن سوالات کے ذریعے کسی شخص کی اندرونی گہرائی ناپنے کی کوشش کی جاتی ہے ان سوالوں کے جواب انٹرویو کے ذریعہ مکمل طور پر حاصل ہو سکتے ہیں۔'' (آمنے سامنے، ص 10)

آج دنیا کا ہر نشری ادارہ انٹرویو نشر کرتا ہے۔ انٹرویو کا تاثر سامعین پر بہت دیر تک قائم رہتا ہے اس میں موضوعات کے لحاظ سے بڑی وسعت ہے، آپ کسی بھی موضوع پر ماہرین سے بات چیت کر سکتے ہیں یا کسی شخصیت اور اس کے کارنامے کو سامعین سے متعارف کرا سکتے ہیں۔ ریڈیو انٹرویو ان دنوں بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہو گیا ہے بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس نے ریڈیائی ٹاک پر سبقت حاصل کر لی ہے۔ اس پروگرام میں صرف دو شخص ہوتے ہیں ایک انٹرویو لینے والا جو سامعین کی نمائندگی کرتا ہے (Interviewer) جبکہ دوسرا شخص اپنے بارے میں کسی خاص موضوع پر پوچھے گئے سوالات کا جواب دیتا ہے۔ (Interviewee) انٹرویو لینے والا باتوں باتوں میں انٹرویو دینے والے سے ایسی باتیں پوچھ لیتا ہے جس سے وہ عام طور پر کسی کو نہیں بتاتا۔ رفعت سروش نے ریڈیو انٹرویو کی خوبیوں کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''انٹرویو کی خوبی یہ ہے کہ اس میں بے ساختگی ہو۔ پہلے سے قلمبند کرنا تو کجا یہ بھی معلوم نہ ہو کہ بات سے بات نکلتی چلی جائے اور ہوشیار انٹرویو لینے والا باتوں باتوں میں اپنے مخاطب سے ایسی ایسی باتیں بھی کہلوا لیتا ہے یا اگلوا لیتا ہے جو شاید کبھی نہ بتانا چاہتا ہو۔ یہ بات شخصیات کے انٹرویو میں زیادہ ابھر کر آتی ہے۔'' (براڈ کاسٹنگ، ص 49)

اچھے انٹرویو سے ایک مخصوص شخصیت اور اس دور کے شانِ امتیازات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے:

''ریڈیو انٹرویو کا مقصد سامعین کو کسی مخصوص حالات یا شخصیت کے کارنامے سے واقف کرانا ہوتا ہے بالخصوص جب ہم خبروں یا مذاکروں کے درمیان انٹرویو کے کسی ٹکڑے کو استعمال کرتے ہیں تو اس کا مقصد وہاں موجودہ لوگوں سے خبروں یا مذاکروں کی مزید توثیق کرنا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ رپورٹر یا ماہرین کی آراء شامل کر کے خبروں، مذاکروں یا ریڈیو رپورٹ کو اور زیادہ پر اثر بنایا جاتا ہے۔'' (روبرو، ص 16)

انٹرویو ترسیل کی ایک اہم صنف ہے اور ریڈیو نے اس صنف کو کافی آگے بڑھایا ہے۔ اس کی تاریخ کافی پرانی ہے۔ دنیا میں انٹرویو کا سلسلہ کب شروع ہوا اور کیسے شروع ہوا، یہ کہنا تو انتہائی مشکل ہے لیکن کائنات کا مطالعہ اور مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ بچے کی پیدائش سے ہی ایک غیر رسمی انٹرویو کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ سلسلہ اتنا طویل ہوتا ہے کہ انسان جب بستر مرگ پر ہوتا ہے اس وقت بھی سوال و جواب کا سلسلہ چلتا رہتا ہے:

''انٹرویو کرنا بھی ایک فن ہے۔ یہ فن تجربہ کے ساتھ پختہ ہوتا جاتا ہے۔ اگر آپ اچھا انٹرویو کر سکتے ہیں تو صحافت میں اچھا مقام پا سکتے ہیں خاص طور پر ٹی وی چینل پر۔ انٹرویو کے لیے چرب زبانی اور بولنے کی اچھی صلاحیت اور اپنے خیالات کو ایک دوسرے سے جوڑنے کا فن آنا چاہیے۔'' (اردو میڈیا، ص 201)

بالآخر انٹرویو لینا ایک فن ہے اور یہ فن تجربے کی بنیاد پر پختہ ہوتا ہے اور بلندی حاصل کرتا ہے۔ انٹرویو لینے والا دراصل ایک کٹالسٹ ہوتا ہے اور وہ اپنے مدمقابل سے ایسے سوالات پوچھتا ہے کہ پوری گفتگو کے بعد ایک معنی خیز نتیجہ سامنے آ سکے اور ضروری ہے کہ غیر متعلق سوالات نہ پوچھے جائیں تا کہ انٹرویو دینے والا مناسب جواب دے سکے۔ انٹرویو لینے والے کو ایسے سوالات بھی پوچھنے چاہیے جنھیں سامعین پوچھنا چاہتے ہیں اور سوال پوچھنے والے کے اندر ایک اعتماد اور فطری طور پر ٹوہ لینے کے صفات موجودہ ہوں تا کہ مدمقابل شخص اپنے موقف کو مضبوطی سے پیش کر سکے۔

اہمیت:

کسی بھی مسئلے پر کم وقت میں زیادہ معلومات حاصل کرنے کا سب سے اچھا طریقہ انٹرویو ہے۔ آپ کسی بھی شخص یا اشخاص سے ایک وقت میں بہت ساری معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ طریقہ تمام ترسیلی ذرائع کے لیے کارگر ہے۔ چاہے وہ اخبار ہو ریڈیو ہو یا ٹیلی ویژن۔ اگر چہ انٹرویو کی نوعیت قدرے مختلف ہے کچھ ایسے اصول ضرور ہیں جو اس صحافتی فن کے لیے یکساں طور پر مفید ہیں:

''انٹرویو کے لیے ضروری ہے کہ ایسا موضوع چنا جائے جو قارئین کے لیے دلچسپ اور قابل توجہ ہو۔ عام طور پر ایسے موضوع پر انٹرویو لیے جاتے ہیں جو زمان و مکان کے مطابق ہوں۔ ان میں روز مرہ کی خبروں اور حالاتِ حاضرہ سے متعلق موضوع ہو سکتے ہیں یا کسی خاص موقع و محل کے اعتبار سے مخصوص موضوعات۔''

(اردو میڈیا، ص 211)

انٹرویو کے لیے موضوع کا انتخاب اس کی اہمیت

آج دنیا کا ہر نشری ادارہ انٹرویو نشر کرتا ہے۔ انٹرویو کا تاثر سامعین پر بہت دیر تک قائم رہتا ہے اس میں موضوعات کے لحاظ سے بڑی وسعت ہے، آپ کسی بھی موضوع پر ماہرین سے بات چیت کر سکتے ہیں یا کسی شخصیت اور اس کے کارنامے کو سامعین سے متعارف کرا سکتے ہیں۔ ریڈیو انٹرویو ان دنوں بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہو گیا ہے بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس نے ریڈیائی ٹاک پر سبقت حاصل کر لی ہے۔ اس پروگرام میں صرف دو شخص ہوتے ہیں ایک انٹرویو لینے والا جو سامعین کی نمائندگی کرتا ہے (Interviewer) جبکہ دوسرا شخص اپنے بارے میں کسی خاص موضوع پر پوچھے گئے سوالات کا جواب دیتا ہے۔ (Interviewee) انٹرویو لینے والا باتوں باتوں میں انٹرویو دینے والے سے ایسی باتیں پوچھ لیتا ہے جس سے وہ عام طور پر کسی کو نہیں بتاتا۔

کے لحاظ سے ہوتا ہے جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے کہ موقع ومحل پر منحصر ہے۔ کسی خاص موقع پر انٹرویو کے لیے موضوع منتخب کرتے وقت اس شخصیت کا انتخاب بھی کرنا ہوگا جس سے اس موضوع پر انٹرویو کرنا ہے۔ ظاہر ہے ایسے شخص کے انتخاب کے لیے ضروری ہے کہ موضوع کے بارے میں صاحب رائے کی حیثیت رکھتا ہو، اس کے بارے میں معتبر معلومات رکھتا ہو اور وہ خود اس موضوع سے منسلک ہونا چاہیے وہ چاہیے علمی اعتبار سے ہو یا قربت کے لحاظ سے۔ اگر موضوع ادبی ہے تو انٹرویو کے لیے ایسے شخص کا انتخاب کریں جس کی ادبی حیثیت ہو اور ادب پر دسترس رکھتا ہو۔ مثلاً اگر تنقید پر رائے حاصل کرنی ہے تو کسی معتبر شخص کو اظہار خیال کے لیے چُنیں۔ اگر موضوع سیاسی ہو تو کسی ایسے سیاستداں سے جو اس موضوع کے بارے میں معقول معلومات و رائے رکھتے ہوں انٹرویو کی جائے۔ انٹرویو کے لیے مناسب شخص کا انتخاب بھی انٹرویو کی معنویت ودلچسپی کا ضامن ہوتا ہے:

''انٹرویو کا مقصد حقیقت یا اصلیت کی نقاب کشائی ہے جس شخص کا انٹرویو لینا ہے اُسی کے الفاظ میں اس کے کارناموں کا تجزیہ اور تخمینہ کرنا انٹرویو لینے والے کا نصب العین ہوتا ہے۔'' (آمنے سامنے، ص12)

انٹرویو کی اہمیت یہ بھی ہے کہ بعض باتیں اور انکشافات ایسے ہیں جن سے سامعین پہلے باخبر نہیں تھے اس لیے کہ ہر تخلیق کار کے ذہن میں ایک سطح ایسی ہوتی ہے جو اس کے تخلیقی تناظر کو واضح کرتی ہے۔ اس تناظر کو جاننے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں کہ آپ اس فنکار سے مخاطب ہوں اور اس طرح Provoke کریں کہ وہ اپنے مخفی سرچشموں کو نمایاں کرسکے۔ کیوں کہ ایسی گفتگو کے ذریعے ہم تخلیق کار کے باطن سے باخبر ہوتے ہیں:

''انٹرویو لیتے وقت آپ کی آواز کے زیروبم یا چہرے کے تاثرات زیر بحث موضوع کے مطابق ہونے چاہئیں۔ سنجیدہ موضوع پر خنداں پیشانی کا مظاہرہ معیوب ہوگا۔'' (اردو میڈیا، ص216)

انٹرویو کی اہمیت اس اعتبار سے بھی خاصی ہے کہ اس کے توسط سے تیر ونشتر کی گنجائش نکلتی ہے۔ ادبی تحریروں میں کئی بندشیں ہوتی ہیں کیوں کہ ادیبوں کو ضمنی بیان کے لیے جواز نہیں ملتا جب کہ بات چیت کے دوران تیر ونشتر کے بہانے خود بخود نکل آتے ہیں۔ سوالات بھی کچھ ایسے کیے جاتے ہیں کہ فنکار لاشعوری طور پر وہ باتیں کہہ جاتا ہے جنھیں وہ اپنی تحریروں میں بیان کرنے سے گریز کرتا ہے۔ بہت ناپ تول کر بیان دینے

انٹرویو اردو ادب کی ایک نئی صنف کے طور پر ابھری ہے جس میں کسی شخص کے نجی خیالات وجذبات سامعین کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔ انٹرویو کے ذریعے ہم ادیبوں، شاعروں، مضمون نگاروں کے ان واقعات سے بھی آشنا ہوتے ہیں جن کا وہ ادب میں ذکر نہیں کرسکتے یوں ان کی حقیقی زندگی کا مطالعہ اور نئی معلومات بھی حاصل ہوتی ہے۔ دراصل انٹرویو میں ہم مخصوص شخص کے ساتھ ملاقات کرنے کے بعد اہم سوالات کی بنیاد پر اس کی شخصیت اور کارنامے کے متعلق پوری معلومات حاصل کرتے ہیں اور پھر انھیں قلم بند کرتے ہیں تاکہ اس شخص کے نفسیاتی عمل، فکرو تصور، اور ذہانت کا اصلی اندازہ ہوسکے۔

والے افراد بھی سوالوں کے گھیرے میں آجاتے ہیں اور ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جن کا وہ اظہار کرنا ہی نہیں چاہتے اور یہ ایک اچھے ملاقاتی سے ہی امید کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح غیر تحریری خیال کو ظاہر کرنے اور اَن چھوئے خیالات کو چھونے کا فن ہے۔ انٹرویو ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے نئے حقائق کا انکشاف اور نئی معلومات سے آشنائی ہوتی ہے۔ اس ضمن میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ کچھ باتیں ایسی ہیں جنھیں تحریر کے بجائے گفتگو میں بروئے کار لانا کسی فنکار کے لیے زیادہ آسان ہوتا ہے۔ اکثر ہوتا ہے کہ تخلیق کار سوالات قائم کرکے کچھ نہیں لکھتے بلکہ ان کے تخلیقی عمل میں جو کچھ آتا ہے اسے لکھ جاتے ہیں۔ جبکہ انٹرویو میں ایسا نہیں ہوتا۔ پہلے سوالات قائم کیے جاتے ہیں پھر مخاطب جواب دیتا ہے:

''انٹرویو میں ایک ہی کردار کی بات چیت کی اہمیت خاص طور پر ہوتی ہے۔ مصنف کی شخصیت اس میں اثر نہیں رکھتی۔ ہاں سوالات کی اہمیت ضرور ہوتی ہے۔ انٹرویو لینے والے بیان، اسلوب اور تجزیہ کو اہمیت دی جاتی ہے۔'' (روبرو، ص11)

انٹرویو کی ایک خصوصیت زندگی کے وسیع تجربات کو سامنے لانا اور فنکار کی زندگی کے نشیب وفراز سے آگہی حاصل کرنا بھی ہے۔ جہاں تحریر گونگی ہوجاتی ہے وہاں انٹرویو اسے زبان عطا کرتا ہے۔ جب تحریر پر خاموشی چھا جاتی ہے تو گفتگو اُس خاموشی کو توڑتی ہے۔ جب بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوجاتی ہیں تو انٹرویو کے ذریعے ہی انھیں دور کیا جاتا ہے۔ انٹرویو سے ہی کسی شخصیت کی بہت سی گرہیں کھلتی ہیں جن کا ہمیں گمان بھی نہیں ہوتا۔ انٹرویو کی سب سے بڑی طاقت پوشیدہ راز کو افشا کرنا ہے۔ گفتگو سے ہی بہت سے موضوعات دلچسپ اور متنازعہ فیہ بھی ہو جاتے ہیں۔ کچھ سوالات کے حساس اور اپیلنگ ہونے سے قارئین یا سامعین کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے اب باضابطہ انٹرویو کے کلیکشن شائع ہورہے ہیں اور دن بہ دن اس کی دستاویزی حیثیت مسلم ہوتی جارہی ہے۔

بالآخر انٹرویو اردو ادب کی ایک نئی صنف کے طور پر ابھری ہے جس میں کسی شخص کے نجی خیالات وجذبات سامعین کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔ انٹرویو کے ذریعے ہم ادیبوں، شاعروں، مضمون نگاروں کے ان واقعات سے بھی آشنا ہوتے ہیں جن کا وہ ادب میں ذکر نہیں کرسکتے یوں ان کی حقیقی زندگی کا مطالعہ اور نئی معلومات بھی حاصل ہوتی ہے۔ دراصل انٹرویو میں ہم مخصوص شخص کے ساتھ ملاقات کرنے کے بعد اہم سوالات کی بنیاد پر اس کی شخصیت اور کارنامے کے متعلق پوری معلومات حاصل کرتے ہیں اور پھر انھیں قلم بند کرتے ہیں تاکہ اس شخص کے نفسیاتی عمل، فکر وتصور، اور ذہانت کا اصلی اندازہ ہوسکے۔

کتابیات

1. اختر محمد شکیل: روبرو، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، 2012
2. اختر محمد شکیل: اردو میں نشریاتی ادب، اردو بک ریویو نئی دہلی 2007
3. خواجہ محمد اکرام الدین: اردو میڈیا، قومی کونسل برائے فروغ 2014
4. سروش رفعت: براڈ کاسٹنگ، نورنگ کتاب گھر نوئیڈا 2000
5. نارنگ گوپی چند: دیکھنا تقریر کی لذت، ترتیب (مشتاق صدف)، کرناٹک اردو اکادمی بنگلور 2010
6. ہرگانوی عاشق مناظر: آمنے سامنے، کتب خانہ انجمن ترقی اردو، دہلی 2000
7. ہرگانوی عاشق مناظر: روبرو، کتب خانہ انجمن ترقی اردو، دہلی 1992

■

Manzoor Ahmad Malla, Research Scholar, Punjabi University, Patiala - 147002 (Punjab)

نیا ترسیلی بیانیہ اور اردو صحافت

شافع قدوائی

نئی صارف اساس اطلاعاتی تکنالوجی کے حوالے سے مرتب اور متشکل ہونے والی اکیسویں صدی کو متعدد متعین امتیازات کے باعث مابعد صداقت اور قومیت عہد (Post-truth and Nation Century) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس عہد کا اہم ترین شناس نامہ موبائل فون اور انٹرنیٹ کا پیہم استعمال ہے جس کی اساس اصلاً بولے ہوئے لفظ (Spoken Word) پر قائم ہے اور Chatting سمیت دیگر ذرائع ترسیل میں Spoken Word کی ہمہ گیر بالادستی کے پیش نظر اب رسم الخط کی حاکمیت کے خاتمے (End of tyranny of script) کے تصور کو بھی فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ اس تعبیر آشنا اور فتوحات اور کامرانیوں کے نئے امکانات کی مسلسل آبیاری کرنے والی کائنات اب کسی نجات کوش فلسفے (Emancipatory Philosophy) یا خوش آئند نظریۂ حیات یا وسیع تر سیاسی سیاق کو محیط منظم کوشش یا لسانی یا ثقافتی آرزومندیوں کو بروئے کار لانے والی حکمت عملی کو قبول نہیں کرتی بلکہ انسان اور دیگر نوامیس فطرت کے باہمی ارتباط کی نوعیت اور انسان کے پر پیچ اور سنگین خارجی مسائل اور اس کے وجودی سروکاروں اور حسیاتی اور جمالیاتی منطقوں کی شیرازہ بندی اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ایک ہمہ جہت ترسیلی بیانیے کی تشکیل کرتی ہے جو انسان کے جملہ مسائل کو بیک وقت مرکز نگاہ بناتا ہے اور ان کے ازالے کا مکالمہ قائم کرتا ہے۔ ذرائع ابلاغ اور عمل ترسیل اب کسی شے کے حصول کا ذریعہ نہیں بلکہ فی نفسہٖ End ہو گئے ہیں۔ حسن و قبح اور رد و قبول کا عمل کسی مذہبی، مابعد الطبیعیاتی، سیاسی اور سماجی احکام کا پابند نہیں بلکہ معاشرے کا حاوی ڈسکورس (Dominant Discourse) ذرائع ابلاغ ایک ایسے ترسیلی بیانیے کے حوالے سے قائم کرتے ہیں کہ اس کی اثر پذیری سے زندگی کا کوئی گوشہ نہیں بچ پاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاصر معاشرے کو Spectacle Society یا تماشہ معاشرہ بھی کہا جاتا ہے۔ خرید و فروخت کی سرگرمیوں سے قطع نظر جذبوں کے اظہار اور عقیدے سے متعلق رسومیات بشمول مذہبی تقریبات اور تہواروں کے انعقاد اور ان کی تاریخوں کا تعین بھی ذرائع ترسیل کرتے ہیں۔ محبت کے جذبے کی نوعیت اور اس کے اظہار کی تاریخ کا تعین انسانی تاریخ میں ہمیشہ مذاہب یا معاشرتی رسومیات کی رو سے کیا جاتا رہا ہے۔ کرسمس، دیوالی، ہولی اور عید وغیرہ کی مثالیں سامنے کی ہیں۔ اسی طرح زندگی کے مختلف میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دینے والوں کے لیے یوم پیدائش یا یوم وفات یا پھر کسی قومی مملکت (Nation State) کی تاریخ میں کسی اہم دن پر تقریبات کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ مگر بازار اساس معاشرہ، جن کے پاس خریدنے اور بیچنے کی طاقت کے علاوہ کوئی اور قوت نہیں ہے، اب ذرائع ابلاغ کے توسط سے انسان کے معتقدات اور جذبات کو بھی کیش کرنے پر قادر ہو گیا ہے۔ ماں سے یا باپ سے محبت کا اظہار کسی بھی دن کیا جا سکتا ہے مگر اسے ایک مخصوص دن سے وابستہ کر کے اور کارڈ کی صورت میں اس رسم کی ادائیگی کو قابل قبول بنا دینا اسی روش کا غماز ہے۔ اسی طرح جنس مخالف سے محبت کے اظہار کو 14 فروری کو Valentine's Day سے مربوط کر دینا وغیرہ اس نوع کی اہم مثالیں ہیں۔ فنون لطیفہ اور کلچر کے اعلیٰ ترنمونوں کے بجائے اس کی مقبول عام اور پست سطح کو فروغ دینا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

نیا ترسیلی بیانیہ، جس کے محور پر سمعی و بصری ذرائع ابلاغ کے علاوہ اخبار اور جرائد بھی گردش کرتے ہیں، محض خارجی حقائق اور واقعات کو مرکز نگاہ نہیں بناتا یا حقیقت کی عکاسی نہیں کرتا بلکہ حقیقت کی خود تشکیل کرتا ہے اور پھر زبان تصاویر اور متحرک امیجز کے توسط سے یہ باور کراتا ہے کہ اصل حقیقت یہی ہے۔ کاشتکاروں کی خودکشی کے واقعات کو نظرانداز کر کے قارئین یا ناظرین اور سامعین کو بتایا جاتا ہے کہ نمبر ایک سلمان خان ہے یا شاہ رخ یا بگ باس کے گھر میں گزشتہ شب کیا ہوا۔ یہی سب سے اہم واقعہ ہے اور قارئین کی تمام تر دلچسپی کا مرکز اسی نوع کے واقعات ہیں۔

نیا ترسیلی بیانیہ اطلاع رسانی، ذہن سازی اور انبساط آفرینی سے بیک وقت کسب فیض کرنے کے بجائے اب محض Infotainment Model کو پیش نگاہ کرتا ہے یعنی اطلاع کی ترسیل میں بھی تفریح رسانی کے نت نئے امکانات کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ ہر خبر ایک روزہ کرکٹ میچ کی سنسنی خیزی کے ساتھ پیش کی جاتی ہے اور اب خبر اور رائے کا فرق بھی تقریباً معدوم ہو گیا ہے۔ اخبار کی سوچی سمجھی رائے کا اظہار اداریے میں ہوتا تھا مگر اب اہم خبروں کے ساتھ رائے کا بھی برملا اظہار کر دیا جاتا ہے۔ ٹائمس آف انڈیا نے بعض اہم خبروں کے آخر میں ٹائمس آف انڈیا کی رائے (Times of India's Views) کے عنوان سے خبر پر رائے زنی کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ اس طرح اداریے کی مرکزیت اور اس کے تقدس کے تصور کو بھی تہہ و بالا (Subvert) کر دیا گیا ہے۔ ٹیلی ویژن میں ظاہر ہے کہ اداریے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی، لہٰذا اہم موضوعات پر مذاکرے کا اہتمام کیا جاتا ہے اور ہر ٹی وی اینکر (Anchor) کی کوشش ہوتی ہے کہ معروضی اور سنجیدہ بحث کے بجائے مجادلے کی سی صورت (Fight like situation) پیدا کر دی جائے تاکہ انسان کی خلقی کج روی (Wickedness) اس نوع کی سرگرمیوں سے بطور خاص محظوظ ہوتی رہے۔ بگ باس (Big Boss) کی مقبولیت کا اصل سبب یہی ہے۔

نیا ترسیلی بیانیہ سنجیدہ اور باخبر (Informed) قاری / سامع / ناظر کے بجائے انسانی دردمندی سے عاری تماش بین کو وجود میں لا رہا ہے جس کے نزدیک اتلاف انسانی سے ہمیں زیادہ اہم اداکار کی ذات ہے۔ یہی سبب ہے کہ کار سے کچل کر جاں بحق ہونے والے مزدوروں کے ملزم کو جب بری کیا گیا تو اس کا جشن ڈھول تاشے کے ساتھ سڑکوں پر منایا گیا۔ انسانی بے حسی کے ایسے مناظر اب عام ہو گئے ہیں۔ ترسیل کی نئی حکمت عملی دراصل زبان کے تکلمی کردار کو پیش نگاہ رکھتی ہے اور خبروں کی پیش کش کے طریقوں پر تقریر (Speech Act) کے سائے لرزاں نظر آتے ہیں۔ بول چال کے الفاظ کے پیہم

استعمال سے تحریر میں بھی گفتگو کی سی برجستگی پیدا کر دی جاتی ہے اور الفاظ کی صحت یا ان کے صحیح تلفظ پر توجہ نہیں دی جاتی ہے۔ جو عوامی سطح پر رائج ہے وہی صحیح بھی ہے۔ نیا ترسیلی بیانیہ زبان کے تئیں اسی نقطۂ نظر کا مؤید ہے۔

نیا ترسیلی بیانیہ ماضی کے برخلاف ترسیل کے بڑی حد تک یکطرفہ ہونے کا قائل نہیں ہے۔ اب ترسیل کا بہاؤ لازماً ماخذ سے وصول کنندہ تک نہیں ہوتا بلکہ اکثر یہ ترتیب معکوس صورت بھی اختیار کر لیتی ہے۔ نیا بیانیہ زیادہ Participatory یا قاری/ناظر/سامع اساس ہو گیا ہے۔ اخباروں میں تو مراسلہ کے کالم کی روایت زمانہ قدیم سے قائم ہے مگر اب ٹی وی میں ناظر اپنے ویڈیو بھی بھیج سکتے ہیں۔ اسی طرح اب Citizen Journalism کا نیا دور شروع ہوا ہے۔ مختلف ٹی وی چینلوں نے سوشل میڈیا مثلاً یوٹیوب، فیس بک اور ٹوئٹر جن کی نوعیت تعاملی (Interactive) ہے، کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ناظر کی مرسلہ خبروں اور رپورٹوں کو نشر کرنا شروع کیا ہے۔

انسان کی جملہ ضروریات اور اس کی حسی و جذباتی تسکین کو اولین ترجیح دینا نئے ترسیلی بیانیے کا مابہ الامتیاز عنصر ہے۔ ٹی وی سے قطع نظر اگر محض اخبارات کو مرکز نگاہ بنایا جائے تو یہ منکشف ہوگا کہ اب محض اداریہ یا مضامین کے توسط سے کسی موضوع سے متعلق تمام اہم مباحث سے قاری کو واقف نہیں کر دیا جاتا بلکہ اب ادارتی صفحے کے علاوہ دیگر صفحات پر بھی کسی اہم موضوع یا کسی اصطلاح (Term) کی وضاحت کے لیے خصوصی کالم شائع کیے جاتے ہیں اور اسے e-explained کے عنوان سے چھاپا جاتا ہے۔ انڈین ایکسپریس نے یہ اہم اور خوش آئند سلسلہ شروع کیا ہے۔ اخبار کے تجربہ کار ادارتی عملے کا کوئی رکن خصوصاً اسسٹنٹ ایڈیٹر یہ کالم لکھتا ہے اور آخر میں مزید مطالعے کے لیے مفید کتابوں اور ویب سائٹوں کی بھی نشان دہی کی جاتی ہے۔ اسی طرح صحت اور تندرستی سے متعلق مضامین کے لیے ہفتے میں ایک صفحہ مختص کیا جاتا ہے اور اکثر کسی ڈاکٹر یا تغذیہ کے ماہر کے قارئین کے ساتھ سوال و جواب کا کالم بھی شائع کیا جاتا ہے۔ کچھ اخباروں میں نئی کتابوں کے تبصروں پر مشتمل ہفتہ وار خصوصی صفحہ شائع کیا جاتا ہے، اسی طرح مذہب اور اخلاقی تعلیمات سے متعلق خصوصی کالم بھی اشاعت پذیر ہوتا ہے۔ ٹائمس آف انڈیا میں اس کالم کا عنوان Speaking Tree ہے۔

اس نئے ترسیلی بیانیے کے امتیازات پر قدرے تفصیلی گفتگو کے بعد یہ ضروری ہے کہ اس پس منظر میں اردو صحافت علی الخصوص اردو اخبارات کا جائزہ لیا جائے۔

اردو صحافت کی 200 سالہ تاریخ پر نظر ڈالنے سے منکشف ہوگا کہ اردو صحافت ابتدا ہی سے اطلاع رسانی اور مختلف علوم سے اور نئی سائنسی ایجادات سے قارئین کو واقف کرانے کا فریضہ انجام دیتی رہی ہے۔ اردو کے اولین صحافیوں مولوی اکرام، منشی سدا سکھ لال، سید محمد باقر، سید محمد خاں، نول کشور اور سرسید نے صحافت کے جس تصور کی آبیاری کی اس میں واقعات کے سنسنی خیز بیان کے بجائے رونما ہونے والے اہم واقعات اور مختلف میدانوں میں ہونے والی نئی علمی پیش رفت سے قارئین کو واقف کرانا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اردو صحافت نے ابتدا ہی سے غیر ملکی تسلط کے خلاف صدائے احتجاج کو اپنا شعار بنایا تھا اور سید محمد باقر کو اس سلسلے میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنا پڑا تھا۔

اردو صحافت کی 200سالہ تاریخ پر نظر ڈالنے سے منکشف ہوگا کہ اردو صحافت ابتدا ہی سے اطلاع رسانی اور مختلف علوم سے اور نئی سائنسی ایجادات سے قارئین کو واقف کرانے کا فریضہ انجام دیتی رہی ہے۔ اردو کے اولین صحافیوں مولوی اکرام، منشی سدا سکھ لال، سید محمد باقر، سید محمد خاں، نول کشور اور سرسید نے صحافت کے جس تصور کی آبیاری کی اس میں واقعات کے سنسنی خیز بیان کے بجائے رونما ہونے والے اہم واقعات اور مختلف میدانوں میں ہونے والی نئی علمی پیش رفت سے قارئین کو واقف کرانا تھا۔

صادق الاخبار کا طرزِ عمل بھی کم و بیش یکساں تھا تاہم 1857 کی ناکام جنگ آزادی کے بعد صورت حال خاصی تبدیل ہوئی۔ سرسید نے 1866 میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نکال کر اردو صحافت کو ایک نئے ذائقے سے آشنا کیا اور قارئین کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کے بجائے ان میں مسائل کے تئیں معروضی نقطہ نظر پیدا کرنے کی کوشش کی۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے خبر اور اداریے میں واضح فرق کی نشان دہی کرتے ہوئے اداریے کی باقاعدہ اشاعت کا اہتمام کیا۔ سرسید کی روش پر اردو صحافت کم ہی عمل پیرا ہوئی اور احتجاج کی لے ہمیشہ تیز رہی ہے۔ جدو جہد آزادی کے دوران اور تقسیم وطن کے بعد بھی اردو صحافت جس نوع کے ترسیلی بیانیے سے کسب فیض کرتی رہی، اس کی نوعیت بڑی حد تک احتجاجی ہی تھی۔ بابری مسجد کے انہدام کے بعد صورت حال میں نمایاں تبدیلی آئی اور اب اردو صحافت محض احتجاج کو اپنا مقصود نہیں جانتی اور اہم معاصر اخباروں مثلاً سیاست (حیدرآباد)، انقلاب (ممبئی، دہلی)، منصف (حیدرآباد)، راشٹریہ سہارا (نئی دہلی) اور اخبار مشرق (کلکتہ) وغیرہ پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب اردو اخبارات اردو، مسلم یونیورسٹی، فرقہ وارانہ فسادات اور مسلم پرسنل لا کو محض مرکز نگاہ نہیں بناتے بلکہ وہ اپنے قارئین کے جملہ تقاضوں پر پورا اترنے کی کوشش کرتے ہیں اور نئے ترسیلی بیانیے سے جس کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے، خود کو مربوط کرنے کی بھی سعی کرتے ہیں۔ اردو اخبارات میں ملک کے مشہور کالم نگاروں اور سیاسی مبصروں کے سنجیدہ تجزیے شائع ہوتے ہیں اور خبروں کے انتخاب میں بھی محض کسی ایک فرقے کے مذہبی جذبات کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ ''مسلمان کیا کریں'' اردو صحافت کا انتہائی مرغوب سوال رہا ہے تاہم اب اردو اخبار مسلمانوں کے مسائل کو سماج کے دیگر محروم اور حاشیے پر سانس لینے والے افراد کے مسائل کے تناظر میں پیش کرنے لگے ہیں۔

اردو صحافت علی الخصوص اخبارات نئے ترسیلی بیانیے کی پاسداری کرنے کے ساتھ بعض خوشگوار نقطہ ہائے انحراف کی خبر بھی دے رہے ہیں۔ اولاً تو یہ کہ اردو اخبار اب بھی Infotainment یا Page Three Journalism کے قائل نہیں ہیں، لہٰذا Entertainment World کی خبروں کی اشاعت کے لیے کوئی صفحہ مخصوص نہیں کیا گیا ہے اور نہ Celebrities کے ساتھ چیٹنگ کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اسی طرح ضعیف الاعتقادی اور اوہام پرستی کے فروغ سے متعلق مواد بہت کم اشاعت پذیر ہوتا ہے۔ ستاروں کی چال یا قسمت کا حال کالم بھی بہت کم اردو اخباروں میں شائع کیا جاتا ہے۔

اردو اخبارات کے انٹرنیٹ ایڈیشن شائع ہونے لگے ہیں اور اردو اخبارات بھی بڑی حد تک Interactive ہو گئے ہیں۔ E-learning کا تصور ابھی زیادہ مقبول نہیں ہو سکا ہے اور اس ذریعے سے قارئین کی ذہن سازی کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی ہے۔

زبان، تصاویر اور دیگر بصری مواد کی اشاعت کی سطح پر اردو اخبار نئے ترسیلی بیانیے سے پوری طرح ہم آہنگ ہے جو اردو اخبارات کے خوش آئند مستقبل کا اشاریہ ہے۔

■

Prof. Shafey Kidwai Dept. of Mass Communication, Aligarh Muslim University, Aligarh - 202002 (UP)

کشمیری لال ذاکر
کچھ احوال واذکار

نند کشور وکرم

اُردو کے ممتاز اور زود نویس فکشن نگار اور شاعر کشمیری لال ذاکر کا 31 اگست 2016 کو چنڈی گڑھ کے میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں انتقال ہوگیا۔

ذاکر صاحب نے جتنی طویل عمر پائی اُتنی شاید ہی کسی اور فکشن نگار نے پائی ہو۔ وہ لگ بھگ 98 سال کی عمر میں اس دنیائے فانی سے رختِ سفر باندھ کر عدم کی نامعلوم وادی کی جانب روانہ ہوگئے اور اُن کی وفات سے اُردو ادب ایک ایسے ممتاز فکشن نگار سے محروم ہوگیا جس نے زائد از پون صدی اُردو ادب میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے اور شاہراہِ فکشن پر اپنے انمٹ نشان ثبت کرکے ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جُدا ہوگئے۔ اُن کی رحلت سے اُردو ادب نے ایک ایسا نامور اور معروف فکشن نگار کھو دیا جس نے میدان ادب میں شہرت کی بلندیوں پر اپنا پرچم لہرایا اور جس کا نام ادبی دنیا کا جانا پہچانا نام بن گیا تھا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ شاید ہی کوئی اُردو والا ایسا ہوگا جس نے اُن کی کوئی تخلیق خصوصاً ناول یا افسانہ نہ پڑھا ہوگا، تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔

میرے ذاکر صاحب سے کوئی نصف صدی کے تعلقات رہے ہیں اور ہم اکثر دہلی اور چنڈی گڑھ میں منعقدہ ادبی تقریبات اور نجی محافل میں ایک دوسرے سے ملتے رہے ہیں اور مجھے اُن کے بہت قریب رہنے کا شرف حاصل رہا ہے اور اس قربت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہم دونوں پنجاب کی موہیال برادری سے تعلق رکھتے ہیں جو سات ذیلی ذاتوں دت، بالی چھبر، وید، موہن لو اور بھوال پر مشتمل ہے اور جنھیں حسینی براہمن کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے، جن کا دعویٰ ہے کہ اُن کے اجداد عرب کی کسی ریاست میں حکومت کرتے تھے اور ایک روایت کے مطابق اُن کے بزرگ راہب دت نے جنگِ کربلا میں حضرت حسینؓ کا ساتھ دیا تھا اور اُن کے سات بیٹے اس لڑائی میں قربان ہوگئے تھے اور یہ کہ وہ حضرت حسینؓ کا سر یزید کے قبضے سے چھڑا کر لائے تھے۔ بعد ازاں جب اُن کا وہاں رہنا مشکل ہوگیا تو وہ عرب سے کوچ کرکے افغانستان اور پنجاب کے مختلف حصوں میں آباد ہوگئے۔ ذاکر صاحب کی ذات 'موہن' ہے اور میری 'دت'۔ موہیال برادری کی یہ صفت ہے کہ وہ دیگر براہمنوں کی طرح دان دکشنا نہیں لیتے اور چھتریوں کی طرح جنگجو قوم میں شمار ہوتے ہیں۔ اس برادری کے زیادہ تر افراد فوج اور پولیس میں اب بھی خدمات انجام دے رہے ہیں اور ان میں سے بعض میجر جنرل اور لفٹیننٹ جنرل کے عہدے پر فائز ہیں۔ یہ لوگ عام براہمنوں کی طرح ماس مچھلی اور شراب وکباب سے پرہیز نہیں کرتے۔

ذاکر صاحب کی پیدائش 7 اپریل 1919 کو پنجاب کے مشہور شہر گجرات کے بگا بانیاں میں گورداس مل موہن کے ہاں ہوئی۔ انھوں نے انگریزی میں ایم اے اور بی ٹی کی ڈگری حاصل کرنے کے علاوہ تعلیم بالغان اور سوشل ایجوکیشن میں خصوصی تربیت حاصل کی اور درس وتدریس کے پیشے سے منسلک ہوگئے۔ وہ کوئی تیس سال تک پنجاب اور ہریانہ کے محکمہ تعلیم میں خدمات انجام دینے کے بعد 1977 میں حکومت ہریانہ کے محکمہ غیر رسمی وتعلیم بالغان کے سربراہ کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔

ذاکر صاحب نے متعدد ناولوں سے اُردو فکشن کو مالامال کیا جن میں اُن کے ناول 'کرماں والی' کو غالباً سب سے زیادہ شہرت ملی اور اسے قارئین نے بے حد پسند بھی کیا۔ یہ فرقہ وارانہ اتحاد ویکجہتی کی کہانی ہے اس ناول کا موضوع برِ صغیر کی تقسیم کا المیہ ہے جس کے تحت لاکھوں انسانوں کو ہجرت کرنی پڑی اور اپنا گھر بار، اپنا وطن اپنا مولد چھوڑ کر دوسرے ملک جانے پر مجبور ہونا

پڑا۔اس کے نتیجے میں بھائی بھائی سے جدا ہوگیا اور وہ لوگ ایک محرومی ایک کسک ایک اذیت کا شکار ہوگئے اور ہندوستان سے پاکستان اور پاکستان سے ہندوستان ہجرت کرنے والے اپنے وطن کی یاد میں تڑپتے رہ گئے۔

اس ناول کی کہانی کو اتنا پسند کیا گیا کہ 1990 کے قریب نیشنل اسکول آف ڈرامہ نے اسے اڈاپٹ کرکے ڈرامے کی شکل میں اسٹیج پر پیش کیا اور یہ عوام میں اتنا مقبول ہوا کہ اسے ایک سو سے زیادہ بار اسٹیج پر پیش کیا جا چکا ہے اور بعد ازاں اسی ڈرامے کو پنجابی زبان کا جامہ پہنا کر 'میرا رانجھا میرا جوگی' کے نام سے جالندھر اور سرینگر ریڈیو سے بھی پیش کیا گیا تھا۔

ان کے ناولوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب نے ہر اہم قومی، سماجی اور سیاسی خبر یا واقعہ کو بڑی خوبصورتی سے ایک ناول کی شکل دی ہے اُن کے ناول انگوٹھے کا نشان میں بندھوا مزدوروں کے مسائل و مصائب پر بڑے حقیقت پسندانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔'بلیک باکس' نامی ناول میں 'کنشک' جہاز کے المیے کو بڑے دلپذیر انداز میں پیش کیا ہے جس میں کناڈا سے ہندوستان آتے ہوئے سیکڑوں معصوم اور بے گناہ افراد دہشت گردی کا شکار ہو جاتے ہیں۔اسی طرح کشمیر جل رہا تھا اور لمحوں میں بکھری زندگی میں انھوں نے کشمیر جنت نشاں کے ناگفتہ بہ حالات پر بہت ہی دلپذیر انداز میں ناول رقم کیے جن میں کشمیر کے تاریخی، تہذیبی اور معاشرتی حالات کی بڑی عمدہ منظر کشی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح شر پسند طاقتوں نے اس پُر امن خطے کے امن وسکون کو برباد کر دیا ہے۔'سیندور کی راکھ' اُن کا سوانحی ناول ہے جس کے مطالعے سے قاری اُن کی زندگی کے بہت سے حالات سے روشناس ہوتا ہے۔ نشہ بندی کے موضوع پر (سلاخ ٹوٹتی ہے) ونوبا بھاوے کی تحریک ''بھودان آندولن پر (دھرتی سدا سہاگن) اور ہندوستان کے ساحلی علاقوں پر قہر برپا کرنے والے طوفان 'سنامی' پر (سمندر اب خاموش ہے) چنڈی گڑھ شہر کے ماحول اور پس منظر میں (ایک شہر ایک محبوب، میرا شہر ادھورا) تاریخی ناول (خون پھر خون ہے رگھبورا ہو کی ایک رات ر سمندر صلیب اور وہ) مشترکہ خاندان کی شکست و ریخت اور بوڑھوں کے مسائل پر 'ڈوبتے سورج کی کتھا' قلم بند کی۔ سماج میں عورت کی ناگفتہ بہ حالت اور اس کے مسائل پر ناول 'لمحوں میں بکھری زندگی' ایسے متعدد ناول لکھے ہیں، جن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ شاید ہمارے عہد کا کوئی بھی اہم مسئلہ اُن کے قلم کی زد سے نہیں بچ پایا جس پر انھوں نے اپنے انداز و اسلوب میں اپنے خیالات ونظریات کو صفحۂ قرطاس پر نہ اُتارا ہو۔

ذاکر صاحب فکشن کے میدان میں ایک ممتاز و مستند فکشن نگار کی حیثیت سے ایک بلند مقام حاصل کر چکے تھے اور غالباً وہ ملک کے واحد افسانہ نگار اور ناولسٹ تھے جنھوں نے ملک کے لگ بھگ ہر اہم مسئلے اور واقعے کو اپنے دلپذیر ناول یا افسانے کی شکل میں پیش کیا ہے۔

ان کے ناولوں پر اپنی ناقدانہ نظر ڈالتے ہوئے معروف نقاد ومحقق ڈاکٹر عبدالمغنی نے اپنی رائے کا اظہار یوں کیا ہے:

''جناب کشمیری لال ذاکر...... اردو فکشن میں اس کے ایک عظیم فن کار پریم چند کی روایات کے امانت دار اور علم بردار ہیں۔ اس لیے انھوں نے شہر سے دیہات کی طرف واپسی کا راستہ اختیار کیا ہے اور چھوٹے کسانوں کی زندگی سے بحث کی ہے۔ یہ گویا صنعتی انقلاب سے پہلے کے زراعتی ہندوستان کے معاشرے کی تصویر کشی ہے۔ لیکن اسے ایک سادہ سی دہقانیت نہیں کہہ سکتے، اس لیے کہ جس ہندوستانی سماج کی مرقع نگاری جناب کشمیری لال ذاکر نے کی ہے وہ تقسیم ہند کے آس پاس اس کے بعد یعنی بیسویں صدی کے دوسرے نصف کا جدید ہندوستان ہے، جس نے ہر قسم کی سیاسی، معاشی، سائنسی، صنعتی اور تکنیکی ترقی کو اپنا نصب العین قرار دیا ہے۔ اس نصب العین کے اثرات کا علم بھی ناول نگار کو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تخلیقات کے موضوعات اور کردار رنگ زمانہ سے متاثر ہو کر ہی اصلاح احوال کا نقشہ پیش کرتے ہیں، خواہ وہ نئی آزاد بستیاں بسانے کی بات ہو، عقد بیوگان ہو، بوڑھوں کا آشرم ہو، یہ سب نکات دور جدید ذہنی تبدیلیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ البتہ ان تبدیلیوں کو جن اخلاقی حدود کا پابند اور تہذیبی قدروں کا آئینہ دار دکھایا گیا ہے وہ دور قدیم کی خوبیاں ہیں۔ اس طرح جناب کشمیری لال ذاکر نے قدیم و جدید کے درمیان توازن وتعاون کی ایک اچھی کوشش کی ہے۔''

بلاشبہ ذاکر صاحب فکشن کے میدان میں ایک ممتاز و مستند فکشن نگار کی حیثیت سے ایک بلند مقام حاصل کر چکے تھے اور غالباً وہ ملک کے واحد افسانہ نگار اور ناولسٹ تھے جنھوں نے ملک کے لگ بھگ ہر اہم مسئلے اور واقعے کو اپنے دلپذیر ناول یا افسانے کی شکل میں پیش کیا ہے۔اور انھیں اس خوبی سے صفحۂ قرطاس پر بکھیرا ہے کہ بعض کے نقوش قاری کے دل و دماغ پر ثبت ہو کر رہ جاتے ہیں۔

ناولوں کے علاوہ انھوں نے لاتعداد افسانے بھی لکھے اور ان کے کئی افسانوی مجموعے اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ان میں جب کشمیر جل رہا تھا، اُداس شام کے آخری لمحے، بیریوں والا فقیر، ایک کرن روشنی کی، تجھے ہم ولی سمجھتے، چنار چنار چہرے، برف دھوپ چنار اور سمندری ہواؤں کا موسم وغیرہ شامل ہیں۔ ان مجموعوں کی کئی کہانیوں کی ادبی حلقوں میں بڑی پذیرائی ہوئی ہے اور وہ متعدد بار اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں...... آخری صدی کا سورج، افق، دوسرا مرد، شام بھی تھی دھواں دھواں، کورے تہمد کا درد، ڈریم لینڈ، پھولاں پتھیرن، ادھورے شہر کی ادھوری کہانی، ڈبل شفٹ وغیرہ ایسی کہانیاں ہیں جنھیں قارئین نے بہت پسند کیا اور محققین نے بھی ان پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور انھیں بے حد سراہا ہے۔ جیسے ممتاز نقاد و محقق پروفیسر قمر رئیس نے ان کے افسانوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

''اب سے نصف صدی پہلے جب کالج کا طالب علم تھا تو رسائل میں جن ادیبوں کی کہانیاں دلچسپی اور انہماک سے پڑھتا تھا ان میں کرشن چندر کے بعد عصمت چغتائی اور کشمیری لال ذاکر کے نام سب سے نمایاں تھے۔ اس وقت ذاکر صاحب کی عمر چالیس سال کے قریب رہی ہوگی۔ اتنا یاد ہے کہ ان کی کہانیوں میں عمل کی دلکشی اور روانی کے ساتھ انسانی دردمندی کا عنصر غالب رہتا تھا۔ اور آج جب وہ نوے سال کی عمر کو پہنچ رہے ہیں ان کے قلم اور تخلیقی سوچ کی رفتار میں فرق نہیں آیا ہے۔ فکشن کے میدان میں شاید آج وہ سب سے بزرگ اور سب سے قدآور ادیب ہیں۔ برصغیر ہندو پاکستان میں ان کے ناول اور کہانیاں یکساں طور پر مقبول ہیں۔ اہم بات یہ بھی کہ اتنی طویل عمر پا کر بھی وہ ذہنی اور تخلیقی انحطاط سے کوسوں دور ہیں۔ ان کے قلم میں زور ہے۔ گرد و پیش کے مسائل پر وہ مسلسل غور کرتے رہتے ہیں اور عملی زندگی میں بھی فعال ہیں۔''

اسی طرح اُن کے افسانوی مجموعے 'جب کشمیر جل رہا تھا' میں شامل فسادات سے متعلق لکھی کہانی 'اُفق' پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور افسانہ نویس بلونت سنگھ نے لکھا تھا کہ فسادات کی بابت جتنے افسانے لکھے گئے ہیں ان میں سے بہت کم اس کے مقابلے میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔

بلاشبہ ذاکر صاحب کی کہانیاں زندگی کی منہ بولتی تصویریں ہیں جنھیں انھوں نے اپنے پُر اثر الفاظ اور

فنکارانہ ہنت سے اس طرح سے پیش کیا ہے جیسے کسی مصور نے اپنا اچھوتا شاہکار پیش کیا ہو۔

اس میں شک نہیں کہ ذاکر صاحب کی اُردو ادب میں صحیح شناخت ایک نامور فکشن نگار کی حیثیت سے ہی رہی ہے مگر انھوں نے ناولوں اور افسانوں کے علاوہ ادب کی دیگر اصناف میں بھی اپنی علمی اور ادبی صلاحیت و بصیرت کے جوہر دکھائے ہیں۔ انھوں نے ایک شاعر کے طور پر اپنی شعری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ صحافت، خاکہ نگاری، ڈرامہ نگاری، رپورتاژ اور سفرنامے پیش کرکے بھی اہلِ اُردو سے داد و تحسین حاصل کی ہے۔ علاوہ ازیں ان کی اُردو تصانیف ہندی انگریزی اور پنجابی کے علاوہ بعض دیگر زبانوں میں بھی اشاعت پذیر ہوکر دیگر زبانوں کے اہلِ ادب سے بھی خراجِ تحسین پا چکی ہیں۔

ذاکر صاحب کی خاکہ نگاری سے متعلق کتابوں، اپنی ہواؤں کی خوشبو، نئی صبحوں کے سفیر، دردِ آشنا چہرے، نگینہ بیکری کا قلندر اور یارانِ تیزگام، کے مطالعے سے ہم پر بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ خاکہ نگاری کے فن پر اُن کی پوری پکڑ ہے اور انھوں نے اپنے احباب اور ادیبوں کے خاکے اس طرح تخلیق کیے ہیں جیسے وہ کسی مصور کے شاہکار ہوں، انھوں اپنے خاکوں کو اپنے پُر تاثیر الفاظ، منفرد اسلوب اور فنکارانہ ہنت سے زندۂ جاوید تصویریں بنا دیا ہے۔ انھوں نے راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، سنیل دت، فلمسٹار نرگس دت، قتیل شفائی، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر وغیرہ کے خاکے اس منفرد اسلوب و انداز میں پیش کیے ہیں کہ کہیں کہیں ان میں مختصر افسانے کا رنگ بھی جھلکنے لگتا ہے۔

فکشن کے علاوہ ذاکر صاحب نے شاعری کے میدان میں بھی اپنا سکہ جمایا ہے اور اپنی مسحور کن شاعری سے قاری کو اپنا گرویدہ بنالیا ہے اور اُن کے بعض اشعار تو قاری پر اپنے امٹ نشان چھوڑتے ہیں اور انھیں بار بار گنگنانے کو جی چاہتا ہے۔ اُن کے شعری مجموعہ 'شیشہ بدن خواب' کے دیباچے میں ممتاز و نامور محقق اور نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اُن کی شاعری پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے انھیں ایک اچھا شاعر قرار دیتے ہوئے اعتراف کیا ہے کہ:

''کشمیری لال ذاکر فکشن نگار تو بہت پہلے ہوئے اور دور دور تک ہیں (جتنی اُن کی عمر ہے، اُس سے بھی زیادہ کتابیں ان کی اُردو ہندی پنجابی میں نکل چکی ہیں) لیکن وہ شاعری بھی اس دھڑلے سے کرتے ہیں، اس کا اندازہ مجھے اُس روز ہوا جب وہ ایک فائل میرے یہاں پہنچا گئے جو اُن کے کلام پر مشتمل تھا۔ کیا لطافت اور رچاؤ اور سلاست اور روانی اُن کے کلام میں ہے۔ اس کا اندازہ پڑھنے کے بعد ہوا۔ روایت کا فیضان جاری و ساری ہے، جس شخص نے ساری عمر دشتِ ادب کی سیاحی میں گزار دی وہ شعر نہ کہنے لگے تو تعجب ہونا چاہیے۔ مشاعروں نے کتنوں کو شاعر بنا دیا اور ہمارے کشمیری لال ذاکر لاکھ فکشن نگار سہی، اصلاً جب تخلیق کی کسوٹی پر کسے گئے، تو شاعر نکلے۔''

ذاکر صاحب کی شاعری کے اسلوب و معیار سے متعارف کرانے کے لیے اُن کے کچھ منتخب اشعار پیش کیے جاتے ہیں جنھیں قارئین نے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور سراہا ہے:

تاریک مکانوں سے اُبھرتے ہوئے سائے
سورج کو بھی آنگن میں اترنے نہیں دیتے

—

یہ اور بات کہ آگے ہوا کے رکھے ہیں
چراغ جتنے ہیں سارے جلا کے رکھے ہیں

—

انھیں فسانے کہو، دل کی داستانیں کہو
یہ آئینے ہیں جو کب سے سجا کے رکھے ہیں

ذاکر صاحب کو میدانِ ادب میں اپنی تخلیقات پیش کرتے ہوئے زائد از پون صدی ہونے والی تھی اور وہ ایک سو کے قریب اپنی نگارشات پیش کر چکے تھے اور اب بھی دو تین سال قبل تک اُن کا اشہبِ قلم تیز رفتار سے تخلیقی سفر پر رواں دواں تھا اور وہ نوے سال کی عمر میں بھی نوجوانوں کی طرح مسلسل کئی کئی گھنٹے مسلسل لکھنے پڑھنے اور انتظامی امور کو نپٹانے میں مصروف رہتے تھے۔ وہ ہریانہ اردو اکادمی کے سیکریٹری کی حیثیت سے برسوں سے اپنی ادبی اور انتظامیہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے رہے اور انھوں

ذاکر صاحب کی اُردو ادب میں صحیح شناخت ایک نامور فکشن نگار کی حیثیت سے ہی رہی ہے مگر انھوں نے ناولوں اور افسانوں کے علاوہ ادب کی دیگر اصناف میں بھی اپنی علمی اور ادبی صلاحیت و بصیرت کے جوہر دکھائے ہیں۔ انھوں نے ایک شاعر کے طور پر اپنی شعری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ صحافت، خاکہ نگاری، ڈرامہ نگاری، رپورتاژ اور سفرنامے پیش کرکے بھی اہلِ اُردو سے داد و تحسین حاصل کی ہے۔

نے اپنی کاوش و استعداد سے اس اکادمی کو ملک کی چند برگزیدہ اکادمیوں کی صف میں کھڑا کردیا تھا۔ اُن کی جسمانی اور ذہنی قوت و صلاحیت کو دیکھ کر لوگ اُن پر رشک کرتے تھے اور اُن کی اس چستی اور پھرتی کو دیکھ کر دنگ رہ جاتے تھے۔ اُن کی موجودہ استعداد و صلاحیت کو دیکھتے ہوئے احباب توقع کرتے تھے کہ وہ اسی طرح مسلسل اپنے ادبی اور انتظامی امور کو بخوبی انجام دیتے ہوئے ایک صدی کا فاصلہ بڑی خوش اسلوبی سے طے کرلیں گے مگر افسوس ایسا نہ ہوسکا اور وہ 98 برس کی عمر میں ہی وہ ہم سے جُدا ہوگئے اور ہمارا اُن کی زندگی میں ہی بڑی شان و شوکت سے اُن کا صدی تقریبات منانے کا پروگرام شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔

ذاکر صاحب پر کئی یونیورسٹیوں میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے جاچکے ہیں اور لکھے جارہے ہیں لیکن ابھی بھی ناقدین و محققین نے ان پر وہ توجہ نہیں دی جس کی ضرورت ہے۔ انھوں نے ادب کے میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں انھیں تحقیقی اور تنقیدی کسوٹی پر مزید پرکھ کر ان کی ادبی کارگزاریوں کا مفصل تجزیہ و تحقیق کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

ذاکر صاحب کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں متعدد اداروں اور اکادمیوں نے انعامات و اعزازات سے نوازا، جن میں ہریانہ ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ (1969)، غالب ایوارڈ (1986) مجموعی ادبی خدمات پر پاکستان کا نیشنل نقوش ایوارڈ (1994) مجموعی خدمات پر عالمی پنجابی کانفرنس لاہور کا ایوارڈ (2005) پنجاب سرکار کی جانب سے شرومنی اُردو ساہتیہ ایوارڈ، اور حکومتِ ہند کا یونیسکو ایوارڈ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں صدر جمہوریہ ہند نے تعلیم اور ادب کے میدان میں اُن کی قابلِ قدر خدمات پر انھیں 29 مارچ 2006 کو 'پدم شری' اعزاز عطا کیا تھا۔

ذاکر صاحب نے اپنی طویل زندگی قابلِ تقلید اور شاہانہ انداز میں بسر کی جس پر لوگ حیرت و رشک کا اظہار کرتے تھے۔ اس کا احساس دوسروں کو ہی نہیں خود انھیں بھی تھا۔ جیسا کہ اپنے ایک شعر میں انھوں نے اپنے دور کے افراد کو مخاطب کرتے ہوئے بڑی شان و تمکنت سے کہا تھا:

کسی کو ہے بھی سلیقہ چمن میں جینے کا!
میں جس سکون سے بکھرا ہوں، کون بکھرے گا؟

■

Nand Kishore Vikram,
F-14/21 (D) Krishna Nagar New Delhi-51

شعیب رضا فاطمی

ادب کا آفاقی پیغام

پیغام آفاقی

پیغام آفاقی بھی داغ مفارقت دے گئے۔ وقتی طور پر مجھے بھی شدید جھٹکا لگا کیونکہ میں اس خبر کو سننے کے لیے تیار نہیں تھا لیکن رفتہ رفتہ جب دل سنبھلا اور میں جذباتی و ہیجانی کیفیت سے باہر آیا تو لگا کہ وہ جو گیا ہے اسے وقت سے پہلے جانا ہی تھا کیونکہ کوئی انسان خود کو کب تک دھوکہ دے سکتا ہے وہ مسلسل خود فریبی میں مبتلا رہا۔ اپنے نہایت قریبی دوستوں سے جھوٹ بولتا رہا کہ اسے کوئی مہلک مرض نہیں ہے اور وہ بہت جلد پوری طرح چاق و چوبند ہوکر میدان ادب میں ورود کرے گا۔ اسے اس لیے بھی مرنا تھا کہ اس نے اس سفاک معاشرے کے اصل خالق کا چہرہ دیکھ لیا تھا اور اسے اپنی تخلیق میں پیش کرنا شروع بھی کردیا تھا۔ اس کے سر میں یہ سودا تھا کہ جینوین تخلیق کار اس بدصورت معاشرے کو جنت کا نمونہ بنا سکتا ہے۔ اسے مرنا اس لیے بھی تھا کہ حق گوئی و بیباکی اس کا وطیرہ تھا اور وہ تخلیقی مشن کے دوران کسی قسم کی مصالحت کو ادبی شریعت میں کفر سمجھتا تھا۔ وہ مافیائی طرز فکر کو معاشرے کے ہر ادارے میں رواں دواں دیکھ رہا تھا۔ اس کے نزدیک دہشت گردی کی یہ نہایت معمولی مثال ہے کہ کوئی شخص یا گروہ دس بیس پچاس یا ہزار دو ہزار لوگوں کو ایک دھماکے سے اڑا دے۔ اس کے نزدیک سب سے بڑی دہشت گردی یہ تھی کہ لوگ زندگی بچانے والی دواؤں اور زندگی کے لیے سب سے ضروری شے 'ہوا'، 'پانی' اور 'کھانے' میں اپنے مالی منفعت کے لیے ایسی چیزیں شامل کردیں جن سے انسان تل تل مرنے پر مجبور ہوجائے۔ تعلیمی درس گاہوں میں ایسے لوگوں کا تقرر کردیا جائے جو نااہل ہوں اور پوری کی پوری نسل کو ناکارہ بنادیں۔ مذہبی ادارے ایسے لوگوں کے دستبرد کا شکار ہوجائیں جو کنفیوژ لوگ ہوں اور جو خالق باری سے خوف زدہ ہونے کی جگہ مخلوق کے رعب و دبدبہ کے شکار ہوجائیں۔ وہ معاشرے کی رگوں میں سرایت کرچکے ہر ایک زہر کا سراغ لگا چکا تھا اور اس کے نزدیک اس کا تریاق ادب اور صرف ادب تھا۔ اب آپ ہی بتائیں کہ ایسے شخص کا ہمارے موجودہ معاشرے میں کیا کام تھا؟

موت تو ہر ذی روح کا مقدر ہے لیکن کچھ لوگ اپنی زندگی کے ان چند برسوں میں اپنے مشاہدات کے ذریعے اس مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں سے دنیا انھیں بچوں کا کھیل نظر آنے ہے اور یہی مقام مقام دانشوری کہلاتا ہے۔ پیغام آفاقی کی تحریروں میں یہ دانشوری صاف صاف نظر آتی ہے۔ مجھے یاد ہے ایک بار ایک نجی گفتگو میں سپریم کورٹ کے کسی فیصلے پر رائے زنی کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا "سپریم کورٹ ہو یا آئین اسے عام انسانوں کے لیے تشکیل دیا گیا ہے لہٰذا اس کا کوئی بھی فیصلہ عام شہریوں کے مفاد کے خلاف نہیں ہوسکتا اور اگر ایسا ہوتا ہے تو پھر اس فیصلے اور آئین کی اس شق کو رد کردینا چاہیے۔" میں بہت دنوں تک ان کے اس جملے اور اس کو ادا کرتے وقت ان کے پراعتماد لہجے کے سحر میں گرفتار ہوکر یہ سوچتا رہا کہ کیا جمہوریت کی اس سے بہتر کوئی تعریف ہوسکتی ہے۔ ایک اردو چینل کے پروجیکٹ پر میں نے ان کے ساتھ کئی مہینوں تک کام کیا اس دوران یہ مشکل چار یا چھ گھنٹوں کے لیے ہم الگ ہوتے اس دوران میرا ان کی شخصیت کے کئی پہلوؤں سے سابقہ پڑا۔ ایک مدبر پیغام، ایک دانشور پیغام، ایک شاعر پیغام، ایک اسکرپٹ رائٹر پیغام، ایک مضبوط قوت ارادی کا مالک سفاک پیغام اور پھر نہایت کھلنڈرا پیغام۔ لیکن ان کی شخصیت کے ان تمام پہلوؤں سے مل کر جو شخصیت ہمارے سامنے تھی اس شخصیت سے دائمی جدائی کا تصور بھی جانکاہ تھا لیکن یہ میری بدنصیبی ہے کہ مجھے یہ دن بھی دیکھنا پڑا۔ پیغام آفاقی مجھ سے عمر میں دس بارہ برس بڑے تھے، پولیس آفیسر تھے، اردو فکشن کی دنیا میں 'مکان' جیسا ناول لکھ کر اپنا ایک مقام بنا چکے تھے جب ان سے میری ملاقات ہوئی تو انھوں نے جو مجھ پر شفقتوں کی بارش کی تو لگا کہ اس اجنبی اور نہایت سفاک شہر میں ایک چھتنار درخت نے اپنی تمام شاخوں کے سائے کو صرف میرے لیے وقف کردیا ہو۔ اس مہلک بیماری کے دوران ان سے کئی ملاقاتیں ہوئیں لیکن انھوں نے کسی ملاقات میں بھی مجھے یہ احساس نہ ہونے دیا کہ انھیں کوئی مہلک مرض ہے۔ ہر ملاقات میں وہ کسی نہ کسی پلان اور کسی نہ کسی مشن کی بات کرتے اور مجھے اس کی تیاری کے لیے کمربستہ ہوجانے کو کہتے۔ ان کے ذہن میں زبان و ادب کے

چوڑا پلان تھا کہ کبھی کبھی میں حیران ہوجاتا تھا کہ آخر یہ شخص ایک عمر میں اتنا کام کیوں کر کرے گا لیکن پھر ان کی خوداعتمادی اور لگاتار بغیر تھکے کام کرنے کی ان کی صلاحیت مجھے یہ باور کرنے پر مجبور کرتی کہ یہ شخص کسی نہ کسی دن کوئی بڑا دھما کہ ضرور کرے گا ایک ایسا ادبی دھماکہ جس کی گونج سے ایوانِ ترقی پسندی ہو یا جدیدیت یا پھر مابعد جدیدیت سب لرزتے ہوئے زمیں بوس ہوجائیں گے۔

پیغام آفاقی ایک تخلیق کار تھے۔ عام طور پر انھیں ایک فکشن رائٹر کے طور پر ہی پہچانا جاتا ہے لیکن وہ ایک شاعر بھی تھے اور یہ شاعری انھوں نے اس وقت کی تھی جب انھوں نے کہانیاں لکھنے کا آغاز بھی نہیں کیا تھا۔ سوال یہ نہیں کہ وہ پہلے شاعر تھے پھر ادیب بنے بلکہ ان کے وہ دوست یا قاری جنھوں نے ان کے شعری مجموعہ 'درندہ' کا مطالعہ کیا ہے ان کو اندازہ ہوگا کہ اس مجموعے میں جو بیشتر نثری نظموں پر مشتمل ہے کی شاعری میں جو فکری ضوفشانیاں ہیں وہی ان کی فکری اساس بھی ہیں اور ان ہی افکار کے بالیدہ ثمر ہمیں ان کے ناولوں اور کہانیوں میں نظر آتے ہیں۔ یعنی اس تخلیق کار نے اپنی راہ بہت پہلے متعین کرلی تھی۔ وہ بارہا کہتے بھی تھے کہ یہ نوکری جو میں کررہا ہوں صرف اس لیے ہے تاکہ معاشرتی ضرورتوں کی تکمیل میں کوئی دقت پیش نہ آئے اور سماج میں ایک وقار قائم رہے ورنہ تخلیق سے عشق کے بعد انسان پھر اپنے آپ میں کہاں رہتا ہے۔ وہ اردو زبان اور تہذیب کی کھوئی ہوئی تخلیقی قوت کو ادب کے ذریعے عالمی نقشے پر اجاگر کرنا چاہتے تھے۔ وہ مرتے ہوئے، سسکتے ہوئے، اجڑتے ہوئے گاؤں کو دیکھ کر آبدیدہ ہوجاتے تھے۔ ان کی ایک نظم 'شہر کے منارے سے' اس موضوع پر لکھی جانے والی نظموں میں شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ ان کی کہانیوں میں 'کھیت کی واپسی'، 'لوہے کا جانور' یا پھر 'ناریل کے پیڑ' آپ کو اس ایک نظم میں مل جائیں گے۔

مجھے یاد ہے 1998 یا 1999 کی ایک سرد شام تھی اور میں ان کے ساتھ تھا۔ ایک چینل کے پروجیکٹ پر گفتگو بہت طویل ہوگئی اور انھوں نے کہا کہ آج کی رات بہت مبارک ہے۔ ایسا لگتا ہے آج اس پروجیکٹ پر ہم لوگ ایک حتمی رائے قائم کرلیں گے اور ہوا بھی وہی اور وہ ایسے کہ اس رات ان کی ڈیوٹی دہلی کے مختلف پولیس اسٹیشنوں کو سرچ کرنے کی تھی۔ میں ان کے ساتھ ان کی گاڑی میں راستے بھر چینل کے سلسلے میں آنے والی دشواریوں پر بات کرتا رہا اور وہ ایک ایک سوال، ایک ایک مسئلے کو چٹکیوں میں حل کرتے رہے۔ راستے میں چائے بھی پی جاتی رہی۔ مجھ سے انھوں نے میری بہت ساری نظمیں سنیں اور بھرپور داد بھی دی۔ غالباً 5 بجے انھوں نے مجھے جامع مسجد ڈراپ کیا جہاں ان دنوں میں رہتا تھا اور پھر اسی دن دفتر میں انھوں نے میرے سامنے ایک بوسیدہ سی فائل پکڑادی جس میں مختلف کاغذوں پر ان کی تحریر نظمیں، غزلیں، اشعار، لخت لخت بکھرے پڑے تھے۔ اس فائل کی ایک نظم نے تو مجھے اس قدر متاثر کیا کہ

'موت کے سفاک پنجوں نے ہمارے درمیان سے ہمارا ایک نابغہ اچک لیا، ایک ایسا نابغہ جس کی تحریروں کے اندرون میں اتر کر اسے سمجھنے والی نسل تو اب بالغ ہورھی تھی۔ اس کے 'مکان' کی 'نیرا' کو یہ معاشرہ اب قبول کرنے لگا تھا اور اس 'نیرا' کا ساتھ دینے کے لیے لوگ اب راج پتھ پر ہزاروں کی تعداد میں نکلنے لگے تھے۔'

میں نے ان کے شعری مجموعے کو منظرِ عام پر لانے کا فیصلہ کرلیا۔ 'درندہ' اس نظم کا نام تھا اور پھر مجموعے کا نام بھی وہی ٹھہرا اور آخر 2001 میں وہ مجموعہ منظرعام پر آگیا۔ پیغام آفاقی کی آنکھوں میں چمک آجاتی تھی جب ان کی شاعری کی فکری اساس پر بات ہوتی تھی:

پرواز کرو ہر پر پرواز سے آگے
رکھنا ہے قدم وقت کی آواز سے آگے

یہ ان کا پسندیدہ شعر تھا اور اکثر وہ اسے دہراتے بھی تھے۔

نئی نسل سے پیغام بے انتہا محبت کرتے تھے اور اکثر ریسرچ اسکالرز کو اپنے گھر بلاتے تھے اور ان سے دیر تک ادبی گفتگو کیا کرتے تھے۔ ان کی ایک نظم مجھے بار بار یاد آرہی ہے جس کا عنوان ہی 'بچوں سے...!'' ہے:

شبِ تاریک میں امیدوں کے مرکز تم ہو
قافلے والوں کو رستہ ہے دکھانا تم کو
آج تاریک ہے دنیا اگر انسانوں کی
راہ میں تم کوئی قندیل درخشاں کردو
تم سے زینت ہے بہاروں کے گلستانوں کی
ماہ نو تم نہ ستاروں میں کہیں کھوجانا
تم کو دامن میں بلاتی ہے یہ پستی کی زمیں
تم مگر وسعتِ گردوں پہ درخشاں ہوجاؤ
تم کو پانے کے لیے پھر چلے انساں کا ہجوم
ماہِ نو تم نہ کناروں میں کہیں کھوجانا
ماہِ نو تم نہ ستاروں میں کہیں کھوجانا

آج وہ خود خلا کی بیکراں وادی میں اپنے حصے کی دھوپ سمیٹے کھوگیا ہے۔ اب ہمارے پاس صرف اس کی تحریریں ہیں وہ تحریریں جن پر ان کو بہت اعتماد تھا۔ تحریر کی اور تخلیق کی قوت کے کئی تاریخی واقعات وہ اکثر سناتے تھے۔

لیکن.. افسوس صد افسوس... ' موت کے سفاک پنجوں نے ہمارے درمیان سے ہمارا ایک نابغہ اچک لیا، ایک ایسا نابغہ جس کی تحریروں کے اندرون میں اتر کر اسے سمجھنے والی نسل تو اب بالغ ہورہی تھی۔ اس کے 'مکان' کی 'نیرا' کو یہ معاشرہ اب قبول کرنے لگا تھا اور اس 'نیرا' کا ساتھ دینے کے لیے لوگ اب راج پتھ پر ہزاروں کی تعداد میں نکلنے لگے تھے۔ ابھی تو پیغام کے دوسرے ناول 'پلیتہ' کو لوگ پوری طرح پڑھ بھی کہاں پائے تھے۔ نئی نسل کو ابھی یہ سمجھنا باقی تھا کہ دورِ غلامی میں دیا جانے والا 'کالا پانی' کی سزا آج بھی برقرار ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ جزیرۂ انڈمان کے اطرافِ سمندر کا پانی اب بحرِ عرب کے پانی سے ہم آمیز ہوگیا ہے اور یہ پورا خطہ انڈمان نکوبار بن گیا ہے۔ ابھی تو حالات میں بس اتنی تبدیلی آئی ہے کہ حکومت یا مافیا مخالف کسی تحریر کو شائع کرنے کے لیے صرف پبلشر کی محتاج نہیں رہی، اب لوگ اپنی تحریروں کو ہوا کے شانے پر سوار کرکے پوری دنیا میں مشتہر کردیتے ہیں۔ ابھی چند مہینے پہلے ہی تو پیغام نے اوارڈ مافیاؤں کے خلاف فیس بک پر ایک مہم کا آغاز کیا تھا اور ساری دنیا سے حق دوستوں کی ایک بڑی تعداد نے ان کے خیالات کی تائید شروع کی تھی۔ سب کچھ ویسے کا ویسا ہی ہے فرق صرف یہ ہوا کہ اب ہمارے درمیان سے پیغام آفاقی ہمیشہ ہمیش کے لیے چلے گئے۔ وہ ہمیں اب صرف یاد آئیں گے اس وقت بھی جب ہم کسی ذہنی الجھن کا شکار ہوں گے۔ اس وقت بھی جب جدید ٹیکنالوجی کا سہارا لے کر بونی تحریروں کو اعلیٰ درجے کی تحریر قرار دینے کی کوشش ہوگی۔ اس وقت بھی جب ادب کے نام پر بے ادبی پھیلانے کی کوشش ہوگی اور مخربِ اخلاق تحریروں کے ذریعے نوجوان نسل کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ 'مکان' کی 'نیرا' ہو یا 'پلیتہ' کا 'خالد' جب کبھی معاشرے میں سرایت کرچکے زہر کا تریاق اپنی جدوجہد کو بنائیں گے اور سفید پوشوں کے کریہہ چہرے سے نقابِ شرافت اتاریں گے تو پیغام آفاقی ہمیں ضرور یاد آئیں گے۔

■

Mr. Shoaib Raza Fatmi
J-47/48, Top Floor , New Seelampur
Delhi - 110053
Mob.: 9968778671

ماہر لسانیات نوم چومسکی

اقتدار حسین خاں

لسانیات کے طلبا اور ماہرین تو چومسکی کے نام سے اچھی طرح واقف ہیں ہی، لیکن آج دنیا کا شاید ہی کوئی ملک ہو جہاں کے دانشور اور تعلیم یافتہ طبقے چومسکی کے نام سے واقف نہ ہوں۔ چومسکی کے نظریات اور فکر نے علمی اور تحقیقی دنیا کے کئی میدانوں کو متاثر ہی نہیں کیا ہے بلکہ ایک انقلاب آفریں رخ دے دیا ہے۔ اگرچہ چومسکی کی عالمگیر شہرت بنیادی طور سے ان کے لسانیات میں زبردست تحقیقی کارناموں کی وجہ سے ہے، لیکن ان کی فکر و تحقیق نے کئی مضامین میں نہایت اہم تصورات کا اضافہ کیا ہے۔ ادراکی نفسیات، حیاتیاتی سائنس، فلاسفی، منطق، نیروسائنس (Neuroscience) اور کمپیوٹر سائنس وغیرہ میں تحقیق کی نئی سمتوں اور امکانات کی نشاندہی کی ہے۔ چومسکی کی عالمگیر شہرت محض علمی کارناموں تک محدود نہیں ہے بلکہ انھوں نے سیاسی اور سماجی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔

چومسکی کو مختلف کارناموں اور کامیابیوں کے لیے نیویارک ٹائمز نے ''آج دنیا کا سب سے اہم دانشور'' بتایا ہے۔ ذیل میں چومسکی کے کارناموں کو الگ الگ عنوانات کے تحت بیان کیا گیا ہے تاکہ ان کی علمی فضیلت اور دانشورانہ عظمت کی مناسب عکاسی ہو سکے۔

ابتدائی دور اور لسانیات

اورم نوم چومسکی (Auram Noam Chomsky) سے دسمبر 1928 کو امریکی شہر فلی ڈلفیا کے ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئے۔ گھر کے ماحول کے مطابق انھوں نے پہلے عبرانی سیکھی اور بعد میں اسی زبان کی قواعد بھی مرتب کی۔ چومسکی کو ہر قسم کی کتابیں پڑھنے کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ اسکولی تعلیم کے بعد 16 برس کی عمر میں انھوں نے پن سلوینیا یونیورسٹی سے گریجویٹ کیا جہاں ان کے مضامین فلاسفی، منطق اور عربی بھی تھے۔ اپنے تعلیمی اخراجات میں خود کفیل ہونے کے لیے چومسکی نے جزوقتی عبرانی زبان کی تدریس بھی کی۔ 1947 میں چومسکی نے لسانیات کے مشہور پروفیسر زیلگ ہیرس

(Zellig Harris) سے لسانیات کے درس لیے۔ یہاں سے ان کی دلچسپی لسانیات میں فروغ پانے لگی۔

1949 میں چومسکی نے کیرول شاٹز (Carol Schatz) سے شادی کی جو خود ایک مشہور محقق تھیں۔ ان کی تین اولادیں ہوئیں۔ (2008 میں کیرول کا انتقال ہوا)۔

1951-55 کے دوران چومسکی ہارورڈ یونیورسٹی میں 'تبادلی قواعد' پر کام کرتے رہے جس پر انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل ہوئی۔ 1955 سے چومسکی امریکہ کی مشہور یونیورسٹی مشاشوٹ انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی (Massachusett Institute of Technology) (MIT) سے منسلک ہوگئے جہاں انھوں نے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے اپنا تدریسی و تحقیقی سفر شروع کیا۔ یہیں وہ 29 سال کی عمر میں ایسوسی ایٹ پروفیسر اور 32 سال کی عمر میں مکمل پروفیسر ہوگئے۔ MIT سے چومسکی آج تک جڑے ہوئے ہیں۔

1957 کا سال لسانیات کی دنیا میں ایک سنگ میل ثابت ہوا۔ اس سال چومسکی کی وہ معرکۃ الآرا اور سنسنی خیز کتاب شائع ہوئی جس نے لسانیات میں ایک انقلاب برپا کردیا یعنی Syntactic Structure۔ ابھی تک

> ”
> **لسانیات میں چومسکی کا ایک اہم تصور سلسلۂ مراتب ہے جس کو Chomsky's Hierarchy بھی کہا جاتا ہے۔ اس تصور کے مطابق زبان کے جملوں کو قواعد کی پیچیدگی کے لحاظ سے مختلف زمروں میں منقسم کیا جانا چاہیے۔ اس تصور سے کمپیوٹر سائنس نے بھی استفادہ کیا ہے۔**
> “

لسانیات کے طلبا اور اسکالرز 'ساختیاتی لسانیات' کے ماڈل پر سہل پسندی سے اور محض خانہ پری کے لیے اپنے کام میں مگن تھے۔ یہ لوگ بلوم فیلڈ، سپیر اور ہاکٹ وغیرہ کی پیروی میں کسی نہ کسی زبان پر تجزیاتی کام کرنے میں منہمک تھے۔ Syntactic Structure کی اشاعت نے تحقیق کا رخ ہی موڑ دیا جس نے 'تبادلی قواعد' کا ایک تروتازہ اور دلچسپ نظریہ پیش کیا۔

یہ بات قابل غور ہے کہ 1950 کی دہائی میں امریکہ کے مشہور ماہر نفسیاتی اسکنر (B.F.Skinner) کا طرز عمل کا تصور (Behavio urism) لسانیات کے لیے بھی مشعل راہ بنا ہوا تھا۔ لسانیات، نفسیات، فلاسفی وغیرہ ایسے علوم ہیں جن کے مسائل و مواد ایک دوسرے سے بڑی حد تک مشترک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسکنر کے تصور نے لسانیات کو بھی متاثر کیا۔ اسکنر کے مطابق بچے اپنی مادری زبان 'محرکہ۔ردِ عمل' (Stimulus-Response) یعنی مشاہدے اور تجربے سے سیکھتے ہیں۔ یہ تصور اسکنر کی 1957 کی کتاب (Verbal Behaviour) میں پیش کیے گئے تھے۔ چومسکی نے 1959 میں اسکنر کے اس نظریے پر ایک جامع تبصرہ کیا جو لسانیات کے مشہور جریدہ Language میں شائع ہوا جس میں چومسکی نے اسکنر کے مفروضوں اور دلائل کو کلی طور سے مسمار کردیا۔ چومسکی نے انسان کی تخلیقی صلاحیت پر زور دیا۔ بچے رٹنے یا نقل کرنے سے نہیں بلکہ اپنی خداداد تخلیقی قوت سے اپنی زبان کی قواعد 'مرتب' کرلیتے ہیں جس کی مدد سے وہ لاتعداد، نئے نئے جملے بول سکتے ہیں۔ انسان کے دماغ میں زبان سیکھنے کا قدرتی آلہ (Language Acquisition Device) ہوتا ہے اور وہ اپنے ماحول کی مدد سے اپنی سعی اور کوشش سے (Non- Instinctively) زبان سیکھتا ہے۔ جبکہ جانور اپنی زبان (اشارے یا Signals) قدرتی طور سے (Instructively) سیکھتے ہیں۔ چومسکی کا کہنا ہے کہ جانوروں پر کیے گئے تجربوں سے اخذ کیے گئے نتائج کا اطلاق انسان پر نہیں ہوسکتا۔ نفسیات کے ماہرین نے جو اکتسابی تجربات کیے وہ عموماً جانوروں پر ہی کیے گئے تھے پولوف (Paolou) نے کتوں پر، اسکنر نے کبوتر اور چوہوں پر، کوفکا اور کوہلر (Koffka & Kohler) نے بندروں پر تجربات کیے۔ Syntactic Structure کی اشاعت نے لسانیات میں تو ایک انقلابی تبدیلی کی ہیں، لیکن نفسیات، فلاسفی، نیرو سائنس (Neuroscience) اور کمپیوٹر سائنس تک کو نئی راہوں اور نئے امکانات کی طرف متوجہ کیا۔

چومسکی کے نظریے کو مختلف ماہرین اور ناقدین نے مختلف کسوٹیوں پر جانچا اور اس کی خامیوں اور کمزوریوں کی نشاندہی بھی کی۔ چومسکی نے ان تنقیدوں کی روشنی میں اپنے ماڈل کے سدھار کے لیے نئی تجاویز پیش کیں اور کئی تصانیف میں اپنے ماڈل کو مکمل کرنے اور قابل قبول بنانے کی کوشش کرتے رہے۔

چومسکی کا کہنا ہے کہ لسانیات کے لیے جو بہترین اور حتمی مقصد (Goal) ہوسکتا ہے وہ ایسے اصولوں کی شناخت کرنا ہے جو دنیا کی ہر زبان پر صادق اور مشترک ہوں۔ چومسکی نے ان اصولوں کو 'عالمگیر قواعد' کا نام دیا ہے۔

لسانیات میں چومسکی کا ایک اہم تصور سلسلۂ مراتب

> ”
> **چومسکی نے انسان کی تخلیقی صلاحیت پر زور دیا۔ بچے رٹنے یا نقل کرنے سے نہیں بلکہ اپنی خداداد تخلیقی قوت سے اپنی زبان کی قواعد 'مرتب' کرلیتے ہیں جس کی مدد سے وہ لاتعداد، نئے نئے جملے بول سکتے ہیں۔**
> “

ہے جس کو Chomsky's Hierarchy بھی کہا جاتا ہے۔ اس تصور کے مطابق زبان کے جملوں کو قواعد کی پیچیدگی کے لحاظ سے مختلف زمروں میں منقسم کیا جانا چاہیے۔ اس تصور سے کمپیوٹر سائنس نے بھی استفادہ کیا ہے۔

1990 میں چومسکی نے 'اقل ترین پروگرام' پیش کیا۔ اس (Minimalist Programme) میں انھوں نے نہ صرف لسانیات میں استعمال ہونے والی اصطلاحاتی زبان کو سلیس اور آسان بنانے کی سفارش کی ہے بلکہ یہ بھی کہا کہ 'معنی' اور آوازوں (زبان کی) کے رشتوں کو کم سے کم اہلیتوں (Faculties) کی مدد سے زبان کے نظام کو دریافت کرنے کا ہدف بنایا جائے تاکہ دماغ کے اس طریقۂ کار کو سمجھا جاسکے جس سے دماغ زبان کی قواعد مرتب کرتا ہے۔

چومسکی نے لسانیات کو ادراکی نفسیات یا (Cognitive Psychology) کا حصہ بتایا۔ اس بات پر بھی زور دیا کہ لسانیات ایک قدرتی سائنس (Natural) ہے جس کو حیاتیاتی لسانیات (Biolinguistics) بھی کہنا چاہیے۔ کیونکہ انسانی زبان کی تشکیل دماغ کی نوعیت کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مشہور ماہر لسانیات جان لیوس (John Lyous) کے مطابق "چومسکی کی 1957 کی تصنیف نے لسانیات میں تحقیق و مطالعے نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔"

1984 میں میڈیسن کے نوبل انعام پانے والے سائنس داں جیرین (Niel K. Jerene) نے اپنے نوبل لکچر کا عنوان "The generative grammar of immune system" رکھا جس میں چومسکی کے تخلیقی قواعد کے نظریے کو استعمال کیا۔

چومسکی کے لسانیاتی کام صحیح معنوں میں انقلاب آفریں کام ثابت ہوئے۔

اعزاز و انعامات

1980 تک چومسکی عالمگیر شہرت کے مالک بن چکے تھے۔ ان کے پاس دنیا بھر سے توسیعی خطبات اور

اعزاز و انعامات کے لیے دعوت نامے آتے رہتے ہیں۔ مختلف ممالک کے عوام و تنظیموں نے جن انعامات و اعزازات سے نوازا ہے اس کی فہرست بہت طویل ہے۔ ذیل میں صرف اہم خطبات و اعزازات کی نشاندہی کی گئی ہے۔

چومسکی نے جو مشہور لکچر دیے ہیں:

1969 میں آکسفرڈ یونیورسٹی میں جان لاک (John Locke) لکچر۔

1971 میں کیمبرج یونیورسٹی میں برٹرینڈ رسل میموریل لکچر

1972 میں دہلی یونیورسٹی میں نہرو میموریل لکچر۔

1977 میں لیڈن (Leiden) یونیورسٹی اور 1978 میں کولمبیا یونیورسٹی میں ووڈبرج (Woodbridge) لکچرز

1979 میں اسٹینفورڈ (Stanford) یونیورسٹی میں کانت (Kant) میموریل لکچر۔

1988 میں ٹورینٹو (Toronto) یونیورسٹی میں ماسے (Massey) لکچرز۔

1997 میں ڈیوی میموریل لکچر کیپ ٹاؤن میں۔

2001 میں نئی دہلی میں لکڑوالا (D.T. Lakdawala) میموریل لکچر۔

2002 اور 2003 میں برازیل میں ورلڈ سوشل فورم میں لکچرز۔

2011 میں رکمین گولڈی لکچرز یونیورسٹی کالج لندن میں۔

لندن اور شکاگو یونیورسٹیوں نے چومسکی کو 1967 میں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔ 1972 میں دہلی یونیورسٹی نے ان کو ڈی لٹ کی ڈگری عطا کی۔ 1973 میں ان کو ان کی اپنی یونیورسٹی MIT نے اعزازی ڈگری سے سرفراز کیا۔ کلکتہ اور وشو بھارتی یونیورسٹیوں نے اعزازی ڈگریاں دیں۔ ایشیاٹک سوسائٹی نے چومسکی کو رابندر ناتھ ٹیگور صدی ایوارڈ سے نوازا۔

1984 میں امریکہ کی نفسیاتی انجمن نے نفسیاتی ژرف نگاہی کے لیے چومسکی کو انعام سے نوازا۔

1988 میں 'بنیادی سائنس' میں نمایاں کارکردگی کے لیے کیوٹو (Kyoto) انعام ملا۔

1986 اور 1988 میں (دوبار) Gustavus Myers انعام دیا گیا۔

1987 اور 1989 میں (دوبار) عوامی زبان میں ایمانداری اور سلاست کے لیے جارج آرویل (George Orwell) انعام ملے۔

1999 میں کمپیوٹر اور ادراکی سائنس میں کام کے لیے بینجمن فرینکلن تمغا۔

2004 میں جرمنی میں سیاسی بصیرت اور ذرائع ابلاغ پر کام کے لیے انعام۔

2008 میں آئرلینڈ کی یونیورسٹی نے انعام دیا۔

2010 میں جرمنی کا ایرک فروم (Erich Fromm) انعام۔

2003 میں مشہور اداکار ویگو (Viggo Mortensen) اور گٹار ماسٹر بکٹ ہیڈ (Buckethead) نے اپنا نیا البم چومسکی کے نام (Dedicate) کیا۔

2005 میں ایک گلوبل تنظیم (Global Intellectual Poll) نے چومسکی کو دنیا کا سب سے بڑا

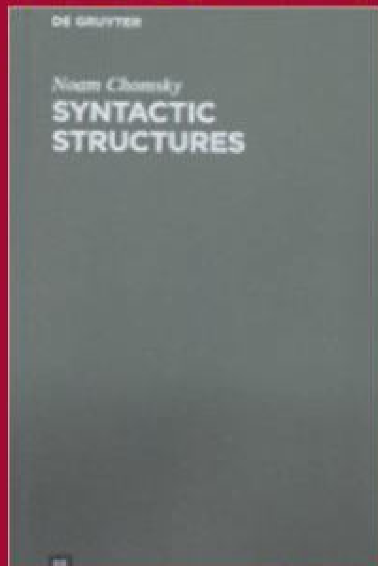

'عوامی دانشور' منتخب کیا۔

2007 میں جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی نے اپنی ایک عمارت کا نام چومسکی کے نام پر رکھا۔

جنوری 2010 میں MIT نے چومسکی کے اعزاز میں ایک موسیقی کی تقریب (Concert) کا انعقاد کیا جس میں چومسکی مع اپنے اہل خانہ اور دوستوں کے شریک ہوئے۔

2011 میں چومسکی کو سڈنی پیس پرائز (Sydney Peace) سے سرفراز کیا گیا۔

چومسکی پر کئی ڈوکیومنٹری فلمیں بھی بن چکی ہیں۔

1970 میں لندن ٹائمز نے چومسکی کو ''بیسویں صدی کا ایک عظیم تشکیل کنندہ (Maker)'' بتایا۔ مزید یہ بھی کہا کہ وہ منحرف طبقے کے لیے ایک روشن خیال قائد اور منبع بنے ہوئے ہیں۔''

فریڈ ہلیڈے (Fred Halliday) مشہور کالم نگار کے خیال میں ''اکیسویں صدی کے آغاز ہونے تک چومسکی دنیا کے تمام سرمایہ دار و سامراج مخالف تحریکوں کے گرو بن چکے تھے۔''

چومسکی کی سوانح عمری کے مصنف اسپرلش (Sperlich) کا کہنا ہے کہ چومسکی آج کے دور کے سب سے عظیم عوامی سورما (Champion) ہیں۔''

ارون دھتی رائے۔ ہندوستان کی مشہور ناول نگار اور سماجی کارکن ہیں۔ ان کے مطابق ''چومسکی ہمارے دور کے سب سے اعلیٰ اور سب سے انقلابی عوامی مفکر اور فلاسفر ہیں۔''

MIT نے 1992 میں ایک پریس ریلیز میں یہ اطلاع دی کہ جدید تاریخ میں 92-1980 کے دوران جن عالموں اور دانشوروں کا سب سے زیادہ حوالہ دیا گیا ہے ان میں سے ایک چومسکی بھی ہے۔''

اختتامیہ

چومسکی انتہائی مصروف زندگی گزارتے ہیں۔ مختلف موضوع پر کتب بینی اور چار پانچ اخبار روز پڑھنا ان کے معمول میں شامل ہیں۔ اب تک لسانیات اور دیگر موضوعات پر 200 سے زائد کتابیں تصنیف کر چکے ہیں۔ خود ان پر اور ان کے کام پر ہزاروں کتابیں شائع ہو چکی ہیں جس میں دو سوانح عمری (Biographies) بہت مشہور ہیں۔ ایک رابرٹ بارسکی (Robert Barsky) کی اور دوسری اسپرلش (Wolfgang B. Sperlich) جو 2006 میں شائع ہوئی۔ چومسکی کی تصانیف لاکھوں کی تعداد میں چھپتی ہیں اور دنیا بھر میں فروخت ہوتی ہیں۔

چومسکی نے اپنی تصانیف، انٹرویوز، انعامات اور لکچرز وغیرہ سے لاکھوں ڈالر کمائے۔ وہ ایک شاہانہ لیکن ذمے دارانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ 2008 میں چومسکی کی پہلی شریک حیات کا انتقال ہو گیا تھا۔ 2014 میں چومسکی نے دوسری شادی ویسرمین (Valera Wassermen) سے کی۔ ان کا علمی اور احتجاجی درخشاں سفر آج بھی اپنی روایتی توانائی و تابانی کے ساتھ سیل رواں بنا ہوا ہے۔ ان کی تازہ ترین تصنیف Who Rules the World (2016) ہے۔

وقت کے ساتھ ان کی قدر و منزلت میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔

■

Prof. Iqtedar H. Khan
4/757, Gulzar-e-Mahmood
Friends Colony, Civil Lines
Aligarh - 202002 (UP)

اعجاز حسین اعجاز

سید علی حیدر

ڈاکٹر اعجاز حسین، اعجاز اپنے وقت کے معروف اور ہر دلعزیز شاعر تھے۔ ان کے اشعار پر اکثر اساتذہ کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے۔ اُن کی شاعری میں ایک طرف آتش کی مرصع سازی اور غزل کا بانکپن ہے تو دوسری جانب ناسخ کی تازہ گوئی وصنعت کاری کی جھلکیاں ہیں۔ اعجاز حسین کے کلام کا مجموعہ آج تک شائع نہ ہوسکا مگر جتنے اشعار لوگوں کے حافظے میں محفوظ ہیں یا گھر میں بیاض کی زینت ہیں اُن سے اعجاز حسین کی شاعری میں نئی دنیا اور نئی فضا کا احساس ہوتا ہے۔

شعری محفلوں اور مجلسوں میں اُن کی آمد تازگی اور شگفتگی کا پیغام لاتی تھی اور انھیں مشاعروں میں وہی پرخلوص تعظیم و احترام اور مقبولیت حاصل ہوتی جو اس وقت کے کسی بڑے سے بڑے شاعر کو حاصل تھی چاہے وہ جوش ملیح آبادی ہوں یا فراق گورکھپوری یا کوئی اور۔

اعجاز حسین کو شعر وسخن کی دولت وراثت میں ملی تھی۔ اُن کے نانا میر سید حسین جنھوں نے ان کی پرورش کی تھی اپنے وقت کے الہ آباد کے معروف شاعروں میں تھے۔ فوق تخلص کرتے تھے اور معنوی سلسلے کے اعتبار سے دبستان آتش سے وابستہ تھے۔ شعر وشاعری کے چرچے برابر اُن کے گھر میں رہا کرتے جس نے اعجاز حسین کے شعری ذوق کی نمو کی اور مزاج و مذاق کی شاعرانہ تشکیل میں موثر کردار ادا کیا۔ کم عمری میں ہی شاعر اعجاز کا شعری ذوق نمایاں ہونے لگا۔

اردو میں شعرگوئی، شعرفہمی اور شاعرنوازی سماجی اور تہذیبی زندگی میں بلندیٔ ذوق کی نشانی تصور کی جاتی تھی۔ فن شعرگوئی جاگیردارانہ سماج میں اشرافیہ کے لیے ناگزیر رہا۔ اعجاز حسین کی پرورش جاگیردارانہ معاشرے میں ہوئی جس کے اثرات ان کی نثرنگاری اور شاعری دونوں پر نمایاں ہوئے۔

اعجاز حسین کا شمار اپنے وقت کی بلند پایہ شخصیات میں ہوتا تھا۔ انھوں نے نہ صرف اپنی ادبی نگارشات بلکہ اپنے نامور شاگردوں کی کثیر تعداد سے اردو ادب کی تاریخ میں اپنی غیر معمولی شناخت بنائی۔ وہ اپنے زمانے کے نامور نقاد، معتبر ادبی مورخ، نکتہ رس سوانح نگار، اچھے صحافی، اعلیٰ درجے کے ڈرامانگار، کامیاب مترجم اور عمدہ ہر دلعزیز شاعر تھے۔

اعجاز حسین اس کے ساتھ ایک بے پایاں شفیق استاد بھی تھے اور بقول پروفیسر احتشام: ''شاگرد عزیزوں سے بڑھ کر انھیں محبوب تھے۔'' (میری دنیا: اعجاز حسین، آغاز احتشام حسین، ص 3)

جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ عظیم فن کار وہ ہے جس کی ہر تصنیف پچھلی سے بہتر ہو، اور جو اپنی بعد کی نسل کی پرورش کرے، اعجاز حسین اس قول پر پوری طرح کھرے اترتے ہیں۔ ان کی اہم تصانیف میں مختصر تاریخ ادب اردو (1934)، نئے ادبی رجحانات (1939)، اردو ادب آزادی کے بعد (1960)، اردو شاعری کا سماجی پس منظر (1968)، سب پچھلی تصنیف سے بہتر شمار ہوئیں اور ان کی بعد کی نسل کی پرورش میں احتشام حسین، ممتاز حسین، وقار عظیم، سید محمد عقیل، شمیم حنفی، فضیل جعفری جیسے نامور ادیب و ناقد اردو ادب کی آبرو قرار پائے اور اعجاز حسین کے عظیم فنکار ہونے پر مہر ثبت کی۔

اعجاز حسین نثر وشعر دونوں میں صاف، ستھری اور بہ آسانی سمجھ میں آنے والی سادہ زبان رکھتے ہیں۔ وہ حالی کی غزل گوئی پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حالی نے میر و غالب کے انداز بیان اور شیفتہ کی سادگی کو یکجا کردیا ہے۔''

(میری دنیا: اعجاز حسین، آغاز: احتشام حسین، ص 3)

اعجاز حسین اعجاز کی غزل گوئی پر یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ انھوں نے حالی کی اس خوبی کو اپنے یہاں بھی برتا ہے۔ اعجاز حسین کے کلام میں حسن تخیل، ندرت فکر، اور تجربات کی رنگارنگی میں رعنائیوں کی کہکشاں سمیٹ آئی ہے جس میں شگفتگی اور تازگی کے ساتھ زندگی آمیز حسن ہے۔ ملاحظہ ہو:

قبائے لالہ و گل میں جھلک رہی تھی خزاں
بھری بہار میں رویا کیے بہار کو ہم

سنبھل سکے تو سنبھالو، امید کی کشتی
خدا کو دیکھ چکے، زور ناخدا معلوم

صدائے اہل نظر ہے یہ دور ہستی میں
وہ سدِ راہ ہیں، جن سے چلا نہیں جاتا

ماضی ہے اک خواب سنہرا، مستقبل صحرائے خیال
حال ہے وہ سنگین حقیقت، جو دنیا کہلاتی ہے

سفر حیات بھی ختم ہے کہیں زندگی کا نشاں نہیں
ابھی اور مڑ کے میں دیکھتا، میرے بس میں عمر رواں نہیں

اعجاز حسین الہ آباد یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر تھے۔ تدریسی ذمے داریاں دیگر مطالبات رکھتی ہیں۔ شاعر کے مزاج کی وارفتگی میں شوق بے پایاں کا مداوا ملتا ہے۔ اس کے برعکس درس وتدریس، استاد وشاگرد، اور تعلیم و تعلم کی دنیا ہی مختلف ہوتی ہے جہاں ہر طرح کی وارفتگی سے دامن بچائے رکھنا ہوتا ہے۔

اُن کے کلام کے مطالعے کے دوران اکثر یہ سوچنا پڑتا ہے کہ اگر اعجاز صاحب صرف شاعر ہوتے تو کس دبستان شاعری سے وابستہ ہوتے؟ موجودہ صورت حال میں اُن کا کلام محفوظ نہیں رہ گیا ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں اشاعت کے لیے اپنا کلام جن کے سپرد کیا تھا

وہ آج تک شائع نہیں کر سکے۔ اُن کے کلام کا وہ حصہ جو لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ ہے اور جو شاگردوں اور احباب کے پاس دستیاب ہے اُسی سے شاعر اعجاز کی شاعرانہ حیثیت پر گفتگو کی جاسکتی ہے۔

اعجاز حسین کے نانا فوق معنوی سلسلے کے اعتبار سے دبستان آتش سے وابستہ تھے لیکن اعجاز حسین اعجاز اپنے استاد شیخ مہدی حسن ناصری کی پیروی میں ناسخی تھے۔ ناسخ نے دہلی کے علی الرغم اردو غزل کی نئی روایت قائم کی تھی۔ اعجاز حسین کی شاعری میں آتش کا بانکپن، تصوف کی چاشنی اور مرصع سازی کے ساتھ ایک نئے پن کا احساس بھی ہوتا ہے۔ جہاں صحت زبان و بیان اور صنائع و بدائع کی خوبیاں انھیں ناسخ سے قریب کرتی ہیں۔ اعجاز حسین پر ترقی پسند تحریک کے اثرات بھی کام کرتے ہیں اس لیے کہ وہ تحریک کے بنیاد گزاروں میں بھی تھے۔ اسی لیے اعجاز حسین نے شاعری میں بھی ان نئے رویوں کو برتا اور اپنی بے پایاں تخلیقی قوت سے اپنے کلام میں نشتریت، والہانہ پن اور ابلاغ کی تہہ داریاں دکھائیں۔ پروفیسر سید محمد عقیل لکھتے ہیں:

''اعجاز صاحب زندگی بھر ترقی پسند ادبی نظریے کے حامل رہے... بے حد لبرل اور آزاد منش انسان تھے۔ وہ اصلاً کلاسیکی مزاج کے ادیب تھے۔ یہی اُن کے زمانے کا مزاج و مذاق تھا۔'' (قمر رئیس: ترقی پسند ادب کے معمار، جلد اوّل، ص 136)

اعجاز حسین کے کلام میں اس رویے کی قدم قدم پر نمائندگی ہے۔ اُن کے یہاں ترقی پسند اثرات کی تازہ کاری بھی ہے اور کلاسیکی مزاج کا سوز و گداز، شائستگی اور رچاؤ بھی، جہاں جذبے کی شدت میں دل کو چھو لینے کی کیفیت موجود ہے۔ ملاحظہ ہو:

غمِ دوراں پہنچ آیا، غمِ جاناں کے قریب
آخر آہی گیا ہالہ مہِ تاباں کے قریب
کشتیِ عمر بہی جاتی ہے اپنی رَو میں
کبھی ساحل کے قریب اور کبھی طوفاں کے قریب

مری حیات کا افسانہ دیکھنے والو
کہیں کہیں سے یہ قصہ پڑھا نہیں جاتا

ہم کو تم آواز دے لینا بشرطِ زندگی
ڈوبنے والو، جو بحرِ غم میں ساحل دیکھنا

ہجومِ غم سے گھبرا کر کسی کا خودکشی کرنا
یہ دھبہ رہ گیا، دامانِ اربابِ محبت پر

دل و جاں کے بدلے میں کیا ملا یہ سوال اہلِ ہوس نہ کر
یہ عشق عالمِ کیف ہے، یہ دیار سود و زیاں نہیں
نہ یہ بے ستوں ہے نہ طور ہے تری جلوہ گاہ ضرور ہے
تو مٹا کے دل کو بھی دیکھ لے کہ یہ مٹنے والا مکاں نہیں

اعجاز حسین کی شاعری کی ابتدا بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے تمام ہوتے ہوتے ہوئی۔ وہ زمانہ ملک کی آزادی کی لڑائی کے اہم موڑ کا تھا اور اسی زمانے میں ترکی، روس اور ایران ہر جگہ ملکی بیداری کی لہر دوڑ چکی تھی جس کے نمایاں اثرات ہندوستانی سماج پر اجاگر ہو رہے تھے۔ 1916 میں ہوم رول کی آواز عام ہو رہی تھی۔ 1918 میں جب جنگ ختم ہوئی اور انگریز سرکار نے وعدہ خلافی کر کے رولٹ ایکٹ نافذ کیا تو ملک میں گاندھی جی کی سربراہی میں عام بیداری کی لہر بہت تیز ہوگئی تھی ہر ذی علم نوجوان ملک کی آزادی کی جدوجہد کرنے والے کے لیے بے حد محبت اور ہمدردی کا جذبہ رکھتا تھا۔ اعجاز حسین اس سے مستثنیٰ نہ تھے۔ اعجاز حسین کی شاعری کی ابتدا نظم نگاری سے ہوئی۔ سب سے پہلے نظم انھوں نے 1917 میں اپنی اٹھارہ برس کی عمر میں کہی اور وہ نظم گاندھی جی کی شان میں تھی۔ چکبست کی فریاد قوم (1914) کے بعد، اعجاز حسین کی یہ دوسری نظم گاندھی جی کی تہنیت میں اردو میں لکھی گئی۔ اکبر الہ آبادی کا گاندھی نامہ بھی اس کے بعد کی نظم ہے۔ حالانکہ ہندوستانی ملک و سماج میں گاندھی جی کو شہرت اور مقبولیت 1920 کے بعد سے ملنا شروع ہوئی تھی۔ یہ نظم اعجاز حسین کے فکر و نظر کی ترقی پسندیت کا نتیجہ تھی۔ اعجاز صاحب نے گاندھی جی کی شہادت 30 جنوری 1948 پر بھی ان کی تہنیت میں نظم لکھی جس کا عنوان 'بلندی و پستی' ہے۔ اس کے دو بند پیش ہیں:

کس نے غمِ خواریِ عالم کو عبادت سمجھا
کس نے بے زر کی حمایت کو ریاضت سمجھا
کس نے دشمن کی عداوت کو محبت سمجھا
کس نے حق گوئی کو پیغام سیاست سمجھا
گھر کے طوفانوں میں یہ کون ہنسا کرتا تھا
جان دینے کے لیے کون مَرا کرتا تھا

مدتوں جوہرِ تخلیق نے کروٹ لی تھی
آدمیت کو نئے روپ میں صورت دی تھی
سب یہ تدبیر پئے خلقت گاندھی جی تھی
جس کو قسمت میں لکھی قافلہ سالاری تھی
جس نے طوفانِ غلامی سے نکالی کشتی
ایسے ملاح کو اپنوں ہی نے گولی ماری

اعجاز حسین نے متعدد و متنوع موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں۔ ان کی اکثر نظموں میں مظاہر فطرت کو موضوع بنایا گیا ہے اور بہت کامیاب نظمیں لکھی ہیں جیسے محسن منصوری، دہرادون، یا بہار کشمیر وغیرہ، سب بڑی دلپذیر تصویریں ہیں۔ ملاحظہ ہو:

جا کے منصوری پہ دیکھی حسن دولت کی بہار
دل، دماغ، آنکھیں، ابھی تک سب کے سب ہیں بے قرار
گیسوؤں کے پیچ و خم میں رہ گیا تار نظر
دیکھنے والے قیامت تک کر اس کا انتظار
کوہ منصوری نہ تھا گویا چراغ طور تھا
یا اُتر آیا تھا تارے لے کر چرخ آبدار

بہار کیسی کہ جانِ بہار ہے کشمیر
ز فرق تا بہ قدم، اک نگار ہے کشمیر
قدم قدم پہ یہاں ہے شباب کا عالم
نہ پوچھیے دلِ خانہ خراب کا عالم

اعجاز حسین نے ہر موضوع پر نظمیں لکھی ہیں۔ ہمارا گھر، مسافر، راجاپور کے مناظر، قرضہ، قرض ماجد، مہاجن، مہمان وغیرہ۔ یہ ساری کی ساری نظمیں اپنے وقت کے ماہنامہ رسالہ 'شعاع اردو' الہ آباد، اور 'کارواں' الہ آباد میں بھی تواتر سے شائع ہوا کرتی تھیں۔ نظم نگاری کے ضمن میں اعجاز حسین، نظیر سے قریب نظر آتے ہیں اور جیسے ان کے موضوعات عام و خاص سب ہوتے جاڑا، گرمی، برسات، ہولی، عید، مفلسی وغیرہ ویسے اعجاز حسین کے بھی موضوعات روزمرہ زندگی کے اور سامنے کے مسائل سے لیے گئے تھے۔ ایسے موضوعات میں اکثر خیال کی گہرائی اور تاثیر کی نشتریت کی کمی کا احساس ہوتا ہے مگر اعجاز حسین نے اس کو اپنے انداز بیان سے دلکش بنایا ہے۔ اعجاز حسین جس طرح خود سیدھے سادے انسان تھے ویسے ہی ان کی عظیم شاعری کے موضوعات اور زبان دونوں میں سادگی ہے مگر وہ سب زندگی سے ہم آہنگ ہیں اور یہ خوبی ایک نظمیہ شاعری کے لیے ضروری ہے۔ اس سے اس کو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ اعجاز حسین کا کلام اگر منصۂ شہود پر آگیا ہوتا تو اندازہ ہوتا کہ وہ ایک کامیاب اور مقبول شاعروں میں ہیں۔ خاص کر ان کی غزل اپنی ایک پہچان رکھتی ہے۔

■

Dr. Sayyed Ali Hyder 221 Preetam Nagar
Saleem Rai, Allahabad - 211011 (UP)

سائنس

تجاذب
ایک پُراسرار قوت

انیس رشید خان

جب ہم کسی پتھر کو اُوپر کی جانب اُچھالتے ہیں تو وہ کچھ بلندی تک جا کر واپس زمین کی جانب گر پڑتا ہے۔ کیوں؟.... اس سوال کا جواب ہے 'قوتِ ثقل یا تجاذب'..

آج کے دور میں، علمِ طبعیات (Physics) میں صرف چار قوتوں کو قدرتی قوتیں (Natural Forces) یا بنیادی قوتوں (Fundamental Forces) کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ یہ چار قوتیں ہیں برقی مقناطیسی قوت، طاقتور مرکزوی قوت، کمزور مرکزوی قوت اور قوتِ ثقل! ان چاروں قوتوں میں سے قوتِ ثقل سب سے کمزور ترین قوت ہوتی ہے، جس کا فاصلہ اثر (Range) حیرت انگیز طور پر لامحدود ہوتا ہے۔ اسی طرح سے طاقتور مرکزوی قوت اس کائنات کی سب سے طاقتور ترین قوت ہوتی ہے لیکن اُس کا فاصلہ اثر صرف جوہر کے مرکزے (Nucleus) کے اندر تک ہی محدود پایا جاتا ہے!

قوتِ ثقل ایک حیرت انگیز قوت ہوتی ہے کیونکہ اس کی تمام خصوصیات بے انتہا عجیب ہیں۔ اگر اس قوت کی قدر (Magnitude) کی بات کی جائے تو یہ کائنات کی سب سے کمزور ترین قوت ہوتی ہے، لیکن اگر اُس کا فاصلہ اثر دیکھیں تو وہ دنیا کی سب سے زیادہ لامحدود حد تک اثر انداز ہونے والی قوت ہے! اس کی مثال اس طرح سمجھی جاسکتی ہے کہ زمین کے اطراف زمین کی ثقلی قوت لامحدود فاصلہ تک بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ تجاذب کی قوت ہمیشہ صرف قوتِ کشش ہوتی ہے، یہ قوتِ دفع کسی بھی حالت میں نہیں ہوتی۔ یہ قوت جہاں جوہر، سالمات جیسے چھوٹے چھوٹے ذرات کے درمیان پائی جاتی ہے وہیں سورج، زمین، سیاروں، ستاروں وغیرہ جیسے بڑے بڑے فلکی اجسام کے درمیان بھی موجود ہوتی ہے!

قوتِ ثقل اس کائنات کی ایک قدرتی قوت ہے جو بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ آج ہم جانتے ہیں کہ اس کائنات میں موجود بڑے بڑے فلکی اجسام مثلاً سورج، زمین، چاند، ستارے، سیارے، کہکشاں وغیرہ سب کے سب قوتِ ثقل کے ساتھ ہی ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں اور اسی قوت کی وجہ سے اپنے اپنے مختلف مداروں پر گھوم رہے ہیں۔ آج ہماری سائنسی تحقیق اتنی ترقی کرچکی ہے کہ ہم اس کائنات میں موجود بہت سارے ستاروں اور سیاروں کا کافی صحیح اور واضح علم رکھتے ہیں۔ لیکن ہمارے اس فلکیاتی علم و تحقیق کی تاریخ صرف 300 سال پُرانی ہے۔

علمِ فلکیات کی تحقیق درحقیقت یونان (Greece) سے شروع ہوئی تھی۔ ابتدائی یونانی محققین زمین کو اس کائنات کا مرکز سمجھتے تھے۔ اُن کا خیال یہ تھا کہ زمین اس مکمل کائنات کا مرکز ہے اور اس کے اطراف سورج، چاند اور تمام ستارے اپنے اپنے مداروں پر گھوم رہے ہیں۔ اُن لوگوں نے مختلف سیاروں اور ستاروں کو 'خدائی حقیقت' کا درجہ دے رکھا تھا۔ یعنی وہ لوگ تمام ستاروں اور سیاروں کو خدائی میں شریک مانتے تھے۔ اسی خیال کی بنیاد پر علمِ نجوم (Astrology) کی ابتدا ہوئی تھی۔ اُن لوگوں کے مطابق قوتِ ثقل کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔ یہ تمام باتیں 16ویں صدی عیسوی تک صحیح سمجھی جاتی رہیں۔

جب گیلیلیو (Galileo) نے پہلی مرتبہ دُوربین (Telescope) کو آسمان کی طرف موڑا اور ستاروں سیاروں کا مشاہدہ کیا، تب کائنات کے بارے میں تمام تر نظریات مکمل طور پر تبدیل ہوتے چلے گئے۔ گیلیلیو اور ٹائیکو براہے (Tycho Brahe) نامی سائنسدانوں نے زمین کی مرکزی حیثیت کو چیلنج کیا اور ایک نیا نظریہ پیش کیا کہ اس کائنات کا مرکز درحقیقت 'سورج' ہے! اور زمین اور باقی تمام ستارے سیارے اُسی ایک سورج کے اطراف گھوم رہے ہیں۔ اُس نظریے کے مطابق، سورج کائنات کا مرکز ہے اور تمام سیارے و ستارے اُس کے اطراف دائروی مداروں (Circular Orbits) میں گھوم رہے ہیں۔ لیکن اُنہی دنوں کے اواخر میں جوہانس کیپلر (Johannse Kepler) نے یہ نظریہ پیش کیا کہ سورج کے اطراف زمین اور دوسرے سیاروں کے گھومنے کے

راستے درحقیقت بیضوی مدار (Elliptical Orbits) ہوتے ہیں۔ لیکن وہ اپنے اس نظریے کو مکمل طور پر اُس زمانے میں ثابت نہیں کر پایا، کیونکہ اُس دور میں، اُس وقت تک، قوتِ ثقل کا مکمل صحیح تصور موجود نہیں تھا۔

کائنات کے تمام فلکی اجسام کی حرکتوں (Cosmic Motions) کا کافی حد تک صحیح علم اُس وقت سامنے آیا جب اسحاق نیوٹن (Isaac Newton) نامی سائنسداں نے 'قوتِ ثقل' کا نظریہ پیش کیا۔ ایک مرتبہ جب وہ کائنات کی قدرتی قوتوں کے بارے میں غور وخوض کر رہا تھا تبھی اچانک ایک سیب (Apple) کے نیچے گرنے سے اُسے زمین میں موجود اُس مخصوص قوت کا خیال آیا جسے آج ہم قوتِ ثقل (Gravity) کہتے ہیں۔ سیب کے نیچے گرنے سے، نیوٹن نے اندازا لگایا کہ بغیر کسی قوت کے، دُنیا کا کوئی بھی جسم حرکت نہیں کرسکتا۔ یا دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی جسم حرکت کر رہا ہے، تو اُس کا سبب، کوئی نا کوئی قوت (Force) ضرور ہے!..... بغیر کسی بیرونی قوت کے کوئی بھی جسم، اپنی حالتِ سکون کو تبدیل نہیں کرسکتا۔

نیوٹن نے سیب کے گرنے سے قوت ثقل کا اندازہ لگایا اور یہ ثابت کردیا کہ جس قوت کی وجہ سے سیب نیچے گرتا ہے، اُسی قوت کی وجہ سے چاند (Moon) ہماری زمین کے اطراف گھومتا ہے؛ ہماری زمین سورج کے اطراف گھوم رہی ہے اور ہمارا یہ سورج، اپنی کہکشاں کے مرکز کے اطراف گھوم رہا ہے.....! نیوٹن نے ریاضیاتی ضابطوں سے ثابت کیا کہ زمین کے اطراف، چاند کی حرکت درحقیقت صرف ایک خمیدہ حرکت (Projectile Motion) ہوتی ہے۔

نیوٹن نے سیب کے گرنے سے قوتِ ثقل کا اندازہ لگایا اور یہ ثابت کردیا کہ جس قوت کی وجہ سے سیب نیچے گرتا ہے، اُسی قوت کی وجہ سے چاند (Moon) ہماری زمین کے اطراف گھومتا ہے؛ ہماری زمین سورج کے اطراف گھوم رہی ہے اور ہمارا یہ سورج، اپنی کہکشاں کے مرکز کے اطراف گھوم رہا ہے.....! نیوٹن نے ریاضیاتی ضابطوں سے ثابت کیا کہ زمین کے اطراف، چاند کی حرکت درحقیقت صرف ایک خمیدہ حرکت (Projectile Motion) ہوتی ہے۔ اسی طرح سے سورج کے اطراف، زمین اور دوسرے سیاروں کی بیضوی مداروں کی حرکت کا بھی بالکل صحیح اندازہ پیش کیا۔ اُس نے درحقیقت یہ ثابت کردیا تھا کہ کائنات میں پائی جانے والی ان تمام حرکتوں کی اصل وجہ ایک قوت ہے جسے 'قوتِ ثقل' کہا جاتا ہے!

اسحاق نیوٹن نے قوتِ ثقل کی دریافت کی اور اُن تمام مسائل کو کافی حد تک حل کردیا جو ایک زمانے سے غیر حل پزیر تھے۔ گیلیلیو، براہے، کیپلر اور نیوٹن کے اس تحقیقی سفر سے علم طبیعیات (Physics) ایک ایسی منزل تک جا پہنچا جہاں علم انسانی کی حیرت انگیز اُڑان کا اظہار علامہ اقبالؒ نے کچھ اس طرح کیا:

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا، مہِ کامل نہ بن جائے!

ان سائنسدانوں کے تحقیقی سفر سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ

قوت ثقل کا مکمل اور بالکل صحیح علم آج بھی ایک معمہ ہے۔ اس کی مکمل حقیقت آج بھی سائنس کا ایک ایسا سوال بنی ہوئی ہے، جس کا جواب کائنات کے مشاہدے اور تجرباتی مطالعے کے ذریعے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ مشاہداتی اور تجرباتی مطالعے کا سفر جاری ہے۔ اس میدان میں سائنسی تحقیقات کا سفر بے انتہا تیز رفتار سے جاری ہے۔ روزانہ نئی نئی دریافتیں اور انکشافات ہماری عقل اور فہم کو حیران کررہے ہیں۔

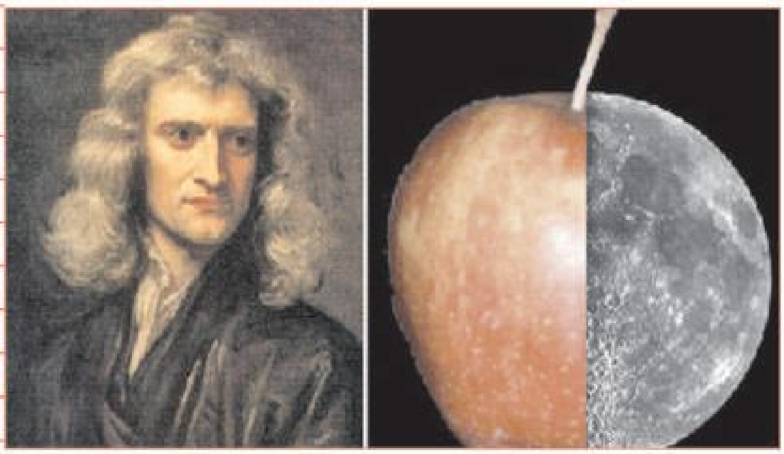

زمین اس کائنات کا مرکز نہیں ہے!۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ثابت ہوگیا کہ سورج بھی اس کائنات کا مرکز نہیں ہے!۔ اس کائنات کا مرکز کہاں ہے؟ یہ بات آج تک معلوم نہیں ہوسکی۔ البرٹ آئنسٹائن (Albert Enstein) نامی سائنسداں نے اس تحقیق کو ایک نیا موڑ دیا۔ اُس نے قوتِ ثقل کو جگہ اور وقت کے جال (Warping of Space & Time) سے تعبیر کیا۔ اس خیال کی بنیاد پر، اُس کا مخصوص نظریۂ اضافیت (Special Theory of Relativity) کا جنم ہوا، جو آج ایک مخصوص سائنس کی شکل اختیار کرچکا ہے۔ قوتِ ثقل کا مکمل اور بالکل صحیح علم آج بھی ایک معمہ ہے۔ اس کی مکمل حقیقت آج بھی سائنس کا ایک ایسا سوال بنی ہوئی ہے، جس کا جواب کائنات کے مشاہدے اور تجرباتی مطالعے کے ذریعے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ مشاہداتی اور تجرباتی مطالعے کا سفر جاری ہے۔ اس میدان میں سائنسی تحقیقات کا سفر بے انتہا تیز رفتار سے جاری ہے۔ روزانہ نئی نئی دریافتیں اور انکشافات ہماری عقل اور فہم کو حیران کررہے ہیں۔ ایک سیب کے نیچے گرنے سے انسان کی عقل کا جو دروازہ کھلا تھا، آج اُسی دروازے سے کائنات کے بے پناہ راز فاش ہوچکے ہیں اور بے انتہا راز ایسے سامنے آئے ہیں جو ہمیں دعوت دے رہے ہیں کہ کائنات کے ذرے ذرے پر غور کرو، کیونکہ سوچ کا یہ سفر ہمیں حقیقت تک ضرور پہنچائے گا!

■

Dr. Anees Rasheed Khan, Paradise Colony,
WalgaonRoad, In Front of Water Tank
Amravati - 444604 (MS)

ڈراما

'انارکلی' پر مبنی فلمیں

اشفاق احمد عمر

ڈراما 'انارکلی' تاج کا شاہکار ہے اور جسے ڈرامے کی دنیا میں سنگ میل کی حیثیت دی گئی ہے۔ علامہ اقبال یہ کہتے ہیں کہ 'انارکلی' کی زبان میں روانی اور انداز بیان میں دلفریبی پائی جاتی ہے۔ پریم چند انارکلی کے سلسلے سے یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ ''مجھے جتنی کشش 'انارکلی' میں ہوئی وہ اور کسی ڈرامے میں نہیں ہوئی۔'' محمود الٰہی تو اس حد تک کہنے سے گریز نہیں کرتے کہ: ''امانت سے لے کر آغا حشر تک ڈراما ایک بھی ایسا کردار نہ پیدا کر سکا جس میں ہمیشہ رہنے والی قدریں ہوں۔ تاج نے ایک ایسے کردار کی تخلیق کی ہے جس پر کبھی زوال نہ آئے گا انارکلی سے بڑھ کر آج تک اردو ڈرامے کو کوئی کردار نہ ملا۔'' تاج کا ڈراما 'انارکلی' پلاٹ، کردار، مکالمہ، زبان و بیان، پیش کش ہر اعتبار سے لافانی ہے تبھی تو آج تک اس ڈرامے پر زوال نہ آسکا اور آغا حشر کاشمیری کو یہ کہنا پڑا کہ: میں سمجھتا تھا حشر کے بعد ڈراما ختم ہو جائے گا لیکن اردو ڈرامے کے بہار کے دن تاج کے ڈرامہ 'انارکلی' سے آرہے ہیں۔

انارکلی کے بارے میں یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ ڈراما ایک فرضی داستان پر مبنی ہے۔ جس بات کا اعتراف اس ڈرامے کے مصنف سید امتیاز علی تاج (13 اکتوبر 1900- 19 اپریل 1970) نے ڈرامہ انارکلی کے دیباچے میں کیا ہے۔ مصنف کے اس طرح بے باکانہ اعتراف کے باوجود ڈراما اگر یوں شہرت و مقبولیت حاصل کرلے اور قاری کے ذہن و دماغ اور آنکھوں کے سامنے مغلیہ عہد کی 400 سالہ تاریخ کو رکھ دے تو یقیناً اس بات کو کہا جاسکتا ہے کہ تاج نے اس ڈرامے میں روح پھونکی ہے جو آج بھی تمام ناظرین و سامعین کے دلوں پر راج کرتا ہے۔ اصل میں تاج نے یہ ڈرامہ اس وقت لکھا جب وہ 1922 میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے کر رہے تھے۔ تاج کو ڈرامہ سے بڑی دلچسپی تھی اسی کے باعث وہ کالج کے ہر پروگرام میں اپنی موجودگی درج کرواتے اور ڈرامہ نگاری کے فن سے روشناس ہوتے۔ ڈرامہ انارکلی اسی کالج کا ثمرہ ہے جو انھیں تحفے میں ملا۔ تاج نے یہ ڈرامہ 1922 میں لکھا لیکن اپنے بزرگوں کے مشورے سے اس ڈرامے کو 1932 میں منظر عام پر لائے۔ اس وقت انارکلی ڈرامے کی مقبولیت کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ تاج کی زندگی میں یہ ڈرامہ تقریباً 9 بار شائع ہوا۔ اس واقعہ کا ذکر ڈاکٹر سلیم اختر کچھ اس انداز میں کرتے ہیں:

''انارکلی شائع ہوئی تو ہاتھوں ہاتھ لی گئی، اس لیے مدیر نیرنگ خیال نے اپنے تبصرے میں لکھا ''پہلا ایڈیشن مہینوں نہیں دنوں میں ختم ہوتا نظر آتا ہے، اس لیے خریدنے والے جلدی کریں، ورنہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔ انارکلی پہلی بار 1932، دوسری بار

1934، تیسری بار 1937، چوتھی بار 1940، پانچویں بار 1941، چھٹی بار 1956، ساتویں بار 1960، آٹھویں بار 1961 اور تاج کی زندگی میں آخری اشاعت یعنی نویں بار 1963، تک لگاتار شائع ہوتی رہی اور ان کی اہمیت و افادیت میں ذرہ برابر کمی نہیں آئی۔''

تاج نے ڈرامہ 'انارکلی' میں اس بات کا برجستہ اعتراف کیا ہے کہ اس کہانی کا تاریخ سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن یہ تاج کا فن تھا کہ انھوں نے اس ڈرامے میں ایسی کشش، ایسی جاذبیت، اور دلآویزی پیدا کردی کہ یہ ڈراما بہ ذات خود ڈراما نگاری کی دنیا میں ایک تاریخ بن بیٹھا۔ شاید اسی لیے پروفیسر محمود الٰہی کو یہ کہنا پڑا:

''جس کی نظر میں اتنی گہرائی اور دور بینی ہو کہ وہ ماضی بعید کے معاشرے کو ہمارے سامنے لاکر رکھ دے۔ جس کے قلم میں اتنا جادو ہو کہ وہ فکر و جذبہ پر چھا جائے۔ اگر وہ حال کے مسائل کو چھوتا تو اس صنف ادب کا حالی اور پریم چند ہوتا۔ تاج سے ہمیں ڈرامے کا فن ملا، ادب و بلاغت کا سرچشمہ ملا، لیکن اپنی زندگی کا کوئی نغمہ، شادی یا نوحۂ غم نہ ملا۔ تاج کے ساتھ ساتھ یا تاج کے بعد چند ڈراما نگاروں نے ہمارے مسائل سے بھی بحث کی تو وہ تاج کے فن اور معیار زبان و ادب تک نہ پہنچ سکے۔ تاج کی انفرادیت بہر حال مسلم ہے اور اس مرحوم صنف کے مورخ اور نقاد کو انارکلی مایوس نہ ہونے دے گی۔''

تاج کی شخصیت اس تراشیدہ ہیرے کی مانند ہے جس کے کئی روشن اور تابناک پہلو ہوتے ہیں۔ پروفیسر محمود الٰہی کی تاج سے متعلق تمام تر توقعات بالکل درست ہیں۔ تاج نے پوری زندگی کبھی قلم ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ بہت کم عمر میں (راوی، کہکشاں، تہذیب نسواں، پھول) جیسے رسالوں کی ادارت کے فرائض بھی بخوبی انجام دیے۔ ان کی ادبی کارکردگی کا دائرہ بہت وسیع ہے انھیں چند جملوں میں سمیٹنا مشکل امر ہے۔ اس لیے تاج کی شخصیت سے متعلق پھر کبھی بات کریں گے۔ ایسا نہیں ہے کہ صرف تاج نے انارکلی ڈراما لکھا ہو یا پھر اس کردار کا سہارا لے کر اسے بے مثال بنا دیا بلکہ اس کے ساتھ ہی فوق کا ناول 'انارکلی' بھی آیا اور ٹیگور نے اپنا 'افسانہ انارکلی' کے نام لکھا۔ یہ سلسلہ یہیں بند نہیں ہوتا بلکہ ''ٹیگور اور فوق کے علاوہ محمد عباس علی انجم ترابی نے 1958 میں ڈراما انارکلی لکھا، عباس علی عباس دہلوی نے بھی انارکلی کے عنوان سے ایک ڈراما لکھا، شری کھتری لال کانپوری نے بھی انارکلی پیش کیا۔ ساغر نظامی نے انارکلی کو منظوم صورت دی۔

ان تمام حضرات کی خامہ فرسائی کے باوجود انارکلی کا کردار وہ کردار نہ بن سکا جسے تاج نے شاہکار بنا دیا۔ جب بھی ہم انارکلی کا نام لیتے ہیں تو ہمارے ذہن و دماغ میں امتیاز علی تاج کا شاہکار ڈراما انارکلی ابھر کر چلا آتا ہے اور اپنے ساتھ پوری مغل داستان، اکبر، سلیم، اور دل آرام کی چالوں کا منظر لے آتا ہے۔ تاج نے انارکلی لکھتے وقت اسے فن کے تقاضوں پر ماپا اور اس میں ڈوب کر لکھا۔ اسی لیے انارکلی کا مطالعہ کرتے وقت ڈرامے کی ہر سطر سے سلیقہ اور ریاضت و محنت کا شہد ٹپکتا نظر آتا ہے۔ اس کی زبان کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی ہے۔ اور اسے نثر میں شاعری کہا جا سکتا ہے۔ اس کے مناظر و مکالمے میں نرم دریا کی سی روانی اور ایک بہاؤ پایا جاتا ہے۔ جس کو پڑھ کر قاری کے ذہن و دماغ پر ایک ایسا تاثر قائم ہوتا ہے جو محبت اور انتقام کا نام ہے۔ لیکن بہت کچھ سوچ کر بے حد افسوس ہوتا ہے کہ یہ ڈراما اتنا اثر انداز اور شاہکار ہونے کے باوجود اس وقت کے ڈرامائی اسٹیج پر پیش کیوں نہ ہو سکا؟۔

اس بات کو تاج نے اپنے دیباچے میں واضح کیا ہے کہ اس وقت کی ڈراما کمپنی کی جو شرطیں تھیں وہ مجھے منظور نہ تھیں۔ بہتر ہوا کہ تاج نے اس وقت اسے اسٹیج نہ کیا اور نہ ہی ان کے مشوروں کو اپنایا ورنہ شاید اس کی شکل ہی کچھ اور ہو جاتی۔

لیکن اس کا ایک دوسرا پہلو یہ بھی نظر آتا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اس ڈرامے کے لیے جو چیزیں اسٹیج پر درکار رہی ہوں وہ نہ مل سکی ہوں؟ جس کے باعث تھیٹریکل کمپنیوں نے اسے لینے سے منع کیا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ڈراما انارکلی کے لیے جس اسٹیج کی ضرورت تھی وہ فلم کا پردہ ہی تھا۔ اس لیے اس ڈرامے کی مقبولیت، کشش اور کہانی میں ایک انوکھا واقعہ دیکھ کر اس نام کو کئی بار فلمی پردے پر لایا گیا۔ اور الگ الگ طریقے سے انارکلی نام سے فلمیں پیش کی گئیں۔ تاج کے ڈرامے انارکلی پر کئی زبانوں میں فلمیں بنیں۔ جن کے نام: انارکلی 1928، خاموش فلم، لو اینڈ مغل پرنس 1928، خاموش فلم، انارکلی 1935 (پہلی بولتی فلم ہندی، اردو زبان کے ساتھ)، انارکلی 1953 (ہندی، اردو زبان)، انارکلی 1955 (تیلگو زبان)، انارکلی 1958 (اردو)، مغل اعظم 1960 (اردو، ہندی)، انارکلی 1966 (ملیالم زبان) اور اکبر سلیم اور انارکلی 9 مئی 1979 (تیلگو زبان)، خاص طور پر دلچسپی سے پر ہیں۔ ہم ان فلموں سے متعلق کچھ تحقیقی، تنقیدی، تاثراتی اور تجزیاتی گفتگو کریں گے۔

ڈراما انارکلی پر مبنی اس سے میل کھاتی ہوئی سب سے پہلی فلم 1928 میں 'انارکلی' کے نام سے بنائی گئی۔ جسے فلمی دنیا نے خاموش فلم کے طور پر پیش کیا تھا۔ اور اس فلم کے ڈائرکٹر آر ایس چودھری (8 جون 1903 وارانسی، اتر پردیش: 22 اگست 1972 ممبئی) جو ضلع وارانسی، اتر پردیش کے رہنے والے تھے۔ انارکلی کے کردار کو روبی میئر/سلوچنا (Sulochna/Ruby Mayer) (1907 پونے: 19 اپریل 1983)، نے بہ حسن خوبی انجام دیا۔ اور دنشا بیلی موریا (1904 کری) نے بھی اہم رول پلے کیا۔ فلم Black and White پیش کی گئی تھی اس فلم میں جو کچھ خاص کام کرنے والے لوگ تھے ان میں ڈی بلی موریا اور پی جلو بھی تھے۔ اس فلم کا انگریزی نام (Monuments of Tears) مونومینٹس آف ٹیرس تھا۔

یہ بات تھوڑا چونکانے والی ہے کہ 1928 میں اس کہانی پر مبنی ایک اور فلم لو آف مغل پرنس (Love of Mughal Prince) کے نام سے پردہ سیمیں پر آتی ہے۔ جسے چارو رائے (6 ستمبر 1890 برہم پور: 28 ستمبر 1971) اور پرفل رائے (ارجنوری 1892 کلکتہ، بنگال) منظر عام پر لائے۔ یہ ایک خاموش فلم تھی۔ اس فلم کو لکھنے والوں میں حکیم احمد شجاع اور امتیاز علی تاج (13 اکتوبر 1900: 19 اپریل 1970) کا نام قابل ذکر ہے۔ اس فلم میں انارکلی کے کردار کو 'سیتا دیوی' (1912: 1983) نے ادا کیا اور شہزادہ سلیم کے کردار کو 'ساون سنگھ' نے پیش کیا۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ فلم کے ڈائرکٹر چارو رائے اور فلم لکھنے والے امتیاز علی تاج نے اس فلم میں بطور اداکار کام کیا۔ اس فلم کو 'انارکلی' اور راج محل کی رمانی کے ناموں سے بھی جانا جاتا ہے۔

اس فلم کے کچھ اہم کردار چارو رائے، مایہ دیوی (1 فروری 1967)، راج کماری، شکنتلا ٹمبے (Shakuntala Tembe) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس فلم کی سنیماٹوگرافی (Cinematography) وی بی جوشی صاحب نے کی تھی۔

یہ سلسلہ ابھی رکتا اور تھمتا نہیں بلکہ 1935 میں انارکلی کی کہانی پر مبنی ایک اور فلم آتی ہے اس فلم کے ڈائرکٹر 'آر ایس چودھری' (8 جون 1903 وارانسی، اتر پردیش: 22 اگست 1972 ممبئی) تھے اور اداکار کے روپ میں (روبی میئر) 'سلوچنا' (1907 پونے: 19 اپریل 1983) تھیں۔ یہ انارکلی کی کہانی پر بننے والی سب سے پہلی بولتی فلم تھی جسے ہندی، اردو زبان کا پیراہن عطا کر کے

ناظرین وسامعین کے سپرد کیا گیا تھا۔

اب تک ڈراما انارکلی پر بننے والی سب سے اہم فلم 1953 میں انارکلی کے نام سے آتی ہے۔ جس کے ڈائرکٹر نندلال جسونت لال (15 مارچ 1907: 1961) ہیں۔ فلم کے کہانی کار ناصر حسین (3 فروری 1931، بھوپال: 13 مارچ 2002) تھے اور مکالمے کو حسن بخشنے کے لیے رمیش سہگل کا سہارا لینا پڑا اور اسے لوگوں کے دل میں اتارنے یعنی گانے کے لیے سی رام چندر جی (12 جنوری 1918: 5 جنوری 1982) نے اپنا تعاون دیا۔

فلم کے خاص اداکاروں میں: بینا رائے (انارکلی)، پردیپ کمار (شہزادہ سلیم)، مبارک (شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر) سلوچنا روبی میئر (مہارانی جودھا)، پرویز (منموہن کرشن)، ایس ایل پوری (راجہ مان سنگھ) کلدیپ کور (گلنار)، اور نور جہاں (انارکلی کی ماں) نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ فلم میں جان ڈالنے یا یوں کہہ لیجیے کہ اسے ایک نیا حسن اور زندگی عطا کرنے کے لیے فلم کے گیتوں کے لیے لتا منگیشکر، گیتادت فرید پور، بنگلہ دیش) اور ہیمنت کمار (بنارس) کا انتخاب کیا گیا جنھوں نے فلم کو فلمی دنیا کی اعلیٰ بلندیوں تک پہنچایا۔

انارکلی فلم کے لیے شروعات میں میوزک ڈائرکٹر کی خدمات (وسنت پرکاش) انجام دے رہے تھے اور گیتا دت کی آواز میں ایک نغمہ (آجان وفا آ......) Record ہو چکا تھا۔ لیکن شاید خدا کو کچھ اور منظور تھا۔ اسی درمیان وسنت پرکاش جی کی اچانک موت ہو جانے کے باعث ان کے کاموں کے لیے سی رام چندر جی کو چنا گیا۔ انھوں نے اپنا کام بطریق احسن ادا کیا۔ اور فلم نے فلمی دنیا کی اعلیٰ بلندیوں کو چھوا۔ اس فلم میں جو نغمے گائے گئے ان کی کل تعداد تقریباً 12 ہے۔ فلم انارکلی کے سارے گانے آج بھی لوگوں کے ذہن ودماغ پر ماضی کی دھندلی یادوں کی دستک دے رہے ہیں۔ ملاحظہ کریں نغموں کے بول:

1. اے باد صبا آہستہ چل یہاں سوئی ہوئی ہے انار کلی، آنکھوں میں جلوے سلیم کے لیے کھوئی ہوئی ہے انار کلی (گلوکار۔ ہیمنت کمار)

2. یہ زندگی اسی کی ہے جو کسی کا ہو گیا، پیار ہی میں کھو گیا۔ یہ زندگی اسی کی ہے۔ (گلوکار۔ لتا منگیشکر)

3. وفا کی لاج رہ جائے۔ کہ آجا! تیرے آنے سے۔ محبت کی نظر نیچی نہ ہو جائے زمانے سے۔ آجان وفا آ (گلوکار۔ گیتادت)

4. آجا۔ اب تو آجا۔ میری قسمت کے خریدار اب تو آجا۔ نیلام ہو رہی ہے میری چاہت سر بازار۔ اب تو آجا (گلوکار۔ لتا منگیشکر)

5. دل کی لگی ہے کیا؟ یہ کبھی دل لگا کے دیکھ۔ آنسو بہا کے دیکھ کبھی مسکرا کے دیکھ۔ پروانہ جل رہا ہے مگر جل رہا ہے کیوں؟ یہ راز جاننا ہے تو خود کو جلا کے دیکھ (گلوکار۔ لتا منگیشکر)

6. دُعا کر غم دل خدا سے دُعا کر۔ وفاؤں کا مجبور دامن بچھا کر۔ دعا کر غم دل خدا سے دعا کر (گلوکار۔ لتا منگیشکر)

7. جاگ درد عشق جاگ۔ جاگ درد عشق جاگ۔ دل کو بے قرار کر۔ چھیڑ کے آنسوؤں کا راگ (گلوکار۔ لتا منگیشکر)

8. اس انتظار شوق کو جلوؤں کی آس ہے۔ اک شمع جل رہی ہے۔ سو وہ بھی اداس ہے (گلوکار۔ لتا منگیشکر)

9. زندگی پیار کی دو چار گھڑی ہوتی ہے۔ چاہے تھوڑی بھی ہو یہ عمر بڑی ہوتی ہے (گلوکار۔ ہیمنت کمار)

10. محبت میں ایسے قدم ڈگمگائے۔ زمانہ یہ سمجھا کہ ہم پی کے آئے۔ پی کے آئے (گلوکار۔ لتا منگیشکر)

11. زندگی بے بسی ہے۔ بے کسی کا ساتھ ہے۔ ایک ہم ہیں اس قفس میں۔ یا خدا کی ذات ہے۔ او آسمان والے شکوہ ہے زندگی کا (گلوکار۔ لتا منگیشکر)

12. جو دل یہاں نہ مل سکے۔ ملیں گے اس جہان میں۔ کھلیں گے حسرتوں کے پھول... اے مزارمت کہو ہے محل یہ پیار کا (گلوکار۔ لتا منگیشکر)

ابھی تک جو فلمیں بن رہی تھیں وہ خاموش یا ہندی اردو زبانوں پر منحصر تھیں۔ اب انارکلی کی کہانی کا دائرہ اور بھی وسیع ہوتا گیا اور اس نے 1955 میں اس کہانی پر منحصر ایک فلم تیلگو زبان میں پیش کردی۔ اس فلم کے ڈائرکٹر 'ویدانتم راگھاویا (1919: 1971)' تھے۔ اس فلم میں انارکلی کے کردار کو 'انجلی دیوی' (24 اگست 1947: 13 جنوری 2014) نے ادا کیا ساتھ ہی سلیم کے کردار کو 'اکی نینی ناگیشور راؤ' (20 ستمبر 1923: 22 جنوری 2014) نے ادا کیا۔ اور شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے کردار کو 'ایس وی رنگا راؤ' (3 جولائی 1918: 18 جولائی 1974) نے ادا کیا۔ سنیما ٹوگرافی کے کارنامے کو 'کمل گھوش' اور میوزک 'پی آدی نارائن راؤ جی' (پیدائش 1915: انتقال 25 جنوری 1991) نے انجام دیے۔ اس فلم میں جو گانے گائے گئے وہ ہماری سمجھ سے تو پرے ہیں پھر بھی ہم انھیں Information کے لیے یہاں درج کیے دیتے ہیں:

(1) او انارکلی۔۔ انارکلی، انارکلی (گلوکار۔ گھنٹا سالا Ghantasala) (2) جیوی تے سبا لمو (گلوکار: جکی Jikki) (3) کنیہد ھا الیودو نیلاون اولی نی (گلوکار: جکی Jikki، گھنٹا سالا Ghantasala) (4) نان کنڈا سگاما سگاما (گلوکار: جکی Jikki) (5) راجہ سیکھارا این میل مودی سیالاگ (گلوکار: جکی Jikki، گھنٹا سالا Ghantasala) (6) او نال نی اولی رائی مرندھین (گلوکار: جکی Jikki) (7) کادھالین جوڈی (گلوکار: جکی Jikki) (8) اندھا نال تھائی دھابا (گلوکار: پی سوشیلا P.sushila) (9) آنندھام... نانم کوڈھن (گلوکار: جکی Jikki) (10) سیپائی انبے نی وارا یو (گلوکار: جکی Jikki) (11) پارتھا نیلے مودیو کنا ڈین این ویدھی (گلوکار: جکی Jikki)

اس کہانی پر مبنی فلم بننے کا سلسلہ ابھی تک تو صرف ہندوستان ہی میں فروغ پا رہا تھا۔ پاکستان میں بھی تاج کے ڈرامے انارکلی پر مبنی ایک فلم 'انارکلی' کے عنوان سے 6 جون 1958 میں آگئی جسے 'انور کمال پاشا' (23 فروری 1925 لاہور: 13 اکتوبر 1987) نے ڈائرکٹ کیا۔

اس فلم میں انارکلی کا کردار 'نور جہاں' نے ادا کیا، شہزادہ سلیم کا کردار 'سدھیر' (1922: 19 جنوری 1997) نے اور 'محمد افضل' (1 جنوری 1922 لاہور، پنجاب: 1 جنوری 1984) نے جلال الدین محمد اکبر کا کردار ادا کیا۔ ان سب کے علاوہ ثریا کا کردار 'شمیم آرا' (پیدائش 1942) نے پیش کیا، بہار کا کردار 'راگنی' (1925: 27/ فروری 2007) نے ادا کیا، اور جودھا کے کردار کو 'زبیدہ' (1911: 21 ستمبر 1988) نے انجام دیا ساتھ ہی کامیڈین کا رول ظریف (1938: 30 اکتوبر 1960)

نے بہ حسن وخوبی انجام دیا۔ ان کے علاوہ فلم میں اجمل اور فضل حق نے بھی اہم رول پلے کیا۔ اس فلم کے ڈائرکٹر انور کمال پاشا پاکستان کے مشہور پروڈیوسر اور ڈائرکٹر رہے ہیں۔ اس فلم کے علاوہ انھوں نے متعدد کامیاب فلمیں بنائی ہیں۔ جس میں وطن 1960، غلام 1953، رات کی بات 1954، سرفروش 1956، گمراہ 1959، لیلا مجنوں 1956، چن ماہی 1956، انتقام 1955، قاتل 1955، سیکریٹس آف دا نائٹ 1954، گمنام 1954، دل بر 1951، گجرو 1950، دوآنسو 1950، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ساتھ ہی انھوں نے 11 فلموں کو پروڈیوس بھی کیا اور ایک فلم 'دل بر 1951' میں اداکار کی حیثیت سے نظر بھی آئے۔ فلم انارکلی میں Music راشد اختر (15 فروری 1919 امرتسر، پنجاب: 18 دسمبر 1967 لاہور، پاکستان) اور عنایت حسین (1923 لاہور، پنجاب: 25 مارچ 1993 لاہور) نے دی تھی اور Playback Singer کے کام کو نور جہاں (21 ستمبر 1926: 23 دسمبر 2000 کراچی، پاکستان) نے ادا کیا۔ جو پلے بیک سنگر کی شکل میں منظر عام پر آئی۔

اگر اس بات کا اعتراف کیا جائے تو یہ بات سچ ہے کہ اب تک انارکلی کہانی یا ڈراما پر مبنی جتنی بھی فلمیں بنیں، ان تمام فلموں میں وہ بات نہ آسکی جو تاج کے ڈراما انارکلی پر مبنی فلم مغل اعظم میں آئی جسے فلمی دنیا میں سنگ میل کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ یہ فلم 5 اگست 1960 کو ممبئی کے مراٹھا مندر سنیما حال میں لگائی گئی جس کو دیکھنے کے لیے عوام نے کئی راتیں جاگ کر گزاریں۔ اس فلم کے ڈائرکٹر کے آصف 'کریم الدین آصف' (14 جون 1924 اٹاوہ: 9 مارچ 1971 ممبئی) تھے۔ جنھوں نے ڈراما انارکلی کو ایک نئی زندگی فراہم کردی۔ اس فلم میں موسیقی نوشاد (25 دسمبر 1919 لکھنؤ: 5 مئی 2006) نے دی۔ شکیل بدایونی (13 اگست 1916 بدایوں: 20 اپریل 1970) نے اس کے نغمے لکھے اور اسے گانے کے لیے فلمی دنیا کے ستاروں کو زمین پر آنا پڑا جن میں بڑے غلام علی خاں (2 اپریل 1902 لاہور: 23 اپریل 1968 حیدرآباد)، محمد رفیع (24 دسمبر 1924 امرتسر: 13 جولائی 1980 ممبئی)، شمشاد بیگم (14 اپریل 1919 امرتسر: 23 اپریل 2013 ممبئی)، لتا منگیشکر (28 ستمبر 1929 اندور) خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

فلم کو زبان عطا کرنے یعنی ان کے مکالمے لکھنے والوں میں امان اللہ خان، کمال امروہی (سید امیر حیدر کمال نقوی، 17 جنوری 1918: 11 فروری 1993 ممبئی)، احسان رضوی، اور وجاہت مرزا (مرزا وجاہت حسین چنگیزی، 20 اپریل 1908 سیتاپور: 4 اگست 1990 کراچی) تھے اور شہنشاہ اکبر کا کردار 'پرتھوی راج کپور' (3 نومبر، 1906 پشاور: 29 مئی 1972 ممبئی) نے ادا کیا، شہزادہ سلیم کا کردار 'یوسف خان عرف دلیپ کمار' (11 دسمبر 1922 پشاور، پاکستان) نے ادا کیا۔ انارکلی کا کردار 'ممتاز جہاں دہلوی عرف مدھوبالا' (14 فروری 1933 دہلی: 2 فروری 1969 ممبئی) نے بحسن خوبی ادا کیا۔ ان کے علاوہ مہارانی جودھا کا کردار 'درگا کھوٹے' (14 جنوری 1905 ممبئی: 22 دسمبر 1991 ممبئی) بہار کا کردار 'نگار سلطانہ' (21 جون 1932 انتقال 21 اپریل 2000 ممبئی) درجن سنگھ، (اجیت، حامد علی خان) سلیم کا بے تکلف

> **اگر اس بات کا اعتراف کیا جائے تو یہ بات سچ ہے کہ اب تک انارکلی کہانی یا ڈراما پر مبنی جتنی بھی فلمیں بنیں، ان تمام فلموں میں وہ بات نہ آسکی جو تاج کے ڈراما انارکلی پر مبنی فلم مغل اعظم میں آئی جسے فلمی دنیا میں سنگ میل کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ یہ فلم 5 اگست 1960 کو ممبئی کے مراٹھا مندر سنیما حال میں لگائی گئی جس کو دیکھنے کے لیے عوام نے کئی راتیں جاگ کر گزاریں۔**

دوست اور رازدار، 27 جنوری 1922، گولکنڈہ، حیدرآباد انتقال 21 اکتوبر 1998 حیدرآباد، سنگرآش کا کردار 'کمار' (سید علی حسن (23 ستمبر 1903 لکھنؤ: 1982) اور ثریا کا کردار 'شیلا دلایا' نے بڑے ہی فنکارانہ ڈھنگ سے ادا کیا۔ یہ کردار اس زمانے کی فلموں میں آسانی سے کام نہیں کرتے تھے اس کے لیے کے آصف نے بڑی محنت اور لگن سے کام لیا اور تمام اداکاروں سے سفارش کی تب جا کر یہ فلم منظر عام پر آئی۔ اس فلم میں سلیم کے بچپن کا کردار جس میں شیخو کہہ کر اکبر مخاطب کرتا ہے وہ کردار 'جلال آغا' (1926: 5 مئی 1995) نے پیش کیا، تان سین (سریندر ناتھ شرما) 11 نومبر 1910 گرداس پور، پنجاب/ انتقال 1987 ممبئی، کلاسیک گانا گانے والا ایک فرد، وزیر حق، اور کنیزیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس فلم کا انگریزی نام "The Emperor of Mughals" اور "The Great Mughal" ہے۔ اس فلم کے نغمے اور کچھ غزلیں اس طرح ہیں:

1. سہ دن آیو، سہ دن آیو۔ صاحب عالم جگ اُجیارو، سہ دن آیو (گلوکار: استاد بڑے غلام علی خاں)
2. موہے پنگھٹ پہ نند لال چھیڑ گئیو رے، موری نا جک کلیا مروڑ گئیو رے (گلوکار: لتا منگیشکر اور ساتھی)
3. تری محفل میں قسمت آزما کر ہم بھی دیکھیں گے، ہاں جی ہم بھی دیکھیں گے (گلوکار: لتا منگیشکر، شمشاد بیگم اور ساتھی گلوکارائیں)
4. اے عشق یہ سب دنیا والے، بے کار کی باتیں کرتے ہیں۔ پائل کے غموں کا علم نہیں، جھنکار کی باتیں کرتے ہیں (گلوکار۔ لتا منگیشکر)

(یہ نغمہ بلیک اینڈ وہائٹ فلم میں موجود ہے، رنگین فلم میں سے حذف کردیا گیا ہے۔)

5. پریم جوگن بن کے، سندری پیا اور چلی، ساجن سوں جونین ملے تو من کی پیاس بجھی (گلوکار۔ استاد بڑے غلام علی خاں)
6. محبت کی چھوٹی کہانی پہ روئے، بڑی چوٹ کھائے جوانی پہ روئے۔ (گلوکار۔ لتا منگیشکر)
7. ہمیں کاش تم سے محبت نہ ہوتی... ہمیں کاش، کہانی ہماری حقیقت نہ ہوتی (گلوکار۔ لتا منگیشکر)

(یہ نغمہ بلیک اینڈ وہائٹ فلم میں موجود ہے، رنگین فلم میں سے حذف کردیا گیا ہے۔)

8. انسان کسی سے دنیا میں اک بار محبت کرتا ہے۔ اس درد کو لے کر جیتا ہے اس درد کو لے کر مرتا ہے۔ پیار کیا تو ڈرنا کیا (گلوکار۔ لتا منگیشکر)
9. اے میرے مشکل کشا فریاد ہے، فریاد ہے، آپ کے ہوتے ہوئے دنیا میری برباد ہے۔ (گلوکار: لتا منگیشکر)
10. وفا کی راہ میں عاشق کی عید ہوتی ہے۔ خوشی مناؤ محبت شہید ہوتی ہے (محمد رفیع اور ساتھی)
11. یہ دل کی لگی کم کیا ہوگی، یہ عشق بھلا کم کیا ہوگا، جب رات ہے ایسی متوالی، پھر صبح کا عالم کیا ہوگا (گلوکار۔ لتا منگیشکر، ساتھی گلوکارائیں)

غزل: ماہ رو مہ جبیں انارکلی، دل ربا دل نشیں انار کلی، ہو یہ معلوم تم کو بعد سلام، غم فرقت سے دل ہے بے آرام (مدھوبالا/ انارکلی)

غزل: دل می رود ز دستم صاحب دلاں خدارا، دردا کہ راز پنہاں خواہد شد آشکارا (انارکلی فال پڑھتی ہے۔ دیوان حافظ)

فلم مغل اعظم کے خالق کریم الدین آصف نے اپنی پوری زندگی میں تقریباً 3 یا 4 فلمیں بنائیں لیکن فلم مغل

اعظم انھیں زندہ و جاوید رکھنے کے لیے کافی ہے۔ جو آج بھی ناظرین کے دلوں میں ویسے ہی جگہ بنائے ہوئے ہے جس طرح 1960 میں تھی۔

فلم مغل اعظم کے بعد ایک اور فلم ڈراما انارکلی پر مبنی ملیالم زبان میں 27اگست 1966 میں منظر عام پر آئی۔ اس فلم کے ڈائرکٹر 'کنچا کو' Kunchako (پیدائش 1912: 15 جون 1976 مدراس، تمل ناڈو) ہیں۔ اور کہانی کار کے طور پر 'ویکم چندر شیکھرن نیر' (1920: 12اپریل 2005) قابل ذکر ہیں۔ اداکاروں میں انارکلی کا کردار 'کے۔ آر۔ وجیا' (پیدائش 1948)، شہنشاہ اکبر کا کردار 'ستین، مانویل ستھیانیشان ندر' (9نومبر 1912: 15 جون 1971)، سلیم کا کردار 'پریم نذیر' (16دسمبر 1926: 16 جنوری 1989)، جودھا کا کردار 'امبیکا سکومرن' (ندارد)، تان سین کا کردار 'ڈاکٹر کے جے یسوداس' (10 جنوری 1940) نے بہ حسن و خوبی نبھایا۔ 'مان سنگھ' (11 ستمبر 1922: 19 اکتوبر 1986) کا کردار کوٹرا اکارا سری دھرن نیر نے کیا۔ 'راج سری' کسما کماری (پیدائش 1945) نے گلنار کا رول پلے کیا۔ انارکلی کی ماں کا رول 'پھیلو مینا' (1926: 2 جنوری 2006) نے ادا کیا۔ ان کے علاوہ ادور بھاسی (کریم)، ایس پی پلائی (قاسم)، مناوٹن جوسیفھ نے غلام تاجر کا کردار ادا کیا اور ایل پی آر ورما (درباری گائک) نے بھی اپنے کرداروں کو جی جان سے نبھایا اور فلم کو کامیابی سے ہمکنار کرانے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ موسیقی 'محمد صابر بابوراج' (9مارچ 1921: 7اکتوبر 1978) کی تھی۔ پریم نذیر کا نام ملیالم سنیما کی تاریخ میں ایک بڑا نام ہے۔ انھوں نے تقریباً 55 سے زائد فلموں میں کام کیا ہے۔

اس فلم کے بعد ایک اور فلم جو 'اکبر، سلیم، انارکلی' کے عنوان سے منظر عام پر آتی ہے وہ 9 مئی 1979 میں تیلگو زبان کا لباس عطا کیے ہوئے ہے۔ (نوٹ۔ Internet پر اسی فلم کے منظر عام پر آنے کا سال 1978 بھی دکھایا جاتا ہے) اس فلم کے ڈائرکٹر 'ترا کا راما راؤ نند عمری' تھے۔ میوزک کے لیے سی رام چندر جی کی خدمت لی گئی اس فلم میں شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کا کردار خود ڈائرکٹر نے نبھایا ہے۔ اور سلیم کے کردار کو ان کے بیٹے 'بال کرشن' (10 جون 1960) نے پیش کیا ہے۔ انارکلی کے کردار کو 'دیپا' اصل نام انی میری نے پیش کیا۔ ساتھ ہی کچھ اہم کرداروں میں جمنا، اور گومڈی بھی ہیں جنھوں نے اپنے رول کو بہ حسن و خوبی انجام دیا۔

اس فلم میں کل آٹھ گانے پیش کیے گئے ان گانوں کے پہلے مکھڑے کو یہاں درج کیے دیتا ہوں۔ تفصیلات مندرجہ ذیل ہیں: تھارلین ٹھگا، تھانے میلی موسوگو، مدنا موہانو دے، رسئی آگی پونی، بی چے سی چے، ویلا ایری گینا دوراانئے، کالوسوکنا، پری مسٹ ٹپا نٹارا، وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

'ترا کا راما راؤ نند عمری' کو 'این ٹی راؤ' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ 28 مئی 1923 کو آندھرا پردیش کے کرشن، ضلع میں پیدا ہوئے اور 18 جنوری 1996 کو اس دنیا سے سدا کے لیے چلے گئے۔ موصوف نے اپنی زندگی میں تقریباً 254 سے زائد فلموں میں بہ حیثیت اداکار، ڈائرکٹر، پروڈیوسر، کارنامے انجام دیے۔ زیادہ سے زیادہ فلمیں بہت کامیاب رہیں۔ جن میں تیلگو، ہندی اور تمل فلمیں خاص طور سے شامل ہیں۔

مختصر یہ کہ ڈرامہ انارکلی پر مبنی جتنی بھی فلمیں آج تک بنی ان میں 'مغل اعظم' 1960 (کریم الدین آصف) اور 'انارکلی' 1953 (نند لال جسونت لال) ہر لحاظ سے قابل ذکر ہیں۔ اگر ہمیں ان 9 فلموں میں صرف ایک فلم کا انتخاب کرنے کو کہا جائے تو وہ مغل اعظم 1960 ہے جو ڈرامہ نگاری اور سنیما کے لیے بالکل Perfect نظر آتی ہے۔ فلم مغل اعظم میں بھی تقریباً تاج کے ڈراما انارکلی کی ہی کہانی کو کچھ تبدیلیوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ لیکن کے آصف کی ذہانت کا مرید ہونا پڑتا ہے کہ انھوں کچھ ایسے زندہ کردار کا اضافہ کیا جو فلمی دنیا میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی کام اور فلم بنانے والے نہ کر سکے۔ سب نے ڈرامہ انارکلی میں کچھ حذف و اضافہ کر کے اسے پیش کر دیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب بھی انار کلی کا ذکر آتا ہے تو ہمارے ذہن میں ڈرامہ 'انارکلی' کے ساتھ فلم 'مغل اعظم' ہی آتی ہے۔ فلم مغل اعظم کا پلاٹ حقیقتاً نہایت ہی مربوط اور گٹھا ہوا ہے۔ چاہے وہ پلاٹ ہو، مکالمہ نگاری ہو، پیش کش ہو، کردار نگاری ہو، زبان ہو یا سیٹ، ہر لحاظ سے فلم مغل اعظم، ڈراما انارکلی سے قریب اور کامیاب نظر آتی ہے۔

کتابیات:

* امتیاز تحقیق و تنقید: ڈاکٹر سلیم ملک، بک ہوم لاہور، پاکستان 2004
امتیاز علی تاج: ڈراما انارکلی مقدمہ: پروفیسر محمود الہی، لکھنؤ 2003
پروفیسر عبدالسلام: فن ڈراما نگاری اور انارکلی، پاکستان 1961
سید امتیاز علی تاج (زندگی اور فن) ڈاکٹر محمد سلیم ملک، پاکستان 2003
انیس امروہوی، پس پردہ (فلمی مضامین) تخلیق کار پبلشرز، دہلی 2010
انیل زنکار، مغل اعظم (Legent as epic)، Harper Collins, India، 2013
پریم پال اشک، فلم شناسی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی 1992
پریم پال اشک: ہمارا سنیما قومی اردو کونسل، دہلی 2010
پریم پال اشک: ہندوستانی سنیما کے پچاس سال، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2000
ڈاکٹر الف انصاری: ہندوستانی فلم کا آغاز و ارتقا، (دو جلدوں میں) عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی 2013
سہیل اختر: نسرین منی کبیر، فلم مغل اعظم اسکرپٹ، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، دہلی 2007
سازیہ رشید: انڈین سینما تاریخ کے آئینے میں، (صد سالہ تاریخ) پین اینڈ پیپر پبلی کیشنز، لاہور، 2011
ہندوستان کے عظیم موسیقار: شمبھو ناتھ مشرا؛ مترجم: رئیس مرزا، پبلی کیشنز ڈویژن، دہلی، اکتوبر 1996
* ایس مسعود سراج: (اردو ڈرامہ اور انارکلی)، نیا دور، لکھنؤ، نومبر 1982
نجم الحسن انجم ادیب، مضمون: انارکلی ارباب علم کی نظر میں، شیرازہ، کشمیر، جنوری 1990
شیرازہ 'ماہانہ' محمد یوسف ٹینگ، جنوری 1990، سرینگر، کشمیر
ڈاکٹر وحید قریشی، صحیفہ، تاج نمبر، پاکستان، شمارہ53، اکتوبر 1970
* فلم مغل اعظم: ڈائرکٹر، کریم الدین آصف، ڈی وی ڈی، کلر، شیمارو، نئی دہلی
فلم انارکلی: ڈائرکٹر، نند لال جسونت لال، سی ڈی بلیک اینڈ وہائٹ، الٹراویڈیو سی ڈی، نئی دہلی

فلموں سے متعلق تمام تر تفصیلات Internet IMDbسے بھی حاصل کی گئیں ھیں

■

Ashfaque Ahmad Umar Dept of Urdu, JNU, New Delhi - 110067
Mob.:9795617086
Email.: ashfaq.2013@gmail.com

قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی

سہ ماہی فکروتحقیق

(ناول نمبر)

'فکروتحقیق' اپریل- جون 2016 کا یہ خصوصی شمارہ ہر لحاظ سے قابل قدر ہے کہ اس میں ابتدائی تین مضامین میں ناول کے فن اور مجموعی طور پر اس کی تخلیقی نوعیت، زبان اور پیشکش کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر قدوس جاوید اور پیغام آفاقی نے مغربی فکرودانش کی روشنی میں ناول کی فنی صورت گری میں زبان وبیان اور تخیل وتفکر کے خصوصی کردار پر بڑی فکرانگیز گفتگو کی ہے۔ اردو ناول کی صد سالہ تاریخ میں 'آگ کا دریا' کی امتیازی حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر عتیق اللہ لکھتے ہیں کہ:

قرۃ العین کا یہ وہ ناول ہے، جس میں پہلی ڈیڑھ ہزار برسوں پر پھیلے ہوئے زمانے کی ذہنی، تہذیبی اور تاریخی آویزشوں اور آمیزشوں کو زبان دی گئی تھی، اس طور پر کہ تاریخ نے ایک تخلیقی تجربے کی شکل اختیار کرلی۔ 'آگ کا دریا' تاریخ نہیں ہے لیکن تاریخ کے متن کو ایک ایسا نیا متن بنانے کی فنی کوشش ہے جو تاریخ کے بہ ظاہر میدان عمل سے زیادہ بہ باطن میدان عمل کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہے۔ 'آگ کا دریا' کو ایک ایسا رزمیہ قرار دیا جاسکتا ہے جس کے سارے رُخ اندر کی طرف ہیں، جس کی اساس کسی ایک انسان یا فرد پر نہیں رکھی گئی ہے بلکہ وہ مسلسل اور مجموعی انسان ہے جو صدیوں سے ایک ہی نوعیت کے صدموں، چیلنجز، خطروں، مسابقوں، مبارزتوں اور آزمائشوں سے جوجھتا چلا آرہا ہے۔ 'آگ کا دریا' کسی ایک مقام یا کسی ایک زمانے یا کسی ایک کردار کے محور پر گردش نہیں کرتا بلکہ زندگی کرتے ہوئے کرداروں کے ایک ہجوم، ان کی تقدیروں کے رُخ پلٹنے والے کئی زمانوں کے اجبار، تواتر کے ساتھ ایک کے بعد ایک مقام کی تبدیلی واقع ہونے کے باعث یہ ناول پلاٹ کا ایک نیا تصور مہیا کرتا ہے جو روایت شکن بھی ہے اور ایک نئی روایت کا اساس گر بھی۔''

قدوس جاوید نے 'معاصر ناول کی شعریات' کے حوالے سے بعض باتیں بہت پتے کی کہی ہیں، فرماتے ہیں:

''مغربی تنقید میں ان ناولوں اور خاص طور پر مارکیز کے ناول کو مابعد جدید ناول کا 'ماڈل' قرار دیتے ہوئے ناول کے روایتی تقاضوں اور رویوں (شعریات) کا ازسر نو جائزہ لیا گیا ہے۔ (ایہاب حسن، لیزلی فیڈلر اور لنڈا ہیوشین نے اس پر تفصیل سے بحث کی ہے) اور نتیجہ یہ

نکالا گیا کہ مابعد جدید ثقافتی صورت حال میں 'ناول کی شعریات' ایک نئے سانچے میں ڈھل چکی ہے۔ ناول کی صنفی حدیں ٹھوس اور مستقل نہ رہ کر سیال اور تغیر پذیر ہو چکی ہیں۔ اب کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ناول اور طویل افسانہ، ناول اور سوانح نگاری، اور ناول اور تاریخ میں امتیاز پیدا کرنے والی حدیں کیا ہیں اور کتنی مضبوط یا کمزور ہیں۔''

پیغام آفاقی جو افسوس کہ اب ہمارے درمیان نہیں رہے، انھوں نے ناول اور معاشرتی زندگی کے تناظر میں بعض بہت اہم حقائق کی طرف اشارہ کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ:

''حقیقت پرست ناول معاصر صورت حال کے علاوہ تاریخی صورت حال کو پیش کرنے میں بھی خود تاریخ سے زیادہ وسیع کینوس رکھتے ہیں کیونکہ وہ ماضی بعید میں گزرے واقعات کو صرف دستاویزوں کی روشنی میں نہیں دیکھتے بلکہ انسانی نفسیات کی روشنی میں بھی ان واقعات کو پرکھتے ہیں جبکہ تاریخ یہ کام نہیں کرتی۔ اپنے معاشرے کے بارے میں اس طرح کے ناولوں کو پڑھنا دانشوری کے مقام تک پہنچنے کے لیے ناگزیر ہے۔ پیغام آفاقی معاشرہ میں اثرانداز ہونے والی مختلف قوتوں اور محرکات کا ذکر کرتے ہیں جن سے بخوبی واقفیت حاصل کیے بغیر ناول نگار اپنے ناول میں حقائق کی عکاسی یہ مشکل ہی کرسکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک وہ طبقہ ہے جس کی حقیقت سے کم ہی لوگ آگاہ ہوتے ہیں اور وہ طبقہ میڈیا اور دانشوروں کا طبقہ ہوتا ہے۔ یہ طبقہ عموماً عوام کو جاہل سمجھتا ہے اور اپنی گرفت اوپری چمک دمک اور عوام کے اعتبار کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے اکثر حکومتوں اور تاجروں کی حمایت کرتا ہے اور ان کی برائیوں کو پیش کرنے کے بجائے اسے چھپاتا ہے اور عوامی زندگی کی حقیقت کو یعنی عوام کی حالت اور ان کی سوچ کو کوڑے کباڑ کی طرح نظرانداز کرتا ہے۔''

ان نہایت اہم اور بنیادی مضامین کے علاوہ دیگر مضامین کی نوعیت عملی اور اطلاقی تنقید کی ہے۔ ان میں چند مضامین ایسے بھی ہیں جن میں اردو ناول کے تدریجی ارتقا کا جائزہ لیا گیا ہے جبکہ چند مضامین میں فرداً فرداً ناول نگاروں کی تخلیقات کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ کچھ

مضامین میں ناول کے سماجی، سیاسی اور تہذیبی کردار اور پس منظر کو بھی معرض بحث میں لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ موضوعات کے تنوع سے بھی موجودہ خصوصی پیشکش کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً اردو ناول کی ایک صدی، اکیسویں صدی میں اردو ناول، نئی صدی نیا ناول، صورت حال اور امکانات، ہند و پاک خواتین ناول نگار، ناول روحانیت سے رومانیت تک، اردو ناولوں میں سماجی و سیاسی مسائل کی عکاسی، آزادی کے بعد اردو ناولوں کے موضوعات، اردو ناول میں اسلوب کے تجربے، اردو ناول میں طبقاتی کشمکش، اردو ناولوں میں تانیثی حیثیت۔ اس حصہ مضامین کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے لکھنے والوں میں چند سینئر اہل علم کے ماسوا اکثر نوجوان اسکالرس ہیں جنھوں نے اپنی ذہانت اور ہنرمندی سے ناول سے وابستہ مسائل پر غور و خوض کیا ہے اور جس نتیجے پر پہنچے ہیں اسے اعتماد کے ساتھ سپرد قلم کیا ہے۔ ان کے خیالات سے اختلاف کیا جانا اکثر مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ مضامین اپنی قرأت پر اکساتے ہیں اور افادیت کے حامل ہیں۔

اس خصوصی اشاعت پر مزید ایک خصوصیت کا تعلق ان مضامین سے ہے جو پاکستانی ناول کی صورت حال کو پیش کرنے کے لیے شامل کیے گئے ہیں۔ اس ضمن میں قمر جمیل کا مضمون 'ناول کی بوطیقا اور ساختیات' کی اہمیت مسلم ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں ساختیاتی نقطۂ نظر سے ناول کی قرأت اور ممکنہ فوائد کو نشان زد کیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بیسویں صدی میں پاکستان میں چند بڑے اہم ناول لکھے گئے، حالانکہ اب وہاں بھی بتدریج مایوسی کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ تخلیقی ادب کا سوتا بتدریج خشک ہو رہا ہے، اس کا سبب بھی یقیناً ہمارے عہد کی حد سے بڑھی ہوئی اور اعصاب شکن بہیمیت ہے جس نے تخلیق کاروں کے لہو کو منجمد اور فکر کو شل کر دیا ہے، ان حالات میں فوری طور پر کسی بڑے ناول یا تخلیقی کارنامہ کے وجود میں آنے کے آثار کم ہی نظر آ رہے ہیں۔ تاہم مستقبل کے بارے میں ابھی کچھ کہنا قبل از وقت معلوم ہوتا ہے۔ اس حصہ مقالات میں اردو کے معروف محقق اور فکشن کے ناقد ارتضی کریم کا بے حد دلچسپ مضمون بھی شامل ہے جس میں انھوں نے عزیز احمد کے معروف ناول 'گریز' کے تعلق سے یہ انکشاف کیا ہے کہ اس ناول کو ایک سفرنامے کے طور پر بھی پڑھا جاسکتا ہے جس کے واضح ثبوت خود اس ناول کی داخلی ساخت میں موجود ہیں۔ ارتضی کریم نے متعدد مثالوں سے یہ واضح کیا ہے کہ 'گریز' میں پیش کردہ زندگی اور

> "اس خصوصی پیشکش کا بیش قیمت حصہ 'چشم جہاں' کے ذیل میں شامل کی گئی تحریروں کو کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس سلسلے میں غضنفر اقبال کا مضمون 'ناول تنقید' بے حد کارآمد ہے۔ اردو ناول کے موضوع پر چند اہم شائع شدہ کتابوں کا تاریخی ترتیب میں جائزہ کافی حد تک مفید اور کارآمد کہا جاسکتا ہے۔ البتہ بقیہ چار مضامین یعنی ہندوستانی جامعات میں ناولوں پر تحقیق، ناولوں کی فہرست، تنقیدی کتب اور مضامین کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے، یہ نہایت عرق ریزی اور جاں فشانی کا کام تھا جسے صحیح معنوں میں ریسرچ کہنا چاہیے۔ ایسی مفید اور کارآمد معلومات ہیں جن سے آئندہ ناول پر کام کرنے والے بیش از بیش استفادہ کرسکتے ہیں"

Protaganist نعیم کا کردار جن واقعات و مراحل سے گزرتا ہے، ان پر التباس سے زیادہ حقیقت کا گمان ہوتا ہے، جسے معروف معنی میں اگرچہ کلیتاً سوانحی ناول نہیں کہہ سکتے لیکن کچھ حصوں کو چھوڑ کر اسے بطور سفرنامہ پڑھنا چاہیں تو یقیناً اس ناول کا ایک نیا زاویہ ضرور سامنے آتا ہے۔ اس ناول سے متعلق ارتضی کریم کے خیالات کو خود انھیں کے الفاظ میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے:

''عزیز احمد نے دراصل 'گریز' کے پردے میں اپنی علمیت اور سفرنامہ کو نعیم کے کردار کی صورت میں ناول کی شکل دینے کی کوشش کی ہے، یہی وجہ ہے کہ گریز نہ اچھا ناول بن سکا نہ بہتر سفرنامہ بلکہ اسے ایک سفرنامہ ناول کہا جاسکتا ہے۔ عزیز احمد نے خود اپنے ناول۔ ایسی بلندی ایسی پستی کو تجریاتی ناول کہا ہے اور محمد حسن عسکری اور سہیل بخاری اسے اجتماعی ناول کا نام دیتے ہیں، اسی طرح گریز بھی ناول کے بنے بنائے چوکھٹے میں فٹ نہیں بیٹھتا، اسے ہم ایک سفرنامہ ناول کہہ سکتے ہیں۔

اس خصوصی پیشکش کا بیش قیمت حصہ 'چشم جہاں' کے ذیل میں شامل کی گئی تحریروں کو کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس سلسلے میں غضنفر اقبال کا مضمون 'ناول تنقید' بے حد کارآمد ہے۔ اردو ناول کے موضوع پر چند اہم شائع شدہ کتابوں کا تاریخی ترتیب میں جائزہ کافی حد تک مفید اور کارآمد کہا جاسکتا ہے، البتہ بقیہ چار مضامین یعنی ہندوستانی جامعات میں ناولوں پر تحقیق، ناولوں کی فہرست، تنقیدی کتب اور مضامین کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے، یہ نہایت عرق ریزی اور جاں فشانی کا کام تھا جسے صحیح معنوں میں ریسرچ کہنا چاہیے۔ ایسی مفید اور کارآمد معلومات ہیں جن سے آئندہ ناول پر کام کرنے والے بیش از بیش استفادہ کرسکتے ہیں۔

اس پیشکش کا آخری حصہ 'تخلیقی وجدان' بھی نہایت خوب صورت اور مفید ہے۔ خصوصاً سید محمد اشرف، حسین الحق اور ترنم ریاض کے قلم سے لکھی گئی ان کی تحریں کا ہر لفظ پڑھنے اور لطف اندوز ہونے کے قابل ہے۔ سید محمد اشرف کا تازہ ترین ناول 'آخری سواریاں' کے مسودے سے متعلق جو معلومات انھوں نے بہم پہنچائی ہیں خصوصاً اجمل کمال کے مشورے پر متن میں رد و بدل سے جہاں ان کی علمی دیانت داری اور وسیع القلبی کا اندازہ ہوتا ہے، ان تفصیلات کے بغیر ہمیں یہ کیسے معلوم ہوتا کہ سید محمد اشرف جیسا جینوئن تخلیق کار بھی اپنے شاہکار ناول منصۂ شہود پر لانے سے قبل قطع و برید کے اور ترمیم و تنسیخ کے کئی مراحل سے کس طرح گزارتا ہے اور پوری طرح مطمئن ہوکر اپنی تخلیق قاری کے سپرد کرتا ہے۔

ترنم ریاض جو ایک فرد سے زیادہ دبستان کی حیثیت رکھتی ہیں ان کے فنی کارناموں کی قدر و منزلت کو وارث علوی جیسے جید نقاد نے اپنے طویل محاکمہ میں زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ان کی کوئی تحریر کبھی بھی لطف و لذت سے خالی نہیں ہوتی۔ وہ اپنی غیر معمولی تخلیقی توانائی اور بلند نگہی سے بتدریج علوئے مرتبہ حاصل کرتی جارہی ہیں اور وہ وقت دور نہیں جب ہم انھیں اردو کی ورجینیا وولف کہہ کر پکاریں گے۔

بحیثیت مجموعی فکر و تحقیق کا یہ خصوصی مجلّہ (ناول نمبر) نہایت وقیع و قابل قدر، بلکہ دستاویزی اہمیت کا حامل ہے جس کے بیشتر مشمولات کی گونج مدتوں ادبی دنیا میں سنی جائے گی۔ یہ وہ خصوصیت ہے جس کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ادارت سے وابستہ تمام افراد مبارک باد کے مستحق ہیں۔

■

Qazi Obaidur Rahman Hashmi
B-10, 2nd Floor, Okhla Vihar,
Jamia Nagar, Okhla, New Delhi - 25
Mob.:09990893596,
E-mail.: quazi_obaid@yahoo.com

تبصرہ وتعارف

کلیات ملا رموزی (جلد دوم، سوم، چہارم، پنجم)

مرتب: پروفیسر خالد محمود

صفحات: جلد دوم: 750، سوم: 710، چہارم: 875، پنجم: 428

قیمت: جلد دوم: 243، سوم: 235، چہارم: 279، پنجم: 156 روپے

مبصر: ثوبان سعید، ایسوی ایٹ پروفیسر
خواجہ معین الدین چشتی اردو، عربی-فارسی یونیورسٹی، لکھنؤ (یوپی)

ملا رموزی (پیدائش: 1896، وفات: 1952) کسی ایک میدان کے ماہر نہیں تھے لیکن انھیں ان کے خاص ایجاد کردہ اسلوب یعنی گلابی اردو کی وجہ سے شہرت ملی۔ وہ بڑی رنگا رنگ شخصیت کے مالک تھے اور ایک کثیر التصانیف قلم کار۔ ان کا اصل میدان طنزومزاح تھا۔ طنزومزاح نگاری کی ایک بنیادی شرط یہ بتائی گئی ہے کہ قلم کار کا مشاہدہ زبردست ہو اور جزئیات نگاری اور بات سے بات نکالنے کا فن اس کو آتا ہو۔ یہ تمام باتیں ملا کی شخصیت میں جمع ہوگئی تھیں جن سے کام لے کر انھوں نے ایسی تخلیقات پیش کیں جو معاصر ادب اور معاصر دنیا کی نبض شناس تھیں۔ عالمی معاملات پر بھی وہ اظہار خیال کرتے تھے۔ ان کے طنزومزاح کو سمجھنے کے لیے معاصر عالمی صورت حال سے واقفیت رکھنا بہت ضروری ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان تحریروں سے اُس دور کے عالمی اور ملکی حالات کی معلومات حاصل کی جاسکتی ہے۔

کونسل
کی
کتابیں

کلیات جلد دوم کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں نکاتِ رموزی (حصہ اول، دوم) کے علاوہ تین کتابیں اور بھی شامل ہیں جن کے نام بالترتیب شادی، خواتین انگورہ اور زندگی ہیں۔ بیسویں صدی کی دوسری تیسری دہائی میں ملا کا قلم بے تکان چلتا تھا اور ملک کے حالات بھی ایسے تھے کہ ملا رموزی کے سامنے موضوعات ہاتھ باندھے کھڑے نظر آتے تھے۔ کہنا چاہیے کہ شاید ہی کوئی ایسا موضوع رہا ہو جس پر ملا رموزی نے قلم نہ اٹھایا ہو۔ نکاتِ رموزی کے حصہ اول میں نازش رضوی ایڈیٹر بہارستان لاہور کا مقدمہ شامل ہے جس میں ملا صاحب کی شخصیت اور اسلوب پر سیر حاصل گفتگو موجود ہے۔ ملا رموزی کے مضامین عصری اہمیت کے حامل ہیں مثلاً علی گڑھ، عورتیں اور ریل کا سفر، صحافت اور علمی سرمایہ داری، نئی پرانی شاعری؛ ان سبھی مضامین پر ان کے مخصوص اسلوب کی چھاپ موجود ہے۔ اس کتاب میں ملا رموزی نے خود اپنے حالات تحریر کیے ہیں۔ نکاتِ رموزی حصہ دوم میں عبدالقادر سروری صاحب کا مقدمہ ہے۔ انھوں نے ملا رموزی کے اسلوب کی سات نمایاں خوبیوں کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ کلیات کے تیسرے مجموعے 'شادی' کی اہمیت یوں ہے کہ اس کے سرورق پر ہی لکھا ہوا ہے کہ 'حضرت ملا رموزی مشہور لطافت نگار کی شادی کے خودنوشتہ حالات کی دل فریب تفصیلات'۔ کہنے کو تو یہ ملا رموزی کی شادی کی تفصیلات ہیں لیکن کتاب پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ملا رموزی نے اپنی شادی کے پس منظر کا استعمال کرتے ہوئے بھوپال کی تقاریب شادی کی تفصیلات کو قلم بند کردیا ہے، اس طرح یہ خاصے کی چیز بن گئی ہے۔ اس مجموعے کی تہذیبی اہمیت ہمیشہ باقی رہے گی۔ خواتین انگورہ میں ترکی خواتین کی بے مثال قربانیوں کا تذکرہ ہے۔ ان کی تعلیم اور آزادی کو خاص طور سے نشان زد کیا گیا ہے۔ خالدہ ادیب خانم کے علاوہ ایسی بیسیوں خواتین ہیں ترکی کی انقلابی زندگی میں جن کے کارنامے قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں ملا رموزی نے ایسی کئی شخصیتوں کو زندہ کردیا ہے۔ ترکی کی ترقی میں خواتین کا کردار کے لیے انھوں نے اچھا مسالہ جمع کردیا ہے۔ کلیات کا آخری مجموعہ 'زندگی' کے نام سے شامل ہے اس میں بھی مجموعی طور سے سولہ مضامین شامل ہیں جو ہندوستانی زندگی، علی گڑھ، کانپور کے حالات بلکہ آسانی کی خاطر یہ کہہ لیجیے کہ مسلمانوں کی زوال کے داستان کو بیان کرتے ہوئے مکمل کیا گیا ہے۔ پروفیسر خالد صاحب کے مقدمے کے صفحات کو اگر شامل نہ کریں تو اصل متن کے صفحات کی گنتی 750 تک پہنچتی ہے۔

کلیات کی تیسری جلد میں خالد محمود صاحب کے مقدمے کے علاوہ ملا رموزی کی جن کتابوں کو سمیٹا گیا ہے ان میں صبح لطافت، لاٹھی اور بھینس، شفاخانہ، مضامین ملا رموزی، شرح کلام اکبرالہ آبادی، مشاہیر بھوپال اور خطوطِ رموزی شامل ہیں۔ یہ مختلف کتابیں بھی اپنے اندر موضوعات کے تنوع سے مالا مال ہیں۔ مثلاً اکبرالہ آبادی کی شاعری کی تشریح، بھوپال کی برگزیدہ ہستیاں، ملا رموزی کے مختلف ایڈیٹروں کو خط لکھنے کا انداز اور سب سے بڑھ کر ان کا اسلوب جو ہر حال میں روزمرہ اور محاوروں کی خوبیوں سے مرصع زندہ اور رواں دواں رہتا ہے۔ مزید ایک بات یہ ہے کہ بعض غیر مطبوعہ تحریریں بھی اس جلد میں شامل ہیں۔ مقدمے میں پروفیسر محمود صاحب نے ملا رموزی کے بارے میں گراں قدر معلومات بہم پہنچائی ہیں۔

کلیات کی چوتھی جلد اخبارات میں لکھے گئے کالموں پر مشتمل ہے۔ ظاہر ہے اخبار کے کالم کے اپنے دائرے ہوتے ہیں۔ بروقت لکھنا، معاصر موضوع پر لکھنا، اخبار کی پالیسی کا خیال رکھنا اور صفحات کے حدود کی بھی رعایت کرنا، پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ملا رموزی نے اتنے سارے کاموں کو کیسے نمٹایا ہے۔ جیسا کہ فاضل مرتب نے اپنے وقیع مقدمے میں لکھا ہے کہ "جلد چہارم حقائق ولطافت، نوادر ولطائف، رموز ولطائف، رمز ولطیفہ اور مختلف کالموں کو محیط ہے۔ اس جلد کے کل صفحے 914 ہیں اور یہ سب سے ضخیم کتاب ہے۔" اس تفصیل کے علاوہ کتاب میں 'مضامین' کے نام سے اخباری مضامین پر مشتمل ایک مختصری کتاب بھی شامل ہے جس میں تقریباً 70 سے زائد مختلف النوع مضامین پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ پہلی نظر میں جن موضوعات پر نگاہ ٹھہرتی ہے اس میں لیگ، کانگریس، فلسطین، برطانیہ، اردو پریس، ترقی پسندی، مالدار کمیونسٹ، عطاء اللہ شاہ بخاری کی سرخی موجود ہے۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کا قلم کسی ایک سمت میں نہیں چلتا تھا اور اسی کے ساتھ ان کے اسلوب کا بھی رنگ تبدیل ہوتا رہتا تھا۔

پروفیسر خالد محمود صاحب کے مقدمے نے کتاب کی اہمیت کو دوچند کردیا ہے۔

پانچویں جلد میں متن کے اصل صفحات کی تعداد 428 ہے۔ ہر جلد میں پروفیسر موصوف کا مقدمہ شامل کیا گیا ہے یہ دراصل ایک ہی مقدمہ ہے جس کو ہر جلد کے شروع میں رکھنے کا التزام کیا ہے۔ مقدمہ ملا رموزی کے فن اور شخصیت کی تفہیم میں معاون ہے۔

غرض یہ کہ اس جلد میں ملا رموزی طنزومزاح کے ساتھ ایک شاعر کے روپ میں نظر آتے ہیں ایک ایسا شاعر جس کے سینے میں محبت اور ہمدردی کے جذبات موجزن ہیں۔ جس نے عالمی مسائل پر بھی خوب نظمیں لکھیں اور ملکی قومی اور ادبی موضوعات کے ساتھ

ساتھ سماجی اور تہذیبی مسائل کو بھی نظموں میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی شاعری سنجیدگی کے ساتھ مزاحیہ اور شگفتہ اسلوب سے عبارت ہے۔ ملا رموزی نے بیشتر نظموں میں ہی طبع آزمائی کی ہے۔ دیگر اصناف شاعری پر انھوں نے زورِ طبع نہیں دکھلایا۔

پروفیسر خالد محمود کے مرتب کردہ اس کلیات کی ادبی طور سے یہ اہمیت ہے کہ ملا رموزی کی شخصیت اور فن کے بارے میں عام طور سے جو باتیں شہرت رکھتی تھیں اس کا بہت مدلل ثبوت فراہم کرنے کا کام پروفیسر موصوف نے کیا ہے اور ان کی کوشش کا پورا پورا ساتھ کونسل نے اپنے بینر تلے اس کلیات کو شائع کر کے دے دیا ہے۔ اس کی اہمیت یوں بھی ہے کہ اس کی مدد سے اور ملا رموزی کی تخلیقات کی بازیافت سے آج کا قاری اس دور کی نبضوں کو ٹٹولنے کی کوشش کر سکتا ہے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہوگی۔ پروفیسر موصوف اور کونسل دونوں ہی اس کتاب کو منظرِ عام پر لانے کے لیے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ تمام جلدوں کی کتابت و طباعت معیاری ہے۔

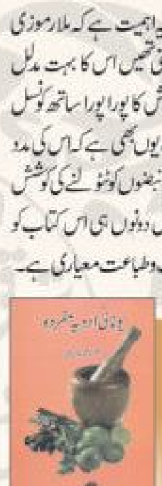

یونانی ادویہ مفردہ

مصنف: حکیم سید صفی الدین

مبصر: شمیم ارشاد اعظمی، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ علم الادویہ
اسٹیٹ یونانی میڈیکل کالج، الہ آباد

اردو زبان میں طب یونانی کے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھی گئی ہیں، جو مختلف اداروں سے شائع ہوئی ہیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اس سلسلہ کو مزید وسعت بخشی ہے۔ ادویہ مفردہ، معالجات، امراض نسواں واطفال، کلیات، تشریح ومنافع الاعضا، اور حفظان صحت جیسے اہم مضامین پر چالیس سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ حکیم صفی الدین کی لکھی 'ادویہ مفردہ' بھی اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس کتاب کا شمار طبی درسیات کی مقبول کتابوں میں ہوتا ہے۔ کونسل سے اس کی کئی اشاعتیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ راقم کے پیش نظر اس کی ساتویں طباعت ہے، جو 2013 میں کونسل سے شائع ہوئی ہے۔

یہ کتاب سنٹرل کونسل آف انڈین میڈیسن کے مجوزہ نصاب پر مشتمل ہے۔ کتاب میں نصاب سے متعلق نباتی، معدنی اور حیوانی ادویہ کو علاحدہ علاحدہ بیان کیا گیا ہے۔ اس میں مصنف نے کتاب کی وجہ تصنیف کو بیان کرتے ہوئے کتاب کی خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ دوسرے نمبر پر ادویہ نباتیہ، اس کے بعد ادویہ حیوانیہ پھر ادویہ معدنیہ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اصل کتاب یہیں پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد ادویہ اور ان کی مقدار خوراک، ادویہ اور ان کے افعال، چند اہم ادویہ اور ان کے مواقع استعمال اور آخیر میں فرہنگ ادویہ (نباتی ولاطینی نام) کو بیان کیا گیا ہے۔ آخر کتاب میں ضمیمہ کے طور پر مذکورہ معلومات کو ایک ہی مقام پر جمع کر دیا گیا ہے، جسے طلبا آسانی کے ساتھ ذہن نشین کر سکتے ہیں۔ یہ طریقہ امتحان کے نقطۂ نظر سے بھی نہایت مفید ہے۔ کتاب میں دواؤں کا تذکرہ حروف تہجی کے اعتبار سے کیا گیا ہے۔ پوری کتاب میں 417 ادویہ کا بیان ملتا ہے، ان میں 373 نباتی ادویہ، 15 حیوانی ادویہ اور 29 معدنی ادویہ شامل ہیں۔

مذکورہ کتاب کی چند خصوصیات ایسی ہیں جن کی بنیاد پر یہ دیگر کتب سے ممتاز اور منفرد نظر آتی ہے۔ اس لیے کہ اس سے قبل مفردات کی درسی کتاب کو اس قدر سائنٹفک انداز میں نہیں لکھا گیا تھا۔ اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ ماہیت ادویہ کو نہایت تفصیل اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اور جگہ جگہ ادویہ کی ماہیت کے اختلافی مسائل کو حل کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے، اس سلسلہ میں برنجاسف، برہمی، ترید، حب القلقل، دم الاخوین، رتن جوت، ریحان، زوفا، غافث، کنگی، کشوث، کمیلہ، گاؤزبان، مَن اور دیگر ادویہ قابل ذکر ہیں۔ بعض مقام پر ادویہ کے اندر ملاوٹ (Adulteration of Drug) کا بھی جزئی طور سے تذکرہ کیا گیا ہے۔ شناخت ادویہ میں مذکورہ چیزوں کو مستحضر رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ بازار میں فروخت ہونے والی دوائیں جس نام سے فروخت ہو رہی ہیں وہ حقیقت میں اصلی نہیں ہوتی ہیں بلکہ مذکورہ دوا کی کسی دوسری قسم یا اس میں اس جیسی شکل کی دوسری دوا کو شامل کر کے انہیں نقلی بنایا جاتا ہے۔ ظاہری بات ہے اس کے افعال تو اصلی دوا جیسے نہیں ہوں گے۔ مثال کے طور پر پیارانگا ہے۔ مصنف اس کی ماہیت کے ذیل میں لکھتے ہیں۔" یہ (پیارانگا) ہندستان میں پیدا ہونے والی ایک پودے کی جڑ ہے۔ بازار میں پیارانگا کی جڑوں کو مامیران کے بدلے میں فروخت کرتے ہیں۔ ان کو شناخت کرنا مشکل ہو جاتا ہے، اس لیے کہ سبھی ایک ہی شکل وصفات کے ہوتے ہیں۔"

اس کے علاوہ اس کتاب میں ادویہ کی شناخت، جائے وقوع، تولید وتناسل، طریقہ حصول پر بھی اجمالاً گفتگو کی گئی ہے، مگر یہ گفتگو چند ادویہ تک ہی محدود ہے۔ اگر تمام ادویہ کے ساتھ مذکورہ معلومات فراہم کی گئیں ہوتیں تو طلبا، اور اطبا، دونوں کے لیے زیادہ فائدہ مند ثابت ہوتیں۔ جیسے درمنہ ترکی کے حصول کے وقت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "غنچوں (درمنہ ترکی) کو جولائی اگست میں جمع کیا جاتا ہے اور چمکنیٹ (ترکستان کا ایک شہر) کو لایا جاتا ہے۔ تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ جولائی اگست میں جب یہ پھول آتے ہیں اسی دوران اس میں یہ جوہر (سنٹونین) ملتا ہے۔ ورنہ اس کے بعد بہت جلد غائب ہو جاتا ہے۔"

پیش نظر کتاب میں ہر دوا کو ذیل کی سرخیوں کے تحت بیان کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے دوا کا مشہور نام، مترادفات، دوا کے سائنسی رنباتی نام اور خاندان کا تذکرہ ہے۔ اس کے بعد دوا کی ماہیت، مزاج، افعال مواقع استعمال، ترکیب استعمال، مزید تحقیقات اور مشہور مرکبات کا ذکر ہے۔ ترکیب استعمال کے ذیل میں ہی دوا کی مقدار کو بیان کر دیا گیا ہے، اس کے علاوہ ضمیمہ میں مقدار خوراک کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں مضر، مصلح اور بدل کو نہیں بیان کیا گیا ہے، جبکہ سی سی آئی ایم کے مجوزہ نصاب تعلیم میں دوا سے متعلق ان کا تذکرہ ضروری ہے۔ ادویہ سے متعلق یہ چیزیں نہایت اہم ہیں اور علاج ومعالجہ میں کسی طبیب کے لیے ان کی واقفیت فرض کی حد تک ضروری ہے۔ مضر ادویہ کے بارے میں مصنف نے جن شکوک وشبہات کا اظہار کیا ہے وہ ان کا اپنا ذاتی خیال ہو سکتا ہے۔ اطباء قدیم نے بطور خاص اپنی مفردات کی کتابوں میں مضر و مصلح اور بدل ادویہ کے لکھنے کا اہتمام کیا ہے۔ قدیم لٹریچر میں یہ چیزیں محض خانہ پری کے طور پر شامل نہیں ہیں بلکہ ان چیزوں کو اطباء نے برسہا برس کے مشاہدہ کے بعد بیان کی ہیں۔ اگر یہ خانہ پری ہوتی تو تمام کتابوں میں ایک ہی جیسے مواد ملتے۔ لیکن ابن بیطار کی 'الجامع لمفردات الادویہ' اور اس طرح کی دیگر معیاری ومستند کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے کہ ایک ہی دوا کے مضرت کے بارے میں اطباء نے اپنے اپنے مشاہدہ اور تجربہ کے بعد الگ الگ باتیں لکھی ہیں۔

اسی طرح بعض مقام پر ادویہ کے نباتی نام نامکمل یا غلط لکھے ہوئے ہیں جیسے مدار، پنبہ دانہ، حب الزلم وغیرہ کے ذیل میں صرف ان کے جنس کو لکھ دیا گیا ہے اور کسی specis۔ کہیں کہیں نباتی نام بھی غلط لکھے ہیں جیسے عود کا نام aquittaria agabocha لکھا ہے جبکہ اس کا صحیح نباتی نام Aquilaria agallocha ہے۔ زیادہ ممکن ہے یہ کتابت کی غلطی ہو۔ تاہم اس کی تصحیح بہت ضروری ہے، کیونکہ یہ ایک نصابی کتاب ہے اور اس کے مضمرات سے طلباء ہمیشہ دوچار رہیں گے۔ اسی طرح 'مزید تحقیقات' کو اردو میں نہ لکھ کر انگریزی میں ہی لکھا جائے تو طلباء کے لیے زیادہ مناسب ونفع بخش ہے۔ جیسے ہرڑ کے تحت مزید تحقیقات میں ایک جوہر (الکیلائیڈ) 'مائروبیلے نین' لکھا ہے، اگر اس کو myrobalanine ہی لکھا جائے تو زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے۔

کتاب مجموعی طور سے طلباء و اطباء دونوں کے لیے بہت کار آمد ہے اور نصابی ضروریات کو پورا کر رہی ہے۔ کاغذ وطباعت بہت عمدہ ہیں۔ سرورق بھی بہت دیدہ زیب ہے اور موضوع کی بھرپور عکاسی کر رہا ہے۔

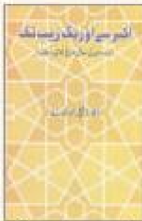

اکبر سے اورنگ زیب تک

مصنف: ڈبلو۔ ایچ۔ مور لینڈ، مترجم: جمال محمد صدیقی

صفحات: 420، قیمت: 185 روپے، سنہ اشاعت: 2016

مبصر: ارشاد قمر، اے، بی 452، پہلی منزل، امر پوری رام نگر، نبی کریم، پہاڑ گنج، نئی دہلی 55

اردو صرف شعر و شاعری کی زبان نہیں ہے بلکہ یہ ایک علمی زبان ہے۔ ادب کے علاوہ مختلف موضوعات اور بالخصوص جدید علوم و فنون سے متعلق کتابیں اور مضامین ترجمے اور دیگر ذرائع سے اردو میں منتقل ہوتے رہے ہیں۔ چونکہ بسا اوقات کچھ چیزیں کسی دیگر زبان میں ہوا کرتی ہیں جس کو سمجھنا مشکل ہوتا ہے اس وقت ترجمہ کی ضرورت پیش آتی ہے تاکہ اسے عام فہم زبان میں سمجھا جا سکے۔ اس کو مدنظر رکھتے ہوئے جمال محمد صدیقی نے اس اہم کتاب کو اردو میں ترجمہ کر کے اس کا پورا حق ادا کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے اور وہ ترجمہ کے نوک و پلک سے بخوبی واقف ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب 'اکبر سے اورنگ زیب تک' (ہندوستان کی معاشی تاریخ کا ایک مطالعہ) اس سلسلہ کی ایک مستحسن کوشش ہے۔ فاضل مصنف نے اکبر سے اورنگ زیب تک میں اس وقت کی معاشی صورت حال کا مکمل اور مبسوط انداز میں ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب: 'ایشیائی ماحول' کے عنوان سے ہے۔ اس باب کے تحت چار فصل ہیں۔ فصل اوّل میں سیاسی صورت حال، ثانی میں پرتگیزیوں کی سمندری مملکت، ثالث میں ولندیزوں اور انگریزوں کا ظہور اور فصل چہارم میں ولندیزیوں کا عروج اور پرتگیزیوں کا زوال، ان فصلوں کے تحت فاضل مترجم نے سیاسی صورت حال اور کس طرح ایک قوم دوسری قوم کو زیر کر کے آگے بڑھتی ہے اور اس سے معاشی اور اقتصادی میدان میں کیا فرق پڑتا ہے ان تمام باتوں کو خوش اسلوبی اور پورے تجزیے کے ساتھ پیش کیا ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس وقت کے ہندوستان کے معاشی حالات کیا تھے۔

دوسرا باب 'ہندوستان میں ولندیزی اور انگریزی تجارت میں ترقی' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں تین فصل ہیں۔ فصل اوّل میں ابتدائی کوشش اور ساحل کورومنڈل کی تجارتی کوٹھیاں، فصل ثانی میں پچھمی ہندوستان میں تجارتی کوٹھیاں، فصل ثالث میں بنگال کی طرف توسیع۔

تیسرا باب 'ہندوستان کی بدیسی تجارت میں تبدیلیاں' یہ باب چھ فصلوں پر محیط ہے۔ فصل اول: سترہویں صدی کے آغاز پر ہندوستان کی تجارتی حیثیت، فصل دوم: قوت خرید کی فراہمی، فصل سوم: کمپنیوں کی ایشیائی تجارت، فصل چہارم: درآمدی تجارت کی روش میں تبدیلیاں، فصل پنجم: ایشیا کی برآمدی تجارت میں تبدیلیاں، فصل ششم: ہندوستان میں جہازی باربرداری کا کاروبار۔ ان فصلوں کے تحت ہندوستان کی بدیسی تجارت میں کون کون سی تبدیلیاں رونما ہوئیں اور ہندوستان میں مزید کون کون سی چیزیں درآمد ہوئیں اور مالوں کے آمد و رفت میں کس طرح تیزی آئی اور وہ کون سی وجوہات تھیں کہ جن کی بنیاد پر ہندوستان تجارت کے شعبے میں اپنی چھاپ چھوڑ رہا تھا اور ہر چہار جانب سے تجار یہاں آ رہے تھے۔ ان باتوں کا اس باب میں مفصل ذکر ہے۔

چوتھا باب 'پچھمی یورپ میں نئی منڈیوں کا قیام' یہ باب چھ فصلوں پر مشتمل ہے۔ فصل اول: سترہویں صدی کے آغاز پر پچھمی یورپ کے ساتھ تجارت، فصل دوم: پچھمی یورپ کو برآمدی تجارت کی مقدار، فصل سوم: نیل، فصل چہارم: شورہ، فصل پنجم: سوتی سامان، فصل ششم: دیگر اشیا اور عمومی تبصرہ۔ ان فصلوں میں ان اشیا کا بیان ہے جو ہندوستان اور مغربی یورپ کے درمیان نئے تجارتی رشتوں کے لیے بنیادی حیثیت رکھتے تھے جیسے نیل، شورہ اور کیلیکو وغیرہ کیونکہ ان کے بغیر کسی نفع بخش تجارت کا قیام ممکن نہ تھا۔ لیکن ایک بار جب جہازوں کی آمد و رفت شروع ہو جاتی ہے تو ان کے علاوہ دوسرے سامانوں کے برآمد کے لیے بھی مواقع فراہم ہو جاتے ہیں۔

پانچواں باب: ہندوستانی منڈیوں کی روش۔ یہ باب چھ فصلوں پر محیط ہے۔ فصل اول: منڈیوں کی عمومی کیفیت، فصل دوم: اشخاص اور تنظیم، فصل سوم: گجرات میں نیل کی منڈی، فصل چہارم: درآمدہ سامانوں کے لیے منڈیاں، فصل پنجم: غذائی اجناس اور چاندی، فصل ششم: سونا اور تانبہ، ان فصلوں سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ پورے ملک میں منڈی کی معینہ قیمتیں ہیں جو رسد و طلب میں تغیرات کے ساتھ ساتھ مسلسل کم و بیش ہوا کرتی تھیں۔ ہم کھلے ذہنوں کے ساتھ ان چیزوں کا مطالعہ کریں تو ہم منڈیوں کے طریق عمل کو بہتر طور پر واضح کر سکتے ہیں۔ یہ بات دعوے سے کہی جا سکتی ہے کہ سیسہ یا پارہ یا مسالوں کی قیمت ہندوستانی آبادی کے لیے فی الجملہ بہت کم اہمیت رکھتی تھیں۔

چھٹا باب: پیداوار اور صرف۔ اس باب کے تحت دو فصل ہیں۔ فصل اوّل: پیداوار میں تبدیلیاں، فصل دوم: صرف۔ ان فصلوں میں مصنف نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ پیداوار میں تبدیلیاں کس طرح رونما ہوئیں اور ساتھ ہی ساتھ صرف کی کیا صورت حال تھی۔

ساتواں باب: قحط کے معاشی نتائج! یہ باب دو فصل پر مشتمل ہے۔ فصل اول: قحط سالیوں کی نوعیت اور ان کا تواتر، فصل دوم: 1630-31 کا قحط۔ اس باب میں سترہویں صدی کے ان قحطوں کا ذکر آتا ہے جو غذا کا قحط ہوا کرتا تھا۔ نا کہ کام کا۔ اس بڑے قحط کا فوری سبب 1630 میں بارش کی کمی تھی اور یہ کمی ہندوستان کے وسطی علاقہ میں پیش آئی۔

آٹھواں باب: نظم و نسق کے معاشی اثرات، یہ باب تین فصلوں پر محیط ہے۔ فصل اوّل: ہندوستانی صوبوں میں غیر ملکی تاجروں کی حیثیت، فصل دوم: ہندوستانی نظم و نسق کے طریقے، فصل سوم: جنوب میں اجارہ داری کا نظام، اس آخری باب کے تحت فاضل مصنف نے ہندوستانی صوبوں میں غیر ملکی تاجروں کی حیثیت کے بارے میں مفصل گفتگو کی ہے۔ مثلاً اگر کوئی غیر ملکی جیسے امریکی یا جاپانی تاجروں کی کمپنی ہندوستان کے کسی شہر میں اپنی تجارت کرنا چاہتی ہے تو اس سلسلے میں اس کے حقوق اور اس کی ذمہ داریاں پہلے سے واضح طور پر متعین ہونی چاہیے۔ کتاب کے بعض ابواب بہت دل چسپ ہیں۔ کتاب کے مطالعے سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ اکبر سے اورنگ زیب تک کیا سیاسی معاشی صورت حال تھی اور کن کن لوگوں کا اس میں حصہ تھا۔ یہ کتاب سترہویں صدی کے نصف اول کی تمام معاشی سرگرمیوں کا احاطہ کرتی ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں مختلف موضوعات پر اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ کونسل نے دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے جس کا بین ثبوت یہ کتاب ہے۔

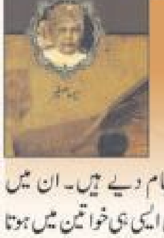

بیگم سلطان جہاں (مونوگراف)

مصنف: سیما صغیر

صفحات: 144، قیمت: -/83 روپے، سنہ اشاعت: 2016

مبصر: طلعت جمال، روڈ نمبر 2، گلی نمبر 4، کریم گنج، گیا

کائنات میں باصلاحیت اشخاص نے اہم کارنامے انجام دیے ہیں۔ ان میں عورت اور مرد کی کوئی قید نہیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم کا شمار بھی ایسی ہی خواتین میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے حوصلے اور صلاحیت کی بنیاد پر بڑے کارنامے انجام دیے اور اپنا نام روشن کیا۔ بھوپال ہندوستان کی واحد ایسی ریاست تھی جہاں چار پشتوں تک بیگمات کی حکمرانی رہی۔ اس کا سلسلہ نواب قدسیہ بیگم سے شروع ہوتا ہے۔ ان کے بعد ان کی بیٹی نواب سکندر جہاں بیگم حکمراں ہوئیں۔ ان کے بعد ان کی صاحبزادی نواب شاہ جہاں بیگم نے بھوپال کی عنان حکومت سنبھالی اور ان کی وفات کے بعد سلطان جہاں بیگم نے تخت و تاج سنبھالا۔ سکندر جہاں بیگم کی والدہ نواب شاہ جہاں بیگم علم سے محبت کرنے والی خاتون

تھیں۔ انھوں نے اپنے دورِ حکومت میں اسلامیات خصوصاً حدیث کی اہم اور نادر کتابوں کی اشاعت کے لیے مطبع شاہ جہانی قائم کیا اور لاکھوں کی تعداد میں قرآن مجید کے نسخے شائع کر کے مفت تقسیم کیے۔ سلطان جہاں بیگم انھیں کی صاحب زادی تھیں۔ ان کی پیدائش 1858 میں ہوئی۔ ان کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا گیا۔ انھیں قرآن کریم مع ترجمہ و تفسیر پڑھایا گیا۔ اس کے علاوہ اردو، فارسی، عربی اور انگریزی زبانیں سکھائی گئیں۔ امورِ خانہ داری نیز شہ سواری اور نشانہ بازی کے طور طریقوں سے بھی انھیں آگاہ کیا گیا۔ وہ پردے کی سخت پابند تھیں۔ زندگی کے آخری سالوں میں انھوں نے چہرے کا پردہ ترک کر دیا تھا۔

نواب سلطان جہاں بیگم کا دستِ سخاوت بہت کشادہ تھا۔ وہ معارف پروری میں اپنی مثال آپ تھیں۔ ریاست اور بیرونِ ریاست کے بہت سے علمی ادارے اور اربابِ فضل و کمال ان کی فراخدلی سے جاری تھے۔ علی گڑھ میں انھوں نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر دفتر کی عظیم الشان عمارت تعمیر کرائی۔ اس عمارت کا نام انھی کے نام پر 'سلطان جہاں منزل' رکھا گیا۔ 1330ھ میں شبلی نعمانی نے 'سیرۃ النبیؐ' لکھنے کا ارادہ کیا تو مالی مشکلات ان کے راستے میں حائل ہو گئیں اور انھوں نے قوم سے پچاس ہزار روپیہ فراہم کی اپیل کی۔ نواب سلطان جہاں بیگم کو معلوم ہوا تو انھوں نے یہ تمام رقم اپنے پاس سے دے دی اور علامہ شبلی کو دوسرے آستانوں سے بے نیاز کر دیا۔ سلطان جہاں بیگم طبِ یونانی کی بڑی حامی تھیں۔ آپ نے ریاست میں بہت سے یونانی شفاخانے قائم کیے۔ اس کے ساتھ ہی ایک مدرسہ 'طبیہ آصفیہ' کے نام سے قائم کیا، جس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں طبِ یونانی کے ساتھ سرجری کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔

قومی کونسل کے زیرِ اہتمام بہت سی اہم علمی، ادبی اور سماجی شخصیات کے مونوگراف تیار کرا کے شائع کیے گئے ہیں۔ اسی ضمن میں سلطان جہاں بیگم کا بھی مونوگراف شائع کیا گیا ہے۔ اسے محترمہ سیما صغیر نے تیار کیا ہے۔ مصنفہ نے اسے مختلف عناوین میں تقسیم کر کے سلطان جہاں بیگم کے شخصی خد و خال کو اجاگر کیا ہے۔ اس میں شخصیت و سوانح، خدماتِ علمی اور نظم و نسقِ ملکی، خواتین کی تعلیم و تربیت، تصنیف و تالیف، علی گڑھ سے خصوصی لگاؤ، ہندو مسلم اتحاد کی سعیِ جمیل اہم ہیں۔

مصنفہ سیما صغیر نے اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ ان کی زندگی کا کوئی پہلو اچھوتا نہ رہ جائے۔ انھوں نے ان کی تصنیفات کی ایک فہرست بھی مرتب کی ہے جن میں تزکِ سلطانی، گوہرِ اقبال، ہدایاتِ سلطانی، ہدیۃ الزوجین، حفظانِ صحت، معیشت خانہ داری، فرائض النساء، رہبرِ نسواں، بچوں کی پرورش اہم ہیں۔ انھوں نے دینیات، تاریخ، سوانح، فنون، ادب، ثقافت، اخلاقیات، تہذیب و تربیت، معاشیات، سیاحت، امورِ خانہ داری، صحتِ عامہ، تربیتِ خواتین، تربیتِ اطفال جیسے متنوع موضوعات سے متعلق جو کتابیں تصنیف کی ہیں وہ کافی اہم ہیں۔ خاص طور پر خواتین اور بچوں کے لیے ان کی تحریریں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔

سلطان جہاں بیگم کا علی گڑھ سے خصوصی لگاؤ رہا ہے۔ انھوں نے 1915 میں شمشاد مارکیٹ میں کانفرنس کمپاؤنڈ سے ملی ہوئی سلطان جہاں منزل بنوائی اور یہ پہلی خاتون ہیں جنھیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی چانسلر ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

محترمہ سیما صغیر نے بڑی محنت کے ساتھ سلطان جہاں بیگم کا سوانحی خاکہ اور ان کی خدمات کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اس میں معلومات کے ساتھ قاری کی دلچسپی کا سامان بھی موجود ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ مونوگراف پرانی شخصیات اور نئی نسل کے مابین تعارفی پل ثابت ہوگا۔

رام لعل حیات و فن (مونوگراف)

مصنف: مظہر محمود

صفحات: 209، قیمت: 105 روپے، سنہ اشاعت: 2016

مبصر: ڈاکٹر عبدالسلام صدیقی

N-139,B1 ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی 25

رام لعل کا شمار اردو کے اہم ترقی پسند افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے افسانوں کے ساتھ ساتھ ناول، سفرنامے، تنقیدی مضامین اور خاکے بھی لکھے ہیں۔ ان سب کے علاوہ ریڈیائی ڈرامے بھی لکھے اور ادبی ڈائری بھی تحریر کی۔ ان کی مادری زبان پنجابی کے بجائے سرائیکی تھی مگر انھوں نے اردو زبان کو اپنی تخلیق کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔

رام لعل کا پورا نام رام لعل چھابڑا تھا۔ ان کے والد محترم کا نام چھمن داس چھابڑا تھا۔ ان کی ولادت 3 مارچ 1923 کو غیر منقسم ہندوستان کے ایک مقام میانوالی میں ہوئی یہاں کی زبان پنجابی نہ ہو کر سرائیکی تھی جو علاقائی زبان تھی۔ ان کا فطری رجحان مصوری کے علاوہ تاریخی مطالعے کی طرف تھا۔ ان کے پورے خاندان میں کوئی شاعر ادیب اور فنکار نہیں تھا اس کے باوجود اردو، ہندی اور انگلش زبانوں میں میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھوں نے اپنے تخلیقی اظہار کے لیے اردو زبان میں افسانے لکھنے شروع کیے اور بہت کم عرصے میں برصغیر کے اس بڑی اور زندہ زبان کے مشہور و مقبول افسانہ نگار بن گئے۔

ڈاکٹر مظہر محمود نے رام لعل پر تحریر کردہ مونوگراف کو سات ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں ان کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کی پیدائش، خاندان، تعلیم و تربیت، شادی اور اولاد وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں رام لعل کی ادبی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے ادبی رجحان، افسانوں سے ان کی ادبی زندگی کا آغاز بتایا گیا ہے۔ اسی حصے میں اس دور کے مشہور افسانہ نگاروں کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں مفکرانہ اسلوب، زبان و بیان، نگاہ کی تیزی مختلف طرح کی منظر کشی، نقاشی اور مصوری کو پیش کیا گیا ہے۔ ان کی بصیرت اور بصارت پر روشنی حوالوں کے ساتھ ڈالی گئی ہے۔ اسی باب میں ان کی افسانہ نگاری کی خصوصیات اور ہر قسم کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی تبدیلیوں کی جا بجا نشاندہی کی گئی ہے۔ چوتھا باب 'تقسیمِ ہند سے پیدا شدہ حالات اور ان کے افسانے' پر مبنی ہے جس میں رام لعل نے دو قومی نظریے کے حامیوں اور متحدہ ہندوستان کے چاہنے والوں کے درمیان شدید رسہ کشی کے رجحان کو پیش کیا ہے۔ پانچویں باب میں سفرنامے پیش کیے گئے ہیں جو زیادہ تر ان کے ریلوے کی ملازمت سے متعلق ہیں۔ چھٹے باب میں ادبی مقام کے سلسلے میں رام لعل کو کرشن چندر اور اے۔ حمید کے برابر دکھایا گیا ہے۔ ان کا شمار کرشن چندر، عصمت، منٹو اور بیدی جیسے اردو افسانے کے لیجنڈس کے بعد ابھرنے والی نسل کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اردو زبان کو 500 سے زیادہ افسانے دیے۔ آخری باب میں ان کی منتخب کہانیاں پیش کی گئی ہیں۔ جن میں" ایک ہزار بچوں والی ماں، ایک شہر ایک بدن، گزرتے لمحوں کی چاپ، ہسٹری شیٹر، مڈنائٹ سن، نئی دھرتی پرانے گیت، نصیب جلی، تھوڑا سا زہر اور او۔ ی۔ بہت مشہور ہیں۔ ان میں زیادہ تر کہانیوں میں دیہی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔

اس طرح رام لعل حیات و فن مونوگراف ہر اعتبار سے ایک کامیاب مونوگراف ہے۔ اسلوب اور فن سے متعلق پر مغز معلومات فراہم کی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ مشہور فنکاروں اور نقادوں کے تاثرات بھی حوالے کے طور پر پیش کیے ہیں۔ امید ہے کہ کونسل کی دیگر کتابوں کی طرح اس کی بھی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی اور عوام و خواص اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنون لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی - 110066
NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com,sales@ncpulin

چنیدہ

شاعر: مظفر حنفی

صفحات: 366، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2015

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: ممتاز الحق، E-227، ابوالفضل انکلیو II، نئی دہلی 25

مظفر حنفی کے تیرہ شعری مجموعوں کے علاوہ ہندی رسم الخط میں ایک مجموعہ منتخب غزلوں کا انگریزی ترجمہ، تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل کلیات کی دو جلدیں اور موضوعاتی اشعار پر مبنی ایک مجموعہ منظر عام پر آچکا ہے، اتنا کچھ پیش کرنے کے بعد 'چنیدہ' کی اب ضرورت کیا تھی خود لکھتے ہیں:

''تنقید چیں بر جبیں ہے کہ میں اتنا زیادہ کیوں کہتا ہوں ادھر یہ عالم ہے کہ 79 برس کا ہوگیا ہوں لیکن سینے میں لاوا ویسے ہی کھول رہا ہے:

عمر کے آٹھویں عشرے میں کرو سجدۂ شکر
طبع کو اس نے جو طغیانی پہ رکھا ہوا ہے

چنانچہ تنقید کو اپنی سی کہنے دو تخلیق اپنی راہ کھوٹی نہیں کرے گی البتہ احباب کی یہ بات جی کو لگتی ہے کہ آج کے قاری کو اتنا بہت سا پڑھنے کی فرصت نہیں ہے اس لیے ایک سخت اور جامع انتخاب کی ضرورت ہے جو شاعر کے نمائندہ کلام کی حیثیت رکھتا ہو، چنیدہ کی اشاعت کا بس یہی جواز ہے۔'' (مظفر حنفی)

چنیدہ مجموعی طور پر غزلیات کا انتخاب ہے البتہ ابتدا میں چند رباعیات، ایک حمد اور ایک نعت بھی شامل کردی گئی ہے۔ غزلیات کے لیے 355 صفحات وقف ہیں ہر صفحے پر دو غزل کے حساب سے غزلوں کی کل تعداد 710 ہوتی ہے۔ مظفر حنفی کی پہلی شناخت ان کی پرگوئی اور قادرالکلامی ہے جس کا اعتراف تقریباً بھی ناقدین نے کیا ہے۔

کلاسیکی غزل کے توانا پہلو کے ساتھ مظفر حنفی نے منفی رجحانات پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔ غزل کے انفعالی پہلو گریہ و ماتم، مایوسی و نامرادی، پژمردگی، محرومی قسمت کا رونا، ناسازگاری زمانہ کی شکایت، معشوق کی یاد میں آنسو بہانا، صحرا کی خاک چھاننا، موت، قبر، کفن وغیرہ کا ذکر بار بار کرنا، ان رویوں کے خلاف ایک توانا آہنگ اور زندگی کے تئیں مثبت فکر ان کی غزل کی پہچان رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خلیل الرحمان اعظمی نے ان کی غزل کی نمایاں خصوصیت اس کا غیر رومانی لہجہ بتایا ہے۔

زبان و بیان پر مظفر حنفی کی گرفت بہت مضبوط ہے۔ عام طور پر انھوں نے بول چال کی زبان کا استعمال کیا ہے، تصنع، تکلف اور آرائشی زبان سے پرہیز کے بعد بھی ان کا اپنا لہجہ اور آہنگ شعر کو بامعنی اور پر اثر بنا دیتا ہے۔ اکثر مقامات پر شعری کردار کے عادات واطوار کے مطابق زبان کا بھی استعمال کرنے سے انھیں گریز نہیں، مشہور داستانوں کے واقعات و کردار کی مدد سے ہم عصر زندگی کے مسائل پیش کرنے میں بھی انھیں مہارت حاصل ہے۔ لہجے کی بے ساختگی اور حقیقت آمیز روش کے باعث ان کے اشعار میں نثری منطق بہت نمایاں ہے جس کا نتیجہ ہے کہ ان کے یہاں سہل ممتنع کی مثالیں کافی ملتی ہیں:

چاندنی سی جگمگ ہوگی جہاں وہ ہوئیں گے — ہوئیں گے ہم جس جگہ، بادل برستا ہوئے گا
اور پھر پانچویں درویش کی باری آئی — باغ افسانہ میں ندرت کی سواری آئی
ترستی رہی روشنی کو نگاہیں — چمکتے رہے چاند تارے وغیرہ
کیوں اڑے ہو چٹان کی مانند — تم بھی جھرنے کے ساتھ ہو لو نا

اجنبی اور نئے نئے ردیف قافیوں کی تلاش میں مظفر حنفی کافی مشقت اٹھاتے ہیں، سخت زمینوں کو پانی کر دینا ان کی ہنرمندی کی دلیل ہے۔

مظفر حنفی کی شاعری پر ابتدائی دور میں شاد عارفی کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں مگر وہ بہت جلد اپنی ایک الگ شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ ترقی پسندی اور جدید شعری رجحان کا بھی انھوں نے بغور مطالعہ کیا اور اس کے اثرات بھی کسی حد تک قبول کیے مگر کہیں بھی اپنی ترجیحات وفکر سے سمجھوتا نہیں کیا۔ ایک قادرالکلام شاعر کے یہاں انفرادیت کے کئی رنگ ہمیں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ناقد یا قاری اپنی افتادِ طبع، اور ذوق کے مطابق ان میں سے کسی ایک رنگ کا انتخاب کرلیتا ہے اور اسی کو شاعر کا امتیاز سمجھتا ہے۔ کسی کے لیے مظفر حنفی کی سادہ زبان اہم ہے کوئی ان کے لہجے کو ان کی شناخت قرار دیتا ہے کسی کے لیے ان کا طنزیہ اسلوب ان کی شاعری کا جوہر ہے۔ آل احمد سرور کا خیال ہے کہ ان کے اشعار میں دھیمی بہنے والی جوئے آب کی سی سوئی ہوئی روانی نہیں ہے، پہاڑی چشمے کی سی تند و تیز لہر ہے... اس میں کچھ توڑنے اور پھر کچھ جوڑنے کی بات بھی ہے اس میں بگاڑ اور نئے سرے سے بناؤ کی داستان بھی ہے۔

شاعر کی دیگر خصوصیات مثلاً استعارہ سازی، پیکر تراشی اور علامت نگاری وغیرہ کے ضمن میں اگر بات کریں تو بھی مظفر حنفی کی شاعری ہمیں مایوس نہیں کرتی البتہ وہ محض آرائش کے لیے شعر نہیں کہتے۔ منظر اعجاز نے پیکر تراشی کے حوالے سے ان کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ بصری اور لمسی پیکروں کے ساتھ حس شامہ کو متاثر کرنے والے پیکر بھی ان کے ہاں نظر آتے ہیں اور بیشتر انھوں نے حرکی پیکروں کا استعمال کیا ہے۔

مظفر حنفی کے یہاں ایسے موضوعاتی اشعار بڑی تعداد میں ملتے ہیں جنھیں مختلف مواقع پر استعمال کیا جاسکتا ہے مثلاً محنت کش طبقے کی حمایت میں یہ شعر دیکھیں:

محنت کسی کی نام کسی کا ہوا بلند — ذرّے سمٹ گئے تو بگولا ہوا بلند

یہ شعر بھی قابل غور ہے:

طوفاں سے کیا باتیں کی ہیں پیارے مانجھی سچ بتلانا
دریا کو گروی رکھا ہے، یا ساحل کو بیچ دیا ہے

ایجاز واختصار غزل کا فن ہے، غزل تفصیلات کی متحمل نہیں، مگر 'چنیدہ' میں ایسے بے شمار اشعار مل جائیں گے جس میں کسی واقعے یا حادثے کا ذکر ہے بلکہ کہیں کہیں تو ہم ان واقعات کی تاریخ بھی بتا سکتے ہیں۔ مظفر حنفی کا کمال ہے کہ واقعاتی فضا کے باوجود شعریت بہرحال قائم رہتی ہے۔

امید ہے کہ نئی نسل کے قاری اور ریسرچ اسکالر چنیدہ سے بھرپور استفادہ کریں گے۔

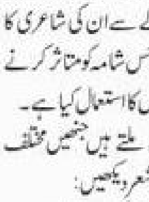

قطب شاہی دور میں اردو غزل

مصنف: محمد علی اثر

ضخامت: 200 صفحات، قیمت: 250 روپے

ناشر: محمد علی اثر 20-4-226/9 محبوب چوک، حیدرآباد 500002

مبصر: عبدالرزاق زیادی، 121، چندر بھاگا ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

پروفیسر محمد علی اثر کا نام ادب کے قارئین کے لیے محتاج تعارف نہیں۔ علمی وادبی حلقے میں ان کی شناخت ایک ممتاز محقق، نقاد اور ناقد اور خوش گو شاعر کی حیثیت سے ہے۔ اب تک ان کی پانچ درجن سے زائد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ محمد علی اثر کی تصنیفات کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بیشتر کتابیں دکنی ادب کی تحقیق، تدوین اور تنقید پر مشتمل ہیں۔ صرف دکنیات پر ان کی 38 کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا شمار بقول پروفیسر مغنی تبسم دکنیات کے چند اہم ماہرین میں ہوتا ہے۔ پروفیسر محمد علی اثر کی یہی وہ علمی وادبی اور تحقیقی خدمات ہیں جن کے اعتراف میں انھیں متعدد حکومتی اداروں کی جانب سے مختلف اعزازات واکرامات سے نوازا جاچکا ہے اور ان پر دو درجن سے زائد کتابیں، تحقیقی مقالے اور مختلف رسالوں کے خصوصی شمارے بھی شائع ہوچکے ہیں۔

دکنی ادب کے اسی تحقیقی وتنقیدی سلسلے کی ایک اہم کڑی زیر تبصرہ کتاب 'قطب شاہی دور

میں اردو غزل' بھی ہے۔ حالانکہ اس سے قبل تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ یعنی قطب شاہی کے بجائے 'عادل شاہی دور میں اردو غزل' کے نام سے پروفیسر محمد علی اثر کی ایک اہم تصنیف سامنے آچکی ہے جس کی قارئین میں بڑی پذیرائی ہوئی۔ پیش نظر کتاب کو معنوی اعتبار سے اسی تسلسل کا ایک حصہ کہا جاسکتا ہے۔ زیر مطالعہ کتاب 'قطب شاہی دور میں اردو غزل' میں مصنف نے ،جیسا کہ اس کے نام سے ہی ظاہر ہے، گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت میں نشو ونما پانے والی اردو غزل گوئی کا بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ جائزہ پیش کیا ہے۔

پیش لفظ اور پیش گفتار کے علاوہ یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب 'اردو غزل قطب شاہی عہد سے پہلے' کے عنوان سے ہے۔اس میں مصنف نے غزل کی لغوی و اصطلاحی تعریف کے ساتھ ساتھ اس کے ماخذ، فنی لوازمات اور تکنیک پر بڑی وضاحت کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ نیز اس میں انھوں نے دکنی زبان میں اس صنف کا منبع قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں کی پیش رو بہمنی سلطنت کو قرار دیا ہے اور اس دور سے تعلق رکھنے والے غزل گو شعرا مشتاق، لطفی، فیروز قریشی، حافظ، جعفر، گستاخ اور فدائی کو غزل کا نمائندہ شاعر قرار دیا ہے۔

دوسرا باب 'قطب شاہی دور کا تاریخی، سماجی اور تہذیبی منظر نامہ' ہے۔ اس باب کو اس کتاب کا پس منظری باب تصور کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ مصنف نے اس میں گولکنڈہ میں قطب شاہی سلطنت کی تاسیس و استحکام اور اس کے بانی سلطان قلی قطب سے لے کر اس کے آخری فرمانروا سلطان ابو الحسن تانا شاہ تک تمام قطب شاہی سلاطین کی حکومت کا سرسری جائزہ پیش کیا ہے۔ کتاب کا تیسرا باب قطب شاہی دور کے اولین غزل گو شعرا کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں دبستان گولکنڈہ کے اولین غزل گو شعرا سے بحث کی گئی ہے اور اولین غزل گو شعرا میں فیروز، ملا خیالی، سید محمود اور شیخ احمد گجراتی کو شامل کیا گیا ہے۔

'قطب شاہی غزل کا عہد عروج' اس کتاب کا چوتھا باب ہے اور کئی اعتبار سے یہ اس کتاب کا سب سے اہم باب ہے۔ اس میں مصنف موصوف نے قطب شاہی دور کے پانچ اہم غزل گو شعرا ملا وجہی، سلطان محمد قلی قطب شاہ، ملا غواصی، سلطان عبداللہ قطب شاہ اور صوفی شاعر شاہ سلطان ثانی کا نہ صرف تعارف پیش کیا ہے بلکہ ان کی غزل گوئی کی امتیازی خصوصیات پر بھی بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے۔

'قطب شاہی دور کے دیگر غزلین' کتاب کا آخری باب ہے۔ اس میں سالک، یزدی، خدا نما، ابن نشاطی، طبعی، تانا شاہ اور عطائی وغیرہ کے نام کے ساتھ ساتھ ان کی غزلیں بھی شامل ہیں۔ اس باب کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ طلبا و اساتذہ کی آسانی کے لیے مصنف نے متذکرہ بالا شعرا میں سے جن کی غزلیں نو دریافت یا نایاب کی حیثیت رکھتی ہیں ان کے مکمل متن کو ان کے محققین کے تفصیلی ذکر کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔

ان ابواب کے علاوہ پروفیسر محمد نسیم الدین فریس کا تحریر کردہ پیش گفتار اور ڈاکٹر راحت سلطانہ کا محمد علی اثر پر لکھا ہوا سوانحی خاکہ بھی بے حد اہم ہیں۔ ان سے کتاب کے علاوہ محمد علی اثر کی علمی و ادبی شخصیت کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔ کتاب کی طباعت بے حد عمدہ اور حسین و دلکش ہے۔ کتاب کی قدر و قیمت اور ضخامت کے اعتبار سے قیمت بھی بہت مناسب ہے۔

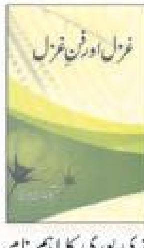

غزل اور فن غزل

مصنف: ظہیر غازی پوری

صفحات: 160، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2015

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

مبصر: امیر حمزہ L-11/14 حاجی کالونی، جامعہ نگر، نئی دہلی 25

موجودہ وقت میں اردو کے کہنہ مشق استاد شعرا میں ظہیر غازی پوری کا اہم نام ہے۔ ان کی شناخت جہاں ایک شاعر کے طور پر ہے وہیں غزل کے اہم ناقد کے طور پر اردو دنیا میں مقبول و معروف ہیں۔ ان کے قلم سے اکثر تحریریں شاعری کی فنی باریکیوں پر اس بے استادی کے دور میں پختہ و ناپختہ شاعر کو متوجہ اور متنبہ کرنے کے لیے معرض وجود میں آتی رہتی ہیں۔ وہ اکثر اپنی تحریر کو بہت ہی جانچ پرکھ کے بعد قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

مصنف کی زیر تبصرہ کتاب گیارہ عنوانات پر مشتمل ہے۔ سب سے پہلے 'جدید اردو غزل کا دوسرا رخ' میں جہاں وہ موجودہ غزل کی بہت ساری خوبیوں کو شمار کرواتے ہیں وہیں وہ فنی طور پر ناکام رہنے والوں سے نالاں نظر آتے ہیں۔ لکھتے ہیں ''دراصل جدید غزل سے ان لوگوں کو زیادہ نقصان پہنچا ہے جو شعری اور فنی تقاضوں سے پوری طرح واقفیت نہیں رکھتے''۔ ''آج ابہام کو ہنر سمجھا جانے لگا ہے۔ بات صرف ابہام تک محدود ہوتی تو زیادہ خطرہ نہ تھا لیکن اب تو قوافی، اوزان، تعقید، اور اضافت کے معمولی معائب بھی جا بجا اشعار میں مل جاتے ہیں اور بے ساختہ ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے'' (ص 19)۔

اس کے بعد 'غزل ایک جانب دار صنف سخن' میں غزل کے اوصاف و خصائص کو شمار کرواتے ہوئے اس کی بھرپور وکالت کرتے ہیں۔ 'نیم وحشی صنف شاعری' کلیم الدین احمد کے اس قول کا منطقی جواب دیتے ہیں۔ اسی کڑی کو وہ آگے 'صنف غزل میں مسلسل یلغار' میں بڑھاتے ہیں۔ اس میں وہ ستیہ پال آنند کے مضمون 'کہی گئی یا بنائی گئی شاعری' جو ماہنامہ صریر کراچی میں شائع ہوا تھا پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہیں۔ اپنی اس گفتگو میں وہ افتخار امام صدیقی، عزیز پریہار، مخمور سعیدی، مصور سبزواری، پروفیسر محمد حسن، زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی، رام لعل، ڈاکٹر اسلم حنیف، پرتپال سنگھ بیتاب، جمیل فاطمی، اندر موہن کیف وغیرہ کو ان کی تحریروں کے ساتھ شامل کرتے ہیں۔ اس پوری بحث میں جو بھی غزل میں یلغار کرتا ہے یا خواہش مند ہے اس کے لیے تسلی بخش جواب ہے۔ 'نئی غزل میں تخلیقی لفظ و زبان' پر بحث کرتے ہوئے مصنف نے لفظ و معنی اور موضوع پر بھی بحث کی ہے۔ عروضی و فنی معائب تحریر کرتے ہوئے مصنف کا تاثر یہ ہوتا ہے کہ جدید شاعروں میں اکثر یہ خامیاں کسی باریک بین فن کار استاد شاعر سے تلمذ اختیار نہ کرنے اور مشورہ نہ لینے کی وجہ سے نظر آتی ہیں۔ اس میں انہوں نے شعری جلی و خفی فنی کمیوں کو پیش کیا ہے جو اکثر عدم توجہی او ر لاعلمی میں شاعر سے سرزد ہوتی رہتی ہیں۔

اس کتاب میں مصنف نے جہاں کئی فنی خوبیوں اور کوتاہیوں کو بیان کیا ہے وہیں خصوصی طور پر ایطا کا تفصیلی ذکر بھی ہے۔ ایطاء جو شعری اصطلاح میں ایک غلطی کا نام ہے اس کی تفصیلی تعریف استاد شعراء کی تحریروں سے نقل کرتے ہیں پھر مصنف اس کی تمام فنی باریکیوں پر سیر حاصل بحث کرتے ہیں اور تمام بڑے شعراء کے کلام میں ایطائے جلی و خفی کو پاتے ہیں۔ جس سے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ایطاء کوئی بڑا عیب نہیں ہے۔ اس کے بعد ردیف و قوافی کے مسائل بھی تحریر کرتے ہیں۔

اخیر میں 'غزل چہرہ آئینہ در آئینہ' کے عنوان سے غزل کی تمام پرتوں کو مشہور ناقدین شعر کے حوالے سے اپنے خیالات و نظریات کو مزین کر کے پیش کرتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب سے پہلے ان کی تین کتابیں تنقید کی دنیا میں اپنا مقام بنا چکی ہیں۔ ان میں سے خصوصاً ''مطالعہ اقبال کے چند اہم پہلو'' اپنے موضوع میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ شاعری میں کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، رباعی کا بھی ایک مجموعہ 'دعوت صد نشتر' 1997 میں منظر عام پر آیا۔

الغرض کتاب کے مطالعہ کے بعد قاری کو یہ احساس ہوتا ہے کہ ایک عرصہ کی طویل محنت و مشقت اور جانفشانی کے بعد اس کتاب کو مارکیٹ میں لایا گیا ہے جو یقیناً شاعروں اور غزل شناس حضرات کے لیے ایک بیش قیمت تحفہ ہے۔

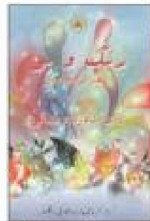

رنگ و بو

مصنف: ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی

صفحات: 136، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2015
ناشر: کرناٹک اردو اکادمی، کنڑا بھون، جے سی روڈ، بنگلور
مبصر: ڈاکٹر تابش مہدی، G5/A، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی بہار کے مردم خیز ضلع گیا کے ایک معزز، روحانی اور اہل علم خانوادے کے چشم و چراغ ہیں۔ خاندانی روایت کے مطابق انھوں نے بھی علم و ادب سے اپنا ذہنی وفکری رشتہ استوار رکھا ہے۔

زیرِ نظر کتاب 'رنگ و بو' ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی کی کوئی مستقل تصنیف نہیں بلکہ ان کے ان کتابی تبصروں کا مجموعہ ہے، جو وہ وقتاً فوقتاً مختلف مصنفین کی کتابوں پر کرتے رہے ہیں اور وہ جرائد و رسائل میں شائع بھی ہوتے رہے ہیں۔

مصنف نے تبصروں کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے پہلے حصے میں وہ تبصرے ہیں جو نثری کتابوں پر مشتمل ہیں اور دوسرے حصے میں شعری مجموعوں پر کیے گئے تبصروں کو رکھا گیا ہے۔ نثری کتابوں میں سب سے پہلے پروفیسر گوپی چند نارنگ کی کتاب 'اردو زبان اور لسانیات' کو رکھا ہے، جسے رام پور، رضا لائبریری رام پور نے 2006 میں شائع کیا تھا۔ دوسرے تبصروں کے مقابلے میں یہ تبصرہ قدرے تفصیلی ہے۔

شاہ رشاد عثمانی نے ماہر لسانیات مرزا خلیل احمد بیگ کے اس بیان کو خصوصی اہمیت دی ہے:

''پروفیسر گوپی چند نارنگ، جنھوں نے لسانیات جدید کی تربیت امریکا کی وسکانسن اور انڈیانا یونیورسٹیوں میں قیام کرکے حاصل کی ہے، ہمارے عہد کے جید عالم زبان و ادب اور بین الاقوامی نقاد و دانش ور ہیں۔ لسانیات و صوتیات سے انھیں گہری دل چسپی ہے۔ انھوں نے پچھلے دو دہوں کے دوران ادبی تنقید کے لسانی مضمرات پر کافی غور و فکر سے کام لیا ہے اور تنقید کے اُن تمام مسالک کو اپنے مطالعے کا موضوع بنایا ہے، جن کا رشتہ کسی نہ کسی اعتبار سے زبان یا لسانیات سے استوار ہے۔''

مشہور محقق و انشا پرداز خواجہ مرحوم سے متعلق ساحر شیوی و صابر ارشاد عثمانی کی کتاب 'متعلقات مشفق خواجہ' پر تبصرے کے ذیل میں شاہ رشاد عثمانی کے اس بیان نے خاصا محظوظ کیا کہ ''مشفق خواجہ جہاں حلقہ یاراں میں مشفق و مہربان ہیں اور خواجہ ادب نواز ہیں، وہیں دوسری طرف ادب کے وہ محمود غزنوی دکھائی دیتے ہیں، جس نے ادب کے قدآور لات و منات کی بت شکنی کی تاکہ ہمیشہ حقیقی ادب کی خدائی اور سچائی کا بول بالا ہو۔''

ڈاکٹر سید عبداللہ عباس ندوی کی کتاب 'ردائے رحمت' محسن عثمانی ندوی کی کتاب 'مطالعہ شعر و ادب'، شاہ بلال احمد قادری کی کتاب 'سوانح حضرت شاہ امان اللہ قادری' اور ابن فرید کی کتاب 'یہ جہاں اور ہے' پر بھی شاہ رشاد عثمانی کے تبصروں نے متاثر و محظوظ کیا۔ البتہ شعری حصے کے بارے میں میرا خیال ہے کہ جو ناقدین شاعری سے تعلق نہیں رکھتے انھیں شاعری پر نقد یا تبصرے سے گریز کرنا چاہیے۔ حق نہیں ادا ہو پاتا ہے۔

مجموعی طور پر ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی کے یہ تبصرے درج ذیل عناصر پر مشتمل ہیں: کتاب اور مصنف کا اجمالی تعارف، مصنف کے نظریہ و فکر کی نشان دہی، کتاب کے اہم نکات سے قاری کی باخبری اور کتاب کی مجموعی فضا یا مقصد تصنیف سے آگاہی۔ شاہ رشاد عثمانی کے تبصروں کی سب سے بڑی خوبی میرے نزدیک یہ ہے کہ ان کے ہاں عصبیت اور تنگ نظری نہیں ملتی۔ وہ ذہنی و فکری طور پر اسلامی ادب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کا برملا اظہار بھی کرتے رہتے ہیں، لیکن ادب کی اس فکر کو وہ صرف اپنی یا اپنے گروہ کی میراث نہیں سمجھتے۔ انھیں جہاں بھی یہ چیز ملتی ہے، اس کی نشان دہی بھی کرتے ہیں اور تحسین و اعتراف میں بھی سخاوت سے کام لیتے ہیں۔ میں 'رنگ و بو' کی اشاعت پر ڈاکٹر رشاد عثمانی کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور کرناٹک اردو اکادمی بنگلور کے اس اقدام کی تحسین کرتا ہوں کہ اس نے اس قیمتی ذخیرے کو اپنے اشاعتی پروگرام میں شامل کیا۔

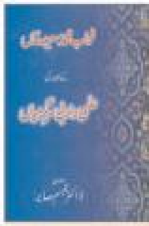

نواب محمد سعید خاں کے عہد کی علمی و ادبی سرگرمیاں

مصنف و ناشر: ڈاکٹر تبسم صابر

صفحات: 550، قیمت: 283، سال اشاعت: 2015
مبصر: ڈاکٹر ظہیر رحمتی، ذاکر حسین دہلی کالج، دہلی

ڈاکٹر صابر دبستان رامپور کی ان معدودے چند نوجوان محققین میں سے ہیں جنھوں نے اپنی کم عمری کے باوجود وقیع علمی اور تحقیقی کاموں کو سرانجام دے کر دبستان رامپور کی مستحکم علمی روایت کو مزید استحکام بخشا ہے۔ رامپور جیسی سرزمین کی ایک نوجوان محققہ نے یہ ثابت کر دکھایا کہ سچی علمی لگن ہر طرح کی پابندیوں کے باوجود بھی کارہائے نمایاں انجام دینے میں مکمل آزاد ہوتی ہے۔ ڈاکٹر تبسم صابر بنیادی طور پر عربی زبان و ادب کی اسکالر ہیں۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے 'مفتی محمد سعد اللہ مرادآبادی کی علوم عربیہ میں خدمات' کے موضوع پر عربی زبان میں اپنی ڈاکٹریٹ کی سند مکمل کی ہے اور اپنے موضوع کا پورا حق ادا کیا ہے۔

زیرِ نظر کتاب 'نواب محمد سعید خاں کے عہد کی علمی و ادبی سرگرمیاں' مصنفہ کی ایسی تحقیق ہے جس میں انھوں نے نواب محمد سعید خاں کے 15 سالہ دور کا بھرپور محاکمہ کیا ہے۔ دراصل نواب محمد سعید خاں کا عہد دبستان رامپور کی تاریخ میں اس اعتبار سے بہت اہم اور نمایاں ہے کہ ان سے قبل کا تقریباً چالیس سالہ دور بدامنی اور افراتفری کا شکار رہا جو علمی و ادبی سرگرمیوں کے لیے ناموافق تھا۔ نواب محمد سعید خاں کے 15 سالہ دور میں دبستان رامپور کی مستحکم علمی روایت کا احیا ہوا اور بڑے وقیع کارنامے منظر عام پر آئے۔ اسی عہد میں رامپور رضا لائبریری رامپور جو کہ نوابین کا ذاتی کتب خانہ تھا اس کے نوادرات میں قابل قدر اضافے ہوئے۔ زیرِ نظر کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے جن کے کئی ذیلی ابواب ہیں:

پہلا باب 'ریاست رامپور کا علمی و ادبی پس منظر' میں مصنفہ نے ریاست رامپور کے قیام کا ذکر کرتے ہوئے نواب فیض اللہ خاں کی علمی دوستی اور ان کے دربار سے وابستہ اہم ادبا، شعرا اور علما کا ذکر کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی بعد کے نوابین کے دور میں علمی و ادبی کارناموں کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ دوسرا باب 'نواب محمد سعید خاں اور ان کا عہد حکومت' میں مصنفہ نے نواب موصوف کے عہد کی سیاسی اور سماجی صورت حال کے ساتھ ان کے حسن تدبیر اور مستحکم انتظامی امور کا بیان کیا ہے۔ تیسرا باب 'نواب محمد سعید خاں کے عہد کی علمی سرگرمیاں' میں مصنفہ نے مختلف عنوانات کے تحت اس عہد میں سرانجام ہونے والے علمی کارناموں کو اجاگر کیا ہے۔ 'حفظ، تجوید و قرأت' کے تحت مصنفہ نے اس بات کا بجا طور پر اظہار کیا ہے کہ روہیل کھنڈ میں فن تجوید و قرأت پر ہمیشہ سے خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ افغانی روہیلہ مذہب اسلام سے جو عقیدت و شیفتگی رکھتے تھے اسی وجہ سے ریاست رامپور میں بھی علم دین پر ازحد توجہ مرکوز رہی ہے۔ نواب محمد سعید خاں کے عہد میں جید علما اور قراء ریاست میں مقیم تھے۔ ریاست جن کی خاطر خواہ پذیرائی کرتی تھی۔ مولانا فضل حق خیرآبادی اسی عہد کی دین ہیں مصنفہ نے اس باب میں تمام علما اور قاریوں کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ علم تفسیر، علم حدیث، فن مباحثہ و مناظرہ، فقہ، فن طب، علم کیمیا، علم منطق و فلسفہ، فن ریاضی، علم عروض و قافیہ، علم بلاغت، علم لغت، مذہبیات، تدبیر ریاست کے عنوانات کے ساتھ مصنفہ نے اس باب میں رامپور رضا لائبریری رامپور اور مدرسہ عالیہ کی صورت حال پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مصنفہ نے بجا طور پر اس بات کا اظہار کیا ہے

کہ نواب موصوف کے عہد میں رضا لائبریری رامپور کے انتظام و انصرام میں باقاعدگی برتی گئی اور مدرسہ عالیہ جیسے قدیم مشرقی ادارے کے فروغ کو مزید یقینی بنایا گیا۔

چوتھا باب 'نواب محمد سعید خاں کے عہد کی ادبی سرگرمیاں' میں مصنف نے اس عہد کی ادبی سرگرمیوں کا مفصل جائزہ لیا ہے۔ انشاء ادب، داستان و قصص، شعری سرگرمیاں، اردو شاعری، فارسی شاعری، عربی شاعری، ہندی شاعری مثنوی، خوش نویساں، عنوانات کے تحت مصنف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دراصل نواب موصوف کے عہد سے ہی دبستان رامپور کو بام عروج حاصل ہوا۔ مصنف نے ہندی شاعری کے عنوان سے احمد، دت اور مظلوم کے ہندی دوہے، کبت، ہندی غزلوں کے نمونے پیش کر کے بجا طور پر یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے، دبستان رامپور صدیوں پہلے سے ہی قومی یکجہتی کا قائل تھا اور ہندوستان کی تہذیب اور مقامی زبان کو اپنا طرۂ امتیاز سمجھتا تھا۔

ضمیمے کے تحت مصنف نے نواب موصوف کے عہد کی تعمیر کردہ عمارتوں کی تصاویر پیش کی ہیں جس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ نواب موصوف کو فن تعمیر سے بھی خاص لگاؤ تھا۔

بحیثیت مجموعی ڈاکٹر تبسم صابر کی تحقیق 'رامپوریات' اور خطہ روہیل کھنڈ پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے مشعل راہ اور مستند مواد کے حصول کا وسیلہ ہے۔ اس لحاظ سے کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

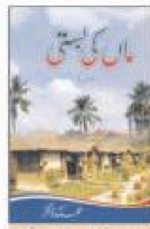

ماں کی بستی

مصنف/ناشر: محمد ذاکر

صفحات: 160، قیمت: 96 روپے، سنہ اشاعت: 2015

مبصر: نسیم احمد نسیم، بی 70، گلی نمبر 7، شاہین باغ، اوکھلا، نئی دہلی 25

محمد ذاکر 1980 کے بعد اردو کے افسانوی منظرنامے پر ابھرنے والا ایک قابل ذکر نام ہے۔ وہ گذشتہ تین دہائیوں سے افسانے تخلیق کر رہے ہیں اور ملک کے موقر رسالے میں اپنی موجودگی درج کراتے رہے ہیں۔ اس سے قبل ان کے افسانوں کے دو مجموعے 'بوڑھی گنڈک تٹ کا بنجارہ' اور 'جگنوؤں کی بارات' شائع ہو چکے ہیں۔

محمد ذاکر نے اپنی کہانیوں میں اپنی ذات کو اولیت دی ہے۔ ساتھ ہی بدلتے ہوئے معاشرے کے ہر پہلو پر بھی گہری نظر رکھی ہے۔ ان کے یہاں تصنع اور تکلف کی جگہ بیباکی، صاف گوئی اور جرأت اظہار کی خصوصیت پائی جاتی ہے۔ ذاکر نے زندگی کے ٹوٹتے بکھرتے لمحوں کی کہانی بھی لکھی ہے اور بنتے سنورتے وقتوں کی داستان بھی، لیکن ہر جگہ خالص اپنے تجربات و مشاہدات کو اپنا رہ نما بنایا ہے۔ انھوں نے جو کچھ دیکھا، محسوس کیا یا بھوگا اسے ہو بہو کہانی بنا دیا بلکہ ایسے نجی اور خانگی معاملات بھی کھل کر بیان کر دیے جنھیں چھپانے کے لیے دوسرے لوگ سو سو جتن کرتے ہیں۔ میری دانست میں ذاکر کی یہ بڑی خصوصیت ہے۔ وہ بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار ہیں لیکن کہانی کو بڑے کینوس پر پھیلا کر ناول اور ناولٹ بنانے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔

'ماں کی بستی' محمد ذاکر کا پہلا ناول ہے۔ ناول نگار نے اس ناول کا موضوع اس چمپارن (بہار) کو بنایا ہے جہاں سے مہاتما گاندھی نے تحریک آزادی ہند کی شروعات کی تھی اور چمپارن کے وطن دوستوں اور جاں نثاروں نے ان کا ساتھ دیا تھا۔ نتیجے کے طور پر 1947 میں ملک تو آزاد ہو گیا اور ہر طرف تھوڑی بہت ترقی کی روشنی پھیلنے لگی لیکن وہ چمپارن جہاں سے آزادی کا ابر اٹھ کر پورے ملک میں برسا تھا وہاں آج بھی غربت و افلاس اور ظلم و استحصال کی تاریکی پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں رشوت خوری، اغوا اور ڈاکہ زنی کی ایک لمبی روایت ہے جو اپنے پیچھے کئی خونچکاں داستانیں رکھتی ہے۔

ناول 'ماں کی بستی' میں ناول نگار نے یوں تو ہندو مسلم منافرت کو، ذات پات کے تفرقے کو اور معاشی و معاشرتی بدحالی کے مناظر کو بحسن و خوبی پیش کیا ہے لیکن اس کے ساتھ بڑے بڑے عہدیداران اور پولس اہلکار کے چہرے کو بھی بے نقاب کیا ہے۔ یہ علاقہ لمبے عرصے تک لوٹ کھسوٹ اور بدعنوانی کا مرکز رہا ہے۔ اغوا اور قتل کا یہاں دور دورہ رہا ہے۔ ان تمام حالات کو محمد ذاکر نے اس ناول میں بہت ہی فنکاری اور چابکدستی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہاں ناول سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں جس میں علاقائی صورت حال کو ناول نگار نے کچھ یوں منعکس کیا ہے:

"جس علاقے کی قسمت میں سیلاب، مہاماری، اور سوکھا ہو۔ جہاں اسکول ہو لیکن ماسٹر نہ جاتے ہوں، اسپتال ہوں لیکن ڈاکٹر ندارد ہوں، بلاک ہو لیکن بی ڈی او رشوت خور ہو تو ایسے علاقے کی کوکھ سے راہزن پیدا نہیں ہوں گے تو کیا ٹیچر، ڈاکٹر اور افسر پیدا ہوں گے۔"

اس ناول کے ذریعے ناول نگار نے چمپارن کی خستہ حالی اور بدحالی کو پورے ملک کے سامنے ہو بہو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہ ناول ایک شفاف آئینہ ہے جس میں چمپارن کو اس کے پورے کیف و کم کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔ ناول کا پس منظر گرچہ علاقائی ہے لیکن اس سے مماثل علاقوں کی کمی نہیں ہے۔ امید ہے یہ ناول فنکاروں اور ادب کے جانکاروں کے درمیان مقبول ہوگا۔

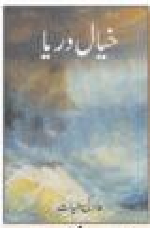

خیال دریا

شاعر/ناشر: عادل حیات

صفحات: 176، قیمت: 90 روپے

مبصر: پروفیسر فاروق احمد صدیقی، امرود باغ، جالی چوک، (چھندواڑہ)، مظفر پور

'خیال دریا' عادل حیات کی آزاد اور معریٰ نظموں کا ایک خوب صورت مجموعہ ہے۔ موصوف کئی حیثیتوں سے اردو کے ادبی حلقوں میں جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی پہلی اور بنیادی حیثیت تو ایک جدید شاعر کی ہے۔ ان کی غزلوں کے دو مجموعے 'ستارہ سنگ' اور 'اشارت' اشاعت پذیر ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ ادب اطفال کے لیے بھی انھوں نے خوب صورت نظمیں کہی ہیں اور کچھ کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ اردو تنقید و تحقیق کی دنیا کو بھی اپنی دو اہم تصانیف 'اختر انصاری اور ان کی غزل گوئی' اور 'غزل کی تنقید' کے ذریعے شاد اور آباد کیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب 'خیال دریا' ان کی بوقلموں نظموں کا مجموعہ ہے۔ اس میں چھوٹی بڑی ملا کر ایک سو دو نظمیں ہیں جن میں عصری مسائل و معاملات کو بڑے سلیقے سے موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ تو طے ہے کہ کوئی بھی شاعری ہوا میں پرواز نہیں چڑھتی اور صرف تخیل کی تتلیاں پکڑنے سے بھی بات نہیں بنتی۔ جب تک کہ وہ تخلیق ارضی حقیقت سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں ہو۔ کوئی کیوں اس کا مطالعہ کرے گا۔ عادل حیات جیسے باشعور ادیب و فنکار اپنے عصری تقاضوں سے پوری طرح باخبر ہیں۔ اس لیے اپنی نظموں کو انھوں نے آج کی زندگی اور زمانے سے پوری طرح ہم رنگ و ہم آہنگ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ انھیں معلوم ہے کہ آج ساری دنیا خطرات کے سایہ میں جی رہی ہے۔ کسی ایک خطۂ ارض کی بات نہیں۔ پوری انسانی برادری خوف و دہشت کے عالم میں ہے۔ ایک حساس اور باشعور شاعر ان ٹھوس حقائق کو کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتا۔ چنانچہ عادل حیات نے بھی آج کی انسانی دنیا کو درپیش جملہ مسائل و مصائب مثلاً تہذیبی و لسانی عصبیت، علاقائیت، فرقہ وارانہ منافرت، تہذیبی جارحیت، محرومی و مایوسی اور اضطراب و التہاب وغیرہ کو اپنی نظموں میں بڑے مؤثر پیرائے میں جگہ دی ہے۔ اس طرح صحیح معنیٰ میں ان کی نظموں کو عصری حسیت سے معمور قرار دیا جا سکتا ہے اور یہ بڑی بات ہے۔

یہاں بطور نمونہ ان کی ایک مختصری نظم 'کوئی جھونکا' نقل کی جارہی ہے جو محض سات سطروں پر مشتمل ہے مگر غیر معمولی تحرک اور عملی سرگرمیوں کی دعوت دیتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

ابھی تک منتظر ہوں میں
کوئی جھونکا ہوا کا اس طرح آئے
کہ اپنے ساتھ لے جائے
اڑا کر آسماں کی بے کرانی میں
جہاں دل میں کوئی خواہش
اٹھائے سر
نہ کوئی وسوسہ جاگے

عادل حیات کا شعری سفر اگر اسی طرح اخلاص و انہماک کے ساتھ جاری رہا تو وہ اپنے ہم سفروں اور ہم عصروں میں نمایاں مقام حاصل کر سکتے ہیں۔

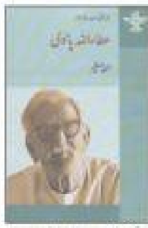

عطاء اللہ پالوی

مصنف : احمد صغیر

صفحات : 112، قیمت: 50، سنہ اشاعت: 2015

ناشر: ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی

مبصر : پروفیسر محمد محفوظ الحسن، شمس منزل، سرسید کالونی، نیو کریم گنج، گیا

کعبہ و بت خانہ میں زندگی ایک عمر روتی ہے۔ تب کوئی دانائے راز پیدا ہوتا ہے۔
اپنی بے نوری پر نرگس ہزاروں سال روتی ہے تب کوئی دیدہ ور پیدا ہوتا ہے۔

عطاء اللہ پالوی کا شمار بھی ایسے ہی دیدہ وروں میں ہوتا ہے جو خال خال پیدا ہوتے ہیں۔ عطاء اللہ پالوی کی خدمات بھی سردخانے میں پڑی رہیں۔ ان کی قدر نہ ان کی زندگی میں ہوئی اور نہ ان کے مرنے کے بعد۔

ساہتیہ اکادمی کے عہدہ داران مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے عطاء اللہ پالوی کو زندگی نو بخشنے اور ان کی کماحقہ قدر دانی کی سمت میں ایک قدم بڑھایا اور احمد صغیر کو عطا اللہ پالوی پر مونوگراف لکھنے پر آمادہ کیا۔

احمد صغیر کا یہ مونوگراف مختصر ضرور ہے مگر اس مونوگراف کے ذریعے احمد صغیر نے عطاء اللہ پالوی کو زندگی جاوید دینے کی سمت میں ایک کامیاب قدم بڑھایا ہے۔ احمد صغیر کے اس مونوگراف کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے عطاء اللہ پالوی کے خاندانی، ذاتی حالات، گھریلو زندگی کے نشیب و فراز اور ان کی زندگی کے اہم واقعات کو بڑی خوبی و خوش اسلوبی سے چند صفحات میں اس طرح سمیٹ لیا ہے کہ عطاء اللہ پالوی کی پوری زندگی قاری کے سامنے آجاتی ہے۔ اس مونوگراف کے ذریعے احمد صغیر نے پالوی کو ایک ادیب، محقق، ناقد کی حیثیت سے نہ صرف متعارف کرانے میں کامیابی حاصل کی ہے بلکہ اپنی تحریر کے ذریعے انھوں نے پالوی کی ادب فہمی، مذہب شناسی، سوانح نگاری، تاریخ دانی کا ثبوت ان کی اپنی تحریروں کے آئینے میں پیش کر دیا ہے۔

احمد صغیر نے یہ تفصیل بھی بتادی ہے کہ پالوی کی کون سی کتاب کب اور کہاں سے شائع ہوئی اور ان کتابوں کے مندرجات کیا ہیں۔ جو کتابیں پالوی نے لکھیں لیکن شائع نہیں ہو سکیں۔ ان کی عدم اشاعت نیز اب عدم دستیابی کا سبب کیا ہے۔ پالوی کے جو مخطوطات ہیں وہ کہاں دستیاب ہیں نیز ان مخطوطات میں کن موضوعات کو سمیٹا گیا ہے۔ اس کی اطلاع بھی انھوں نے دے دی ہے۔ احمد صغیر نے بہت صحیح لکھا ہے کہ:

''عطاء اللہ پالوی ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ بیس مطبوعہ کتابوں کے علاوہ کئی غیر مطبوعہ تحریریں اور پانچ مخطوطات دستیاب ہوئے ہیں۔ اس طرح مجموعی طور پر وہ ایک ایسے نثر نگار گزرے ہیں جن کا سرمایہ انھیں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ ان کتابوں کی روشنی میں عطاء اللہ پالوی کی شخصیت اور کارناموں پر غور کیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ ہماری گفتگو ایک ایسے شخص کے بارے میں ہے جس کے فن اور فنکار، علم اور عالم نظریہ اور صاحب نظریہ مختصر یہ کہ تقریر و تحریر اور عمل سب باہم مدغم ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ عطاء اللہ پالوی کی اس خاص صفت کا بطور خاص تذکرہ اس لیے ضروری ہے کہ ادب کی تاریخ میں ایسے بہت سے ادیب اور دانشور دکھائی دیتے ہیں جن کے قول و عمل میں زمین و آسمان کی دوری دکھائی دیتی ہے لیکن عطاء اللہ پالوی، سماجی اور مذہبی سطح پر بھی ایک محترم اور ہردلعزیز شخصیت کے مالک تھے اور نثر میں بھی ان کا درجہ بلند تھا۔'' (ص 69)

احمد صغیر کا یہ مونوگراف یہ بھی بتاتا ہے کہ عطاء اللہ پالوی نے (ادبی، گھریلو) اپنی شرطوں پر زندگی گزاری اور اپنی راہ خود بنائی اور اپنی آخری آرام گاہ بھی خود ہی اپنے لیے مقرر کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ احمد صغیر نے اس مسودے کی نظر ثانی کی زحمت گوارہ نہیں کی ہے۔ زبان و بیان پر توجہ دینے کی ضرورت تھی۔ ویسے احمد صغیر کی نثر رواں دواں، سادہ مگر پرکار ہے۔ احمد صغیر ایک تخلیقی فنکار ہیں مگر تنقید و تحقیق سے بھی شغف رکھتے ہیں۔ مذکورہ کتاب میں احمد صغیر کی تینوں جہتوں کا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مونوگراف شروع کرنے کے بعد ختم ہونے تک دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ ساہتیہ اکادمی نے اس مونوگراف کو بڑے سلیقے سے شائع کیا ہے۔ سرورق پر عطاء اللہ پالوی کی تصویر مونوگراف کی معنویت میں اضافہ ہی نہیں کرتی ہے بلکہ پالوی کی فکر خیز شخصیت کو روشن کرنے میں کامیاب نظر آتی ہے۔ احمد صغیر نے پالوی کی مطبوعات کا تعارف کراتے ہوئے غیر مطبوعہ مخطوطات کی تفصیل بھی دی ہے اور یہ نشاندہی بھی کی ہے کہ خدابخش لائبریری میں یہ محفوظ ہیں۔ آخر میں پالوی کی تمام تصانیف مطبوعہ و غیر مطبوعہ و گمشدہ کی تفصیل بھی دے دی ہے جن کی مجموعی تعداد انتیس ہوتی ہے نیز ان کتابوں کی نشاندہی بھی کی ہے جو پالوی کی زندگی اور ان کے فکر و فن پر لکھی گئی ہیں نیز ان رسالوں کی فہرست بھی دے دی ہے جن میں پالوی کے مضامین شائع ہوئے ہیں۔ پالوی صاحب کی تحریروں کا انتخاب مونوگراف کو وقیع بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ مونوگراف پالوی کے تعین قدر میں معاونت کرے گا۔

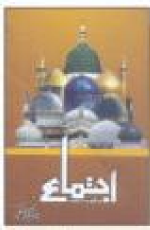

اجتماع

شاعر: منیر احمد جامی

صفحات: 312، قیمت:- 100 روپے، سنہ اشاعت: 2015

مبصر: ڈاکٹر غضنفر اقبال، 'سائبان' زبیر کالونی

باگر گا کراس، رنگ روڈ، گلبرگہ 585104

منیر احمد جامی، اردو کے قادر الکلام سخنور ہیں۔ انھوں نے اصناف شعر میں طبع آزمائی کامرانی کے ساتھ کی ہے۔ جامی صاحب ایک بہترین انٹرویو کار بھی ہیں۔ ان کی تازہ ترین کتاب 'اجتماع' میں روحانی اور عرفانی منظومات متوجہ کن ہیں۔ منیر احمد جامی نے اپنی اس کتاب میں گیارہ ولی کامل برگزیدہ ہستیوں کی سوانح عمری منظوم کی ہے۔ ان گیارہ اولیائے عظام میں حضرت عبدالقادر جیلانی، حضرت سید احمد کبیر رفاعی، حضرت خواجہ معین الدین چشتی، حضرت نظام الدین اولیا، حضرت مولانا جلال الدین رومی، حضرت شیخ سعدی، حضرت نور الدین عبدالرحمن جامی، حضرت سید محمد خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، حضرت وارث علی شاہ، حضرت شاہ عبداللطیف قطب ویلور، اور حضرت ابوالفصح ٹیپو سلطان شہید علیہ الرحمہ کے نام شامل ہیں۔ مذکورہ اولیائے عارفین نے اقطاع عالم میں اسلام کی شمع جلائی تھی۔ منیر جامی نے ان قطب الاقطاب ہستیوں کی حیات کا باریک بینی سے مطالعہ کر کے ان کی منظوم سوانح عمری لکھنے کی کامیاب مساعی کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی شاعری کار دشوار ہے لیکن

شاعر نے ان اولیائے کرام کا گہرائی سے ان کی حیات وتعلیمات کا مطالعہ کیا اور ایک سے بڑھ کر ایک شعر تخلیق کیے۔ خواجہ اجمیری کو منظوم خراج اس طرح سے شاعر نے پیش کیا ہے:

تعلیم دی ہے خواجہ نے پیار کے چلن کی تعلیم دی ہے خواجہ نے سب کو اپنے پن کی
تعلیم دی ہے خواجہ نے امن و آشتی کی تعلیم دی ہے خواجہ نے صلح و دوستی کی

خواجہ دکن حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کا آستانہ چھ سو گیارہ برس سے بلا لحاظ تفریق مذہب وملت مرجع خلائق ہے۔ حضرت گیسو دراز اردو کے اولین نثر نگار اور شاعر ہیں۔ انھوں نے دین حنیف کی اشاعت وتبلیغ کے لیے اپنی زندگی وقف کی۔ سلطان القلم حضرت گیسو دراز، شہباز، بندہ اور محمد تخلص فرماتے تھے۔ انھوں نے 105 کتابیں تصنیف و تالیف کی ہیں۔ شریعت محمدیؐ کے حد درجہ پابند رہنے والے بندہ نواز علیہ الرحمہ نے اپنی عملی صوفیانہ زندگی میں اخلاق میں عمدگی، ظاہر و باطن کی تعمیر اور حق شناسی کا درس دیا۔ منیر احمد جامی نے حضرت گیسو دراز کی حیات وتعلیمات کو اس قدر جامعیت کے ساتھ پیش کیا ہے کہ دل سے واہ نکل گئی۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

ہر عمل پر آپ نے دی افضلیت عشق کو آپ نے مانا خدا تعالی کی رحمت عشق کو
آپ نے سمجھائے ہیں عشق الٰہی کے نکات ساری تصنیفات ہیں آئینہ دار حق صفات

'اجتماع' میں دیگر بزرگانِ دین کی حیات اور خدمات کو منیر احمد جامی نے ادب و احترام کے ساتھ منظوم کیا ہے۔ اجتماعی طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اجتماع کے ابیات میں تابانی، تابناکی اور تازگی دائمی طور پر رہے گی۔ منیر احمد جامی کا یہ عارفانہ کلام عہد موجود میں، اصلاحی، روحانی اور اخلاقی اقدار کی پرورش کرتا رہے گا۔ شرط ہے کہ کلام کو دل لگا کر پڑھا جائے۔

افسانہ، افسانچہ تکنیکی تناظر میں

مصنف / ناشر: محمد بشیر مالیر کوٹلوی

صفحات: 168، قیمت: 100 روپے، سنہ اشاعت: 2015

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

مبصر: صالحہ صدیقی، 157/12 راجاپور، الہ آباد، 211002

افسانہ نگاری کیا ہے، افسانہ نگاری کا فن وتکنیک، اس کا ارتقائی سفر، اس کے اجزائے ترکیبی، اس کے رموز ونکات پر اردو ادب میں وقتاً فوقتاً بحث ومباحثہ ہوتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ بے شمار تحقیقی وتنقیدی کتابیں اور مضامین بھی لکھے جاتے رہے۔ لیکن محمد بشیر مالیر کوٹلوی کا یہ کام اپنے آپ میں جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ اس کتاب میں یوں تو 'افسانہ، افسانچہ تکنیکی تناظر' سے متعلق تنقیدی مضامین پیش کیے گئے ہیں، لیکن ایک نئے انداز میں۔ اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے پہلا حصہ 'افسانہ نگاری' کا ہے جس کے تحت چھ مضامین افسانہ نگاری کے فن سے متعلق پیش کیے گئے ہیں جن میں (1) کہانی، افسانہ اور کہانی پن (2) عصری افسانوں میں موضوعات کا انتخاب (3) اردو افسانہ اور منظر نگاری (4) افسانے میں مکالمہ ایک بحث (5) افسانے میں کردار نگاری کی اہمیت (6) اردو افسانہ کے چند مزید پہلو شامل ہیں۔ جبکہ دوسرا حصہ افسانچہ نگاری سے متعلق ہے۔ اس حصے میں (1) افسانچے کی تعریف اور کامیاب افسانچوں کی خوبیاں (2) افسانچہ اور چند سوالات (3) حالیہ افسانچے اور سیاہ حاشیے شامل ہیں۔ مصنف نے اپنی کتاب کو فن افسانہ سے متعلق اس کے مختلف گوشوں کو چونکہ بحث سخن بنایا ہے لہٰذا انھوں نے افسانوی پیرائے میں اپنی باتوں کو قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے دور حاضر میں افسانہ لکھنے کے مسائل اور افسانہ لکھنے کے لیے تخلیق کار کی صلاحیتوں پر بھی بخوبی روشنی ڈالی ہے، موجودہ افسانہ نگاروں کے حوالے سے جائزہ پیش کرتے ہوئے بشیر مالیر کوٹلوی فرماتے ہیں کہ "ہم افسانہ نگاروں میں اس بات کی بڑی کمی ہے کہ چار افسانے معیاری جرائد میں چھپتے ہی ہم اپنے آپ کو صف اول کا افسانہ نگار سمجھنے لگتے ہیں۔ اپنی تخلیقات کے بارے میں تنقید برداشت کرنا ہماری شان کے خلاف ہوجاتا ہے۔" اپنے پہلے تنقیدی مضمون 'کہانی افسانہ اور کہانی پن' میں انھیں مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے مصنف نے کہانی پن کی تعریف ان لفظوں میں کیں ہے کہ "افسانے اور قاری کے درمیان جو کشش پائی جاتی ہے اسے کہانی پن کہا جاتا ہے۔" کسی بھی افسانے میں موضوعات کا انتخاب ایک اہم مرحلہ ہوتا ہے، تخلیق کار کے سامنے موضوعات کا کھلا آسمان ہوتا ہے جس میں وہ کسی ایک موضوع کا بہت ہنر مندی، سلیقگی اور دیانت داری سے انتخاب کرتا ہے پھر اس کے ارد گرد کہانی بنتا ہے۔ بشیر مالیر کوٹلوی اپنے دوسرے تخلیقی مضمون 'عصری افسانوں میں موضوعات کا انتخاب' میں اسی موضوع پر تنقیدی گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "دور حاضر میں محض تصوراتی باتوں کا فیشن نہیں ہے۔ موضوع زندگی کی کوئی سچائی ہو بلکہ کڑوی سچائی ہو، بات گھسی پٹی نہ ہو، عام ڈگر سے ہٹ کر ہوا چھوتا پن ہو، جسے پڑھ کر قاری سوچنے لگے کہ ایسا بھی ممکن ہے..." اس کتاب میں مصنف نے افسانہ نگاری سے متعلق دور حاضر میں ہونے والے تمام مسائل کو سمونے کی کوشش کی ہے۔ افسانے کا ایک اہم جز منظر نگاری ہے جس کے بغیر افسانہ نامکمل ہے۔ بشیر مالیر کوٹلوی نے اپنے مضمون 'اردو افسانہ اور منظر نگاری' میں منظر نگاری کی اہمیت وافادیت پر بھر پور روشنی ڈالی ہے۔ بقول مالیر کوٹلوی "افسانے کے بہت سے اہم جز و ہیں جن کے بغیر افسانہ افسانہ نہیں بن پاتا۔ مثلاً موضوع، کردار نگاری، مکالمہ نگاری، منظر نگاری، جزئیات نگاری، تجسس اور اختتام کی خوبصورتی وغیرہ۔ یہ بھی اجزاء افسانہ کی تخلیق میں بہت اہم مانے جاتے ہیں۔ خاص طور پر منظر نگاری جو افسانے کی ریڈھ کی ہڈی مانی جاتی ہے۔" اسی طرح مصنف نے اپنی کتاب کے دوسرے حصے میں افسانچہ نگاری پر نہ صرف تفصیلی بحث کی ہے بلکہ افسانچے کی موجودہ صورت حال پر بھی سوالات قائم کیے ہیں۔ ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی ثابت کرنے کی سعی کی ہے کہ افسانچہ ایک مشکل فن ہے جسے یوں ہی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی ہر کوئی اس صنف میں کامیاب ہوسکتا ہے بقول بشیر مالیر کوٹلوی۔ "میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ایک کامیاب افسانہ نگار ہی بہتر افسانچہ تخلیق کرسکتا ہے۔" بہر حال یہ کتاب اردو افسانہ اور افسانچہ کی موجودہ صورت حال کا البم ہے۔ اس کتاب میں زبان صاف ستھری اور پیرایہ افسانوی اختیار کیا گیا ہے جو کہ قابل ستائش ہے۔ آج اردو ادب میں ایسی ہی کتابوں کی ضرورت بھی ہیں۔ مالیر کوٹلوی کی یہ کتاب اردو ادب میں ایک نیا اضافہ ہے جسے قدر کی نگاہ سے دیکھا جانا چاہیے۔

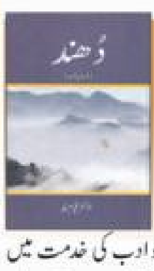

دُھند

مصنف: ڈاکٹر قیام نیر

صفحات: 150، قیمت: 89 روپے، سنہ اشاعت: 2015

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: غلام نبی کمار، مکان نمبر 20، تیسری منزل، غفور نگر، نئی دہلی

ڈاکٹر قیام نیر پچھلے تیس سے زائد عرصے سے اردو زبان و ادب کی خدمت میں مصروف عمل ہیں۔ تدریسی فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ افسانوی ادب کے ساتھ بھی ان کی خاص دلچسپی رہی ہے۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی افسانے لکھتے آرہے ہیں۔ قیام نیر صاحب ایک منجھے اور سلجھے ہوئے فنکار ہیں۔ دُھند مصنف کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے، اس سے پہلے ان کے دو افسانوی مجموعے 'تنہائی کا کرب' (1984) اور 'تحفہ' (2000) شائع ہوکر ادبی حلقوں میں مقبول ہوچکے ہیں۔ اس کے علاوہ نثر کی دو کتابیں 'بہار میں اردو افسانہ نگاری: ابتداء تا حال' (1996) اور 'بہار میں تخلیقی نثر:

آزادی کے بعد (2104)'، ایک انشائیوں کا مجموعہ 'میری جوشامت آئی (1992)' اور ایک ناول 'بچھڑی دلہن (1993)' بھی منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ اس طرح بیک وقت اردو ادب کی کئی اصناف میں طبع آزمائی کا شرف بھی انھیں حاصل ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب 'دُھند' ڈاکٹر قیام نیّر صاحب کے 19 افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کا پیش لفظ پروفیسر شہزاد انجم صاحب نے تحریر فرمایا ہے۔ جس میں بقول ان کے ''قیام نیّر سماجی مسائل کی تہہ تک پہنچتے ہیں، انسانی عادات و خصائل کے بطن میں اُترنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان سب کے بعد انہیں جو کچھ بھی حاصل ہوتا ہے اسے افسانہ کا موضوع بناتے ہیں۔'' قیام نیّر کے افسانے غور و خوض کی دعوت دیتے ہیں۔ انھوں نے افسانوں کے ذریعے سماج میں ہو رہی بے رہ روی، بے حیائی، سماجی ناانصافی، شکست و ریخت، ہٹ دھرمی، افراتفری اور فرقہ وارانہ فسادات وغیرہ کو موضوعِ خاص بنایا ہے۔ بقول مصنف ''میں نے معاشرے میں بکھرے ہوئے واقعات و حادثات، انسانی رشتوں کی بے حرمتی، قول و فعل میں تضاد و شکست، آرزو اور عام انسانوں کی مجبوری اور بے بسی کو زبان دینے کی کوشش کی ہے۔''

'دُھند' کا پہلا افسانہ 'آخری توبہ' ہے۔ مذکورہ افسانے میں مصنف اُن تلخ آمیز سچائیوں کی طرف ہماری توجہ مرکوز کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں جن کی تخم ریزی میں ہمارا معاشرہ ایک خاص رول ادا کرتا ہے جیسے اسکول میں اساتذہ کا بچے کے ساتھ مار پیٹ کرکے اسکول سے بھاگنے پر مجبور کرنا، پھر گھر میں بھی ان کے ساتھ یہی سلوک روا رکھنا خود ہی اپنے بچوں کو گناہوں کے دلدل میں دھکیلنے کے مترادف ہے۔ جہاں سے کوئی واپس لوٹ کے تو آتا ہے لیکن کوئی ایسا گم ہوتا ہے کہ صرف ان کی یادیں رہ جاتی ہیں۔

اس کتاب کا مرکزی افسانہ 'دُھند' ہے۔ جو کہ اس افسانوی مجموعہ کا نام بھی ہے۔ جس میں افسانہ نگار نے اردو زبان کی اہمیت کے ساتھ ساتھ اس کی بے حالی کا رونا بھی رویا ہے۔ اس افسانہ میں باپ اور بیٹے کی ایک ایسی داستان پیش کی گئی ہے جس میں ایک طرف باپ اردو زبان کا ایک بہت بڑا افسانہ نگار ہوتا ہے تو وہیں دوسری طرف بیٹا باپ کی راہ پر نہ چل کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے بیکار بیٹھا ہوتا ہے اور باپ کی عمر بھر کی جمع کی ہوئی پونجی (کتابیں) جو کہ اس کے بڑھاپے کا سہارا تھیں انہیں بیچ کر رشوت دے کر نوکری حاصل کرنے کا متمنی تھا۔ جب اسے اپنے باپ کی عظمت کا پتہ چلتا ہے تب وہ بے چارا پرلوک سدھار چکا ہوتا ہے۔ افسانہ 'سمجھوتہ' میں فسادات سے متاثرہ خاندان کی دُکھ بھری کہانی پیش کی گئی ہے۔

پیشِ نظر کتاب کے بیشتر افسانوں میں افسانہ نگار نے واحد متکلم کی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ متاثر کن موضوعات کو برت کر اپنے افسانوں میں دلچسپی قائم کی ہے۔

بحیثیت مجموعی زیرِ نظر کتاب میں مصنف نے قارئین اردو کو بہترین کہانیوں سے نوازا ہے۔ کتاب کے آخر میں مصنف کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کی طباعت عمدہ ہے۔

عالم اسلام کے چند مشاہیر

مصنف: ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی

صفحات: 392، قیمت: 300 روپے

ناشر: رہبر بک سروس، پوسٹ باکس نمبر 9736، جامعہ نگر، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر ایس محمد یاسر، شعبۂ اردو، کوآرڈی نیٹر این سی پی یو ایل سینٹر سی عبدالحکیم کالج، ویل وشارم (تمل ناڈو)

ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی، علامہ شبیر احمد ازہر میرٹھی کے سپوت ہیں۔ آپ نے جامعہ اسلامیہ سنابل، جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ اور دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے تعلیم حاصل کی۔ ادب عربی میں تخصص و اختصاص کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی سے پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ عرصۂ دراز تک 'افکار ملی' سے وابستہ رہے۔ آپ نے شیخ عائض القرنی کی مشہور کتاب 'لاتحزن' کا اردو ترجمہ 'غم نہ کریں' کے نام سے کیا۔ اس کے علاوہ عربی و انگریزی کی کئی کتابوں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے۔

زیرِ نظر کتاب 'عالم اسلام کے چند مشاہیر- سوانح اور افکار کا مطالعہ' دراصل عالم اسلام کی مشہور شخصیات کا مطالعہ ہے، جن میں سے اکثر شخصیات بیسویں صدی میں عالم اسلام میں اپنے افکار و نظریات کی وجہ سے اہمیت کی حامل رہی ہیں، جن میں مختلف مشرب اور مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والی شخصیات شامل ہیں۔ شخصیات پر یہ مضامین رسائل و جرائد میں شائع بھی ہو چکے ہیں اور چند مضامین سمیناروں میں بھی پیش کیے گئے ہیں، جنھیں نظرِ ثانی اور اضافہ کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔

اس کتاب میں چالیس مشہور اسلامی شخصیات کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ تین ذیلی عناوین قائم کیے گئے ہیں: (1) علماء و مشائخ (2) دانشوران و مفکرین (3) قائدین و مجاہدین۔

مختلف مکتبِ فکر اور مختلف الخیال شخصیات کے جائزہ میں مصنف نے حزم و احتیاط سے کام لیا ہے۔ اعتدال اور توازن کے ساتھ علمی و استدلالی رنگ میں سوانحی حالات اور افکار و نظریات کو پیش کیا گیا ہے۔ برصغیر کی اسلامی شخصیات کے ساتھ ساتھ عالم عرب کی معروف و مشہور شخصیات کا بھی بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔

اس کتاب کے بارے مولانا محمد فاروق خان پیش لفظ میں لکھتے ہیں: ''یہ ہمارے لیے مسرت کی بات ہے کہ عزیزم ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی نے اپنی کتاب میں کچھ ایسی شخصیات کے حالات اور ان کے کارناموں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے، جن کی عظمت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کتاب کے مطالعہ سے صرف یہی نہیں کہ ہم ان شخصیات کے حالاتِ زندگی سے واقف ہوں گے بلکہ دینی معلومات کے بہت سے گوشے ہمارے سامنے آئیں گے جو بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کتاب میں علماء و مشائخ کے علاوہ عالم اسلام کے بعض دانشوروں اور قائدین اور مجاہدین کے کارناموں پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔ اس طرح کتاب میں ایک خاص تنوع پیدا ہو گیا ہے۔''

ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی کی اس تصنیف کے مطالعہ سے عالم اسلام کے بارے میں بہت سی وقیع معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ مختلف ممالک کے سیاسی و سماجی حالات اور عالم اسلام میں فکر و دانش کی موجودہ روایت کا ایک صاف منظر ابھرتا ہے۔ علماء و مشائخ کے ضمن میں ہندوستان کی کئی اہم شخصیات کا بھرپور تعارف ملتا ہے۔ دانشوران اور مفکرین کے ضمن میں بہت سے اہلِ فکر کی کمی محسوس ہوتی ہے، لیکن ایک بات یہ بھی ہے کہ جن مفکرین کا جائزہ لیا گیا ہے، ان کے ساتھ معروضی انداز میں انصاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ قائدین و مجاہدین میں شامل شخصیات کے مطالعہ سے عالمِ اسلام کی سیاسی صورتِ حال کا اندازہ ہوتا ہے۔

'عالمِ اسلام کے چند مشاہیر' ایک قابلِ مطالعہ اور عمدہ کتاب ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ سے مشاہیرِ عالمِ اسلام کے بارے میں مستند و معتبر معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

سب کے لیے

مولف: ابن غوری

صفحات: 192، قیمت: 120 روپے

ناشر: آئی جی پبلشرز حیدرآباد

مبصر: رضیہ حامد

ابن غوری کئی کتابوں کے مصنف اور مؤلف ہیں۔ ان کو تعلیم و تعلم سے دلی شغف ہے۔ ابن غوری کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ دورانِ مطالعہ ان کو جو بات بہت اچھی لگی اس کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے، انھوں نے اپنے پاس نقل کر لیا۔ اپنے پیش لفظ میں ابن غوری لکھتے ہیں:

ہم نے اپنے آشیانہ کے لیے
جو چبھے دل میں وہی تنکے لیے

تعمیر کا تو خیال بھی نہیں تھا لیکن (دورانِ مطالعہ) ایسے چبھنے والے تنکے پسند آتے رہے اس لیے انھیں جمع کرتا رہا۔ ایک عرصہ بعد دیکھا تو ایک ڈھیر سا نظر آیا۔ اب تو جی للچایا کہ ننھا سا آشیانہ تعمیر کرنا ہی چاہیے، پس یہ ہوگیا۔ اس کا نام رکھا 'سب کے لیے' آپ بھی قدم رنجہ فرمائیے۔ محسوس ہوگا کہ اس کی فضا دلکش اور روح افزا ہے۔"

ابن غوری نے اس کو 14 عنوانات میں تقسیم کیا ہے اور پانچ ابواب بنائے ہیں۔

پہلا باب: زندگی کی جھلکیاں: اس کے ذیلی عنوانات میں علما، صوفیا، قائدین و مصلحین، ادیب و شاعر و صحافی اور فن کار اساتذہ طلبہ وغیرہ ہیں۔ دوسرے باب کا عنوان: 'مشاہیر سے سوالات اور ان کے جوابات' ہے۔ ان مشاہیر میں مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، پروفیسر عبدالوہاب بخاری جیسے علما بھی شامل ہیں۔

تیسرا باب 'شخصیت کا انوکھا تعارف' ہے۔

اس میں کئی علما و مشائخ، ادیبوں وشاعروں کا تعارف شامل ہے۔ اس کے بعد والا باب 'کتابوں کی دنیا' کے عنوان سے مختص ہے۔ سب سے پہلے قرآن پاک کے بارے میں لکھا ہے۔ کئی دینی کتابوں کے متعلق ایک سطر، ایک جملہ یا ایک پیرا میں تعارف کیا گیا ہے۔ ابن صفی نے اپنی کتاب جاسوسی دنیا کے متعلق کہیں لکھا تھا ان کا یہ جملہ یہاں درج ہے "میری کتابیں چاہے الماریوں کی زینت نہ بنیں لیکن تکیے کے نیچے ضرور پائی جاتی رہیں گی۔"

کتاب کے آخر میں 'نایاب اقوال' درج ہیں جس کا تعارف اس شعر سے ہوتا ہے:

بات ہر بات کو نہیں کہتے
بات مشکل سے بات ہوتی ہے

کل 45 اقوال شامل اشاعت ہیں۔ ان میں مولانا علی میاں، مفتی محمود گنگوہی، رشید الدین خاں، سبھاش چندر بوس، گاندھی جی، حکیم محمد سعید، سید سلیمان ندوی کے اقوال زریں شامل کیے گئے ہیں۔

حرف آخر کے تحت سورۂ آل عمران کی موت سے متعلق آیت درج ہے اس کے بعد انشاء اللہ خاں انشا کا مشہور شعر:

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

کتاب کو ایک مرتبہ ہاتھ میں لینے کے بعد پوری ختم کیے بغیر ہاتھ سے رکھنا بڑا جوکھم کا کام ہے۔ ابن غوری نے بہت اچھا تحفہ سب کو دیا ہے۔ آپ بھی ایک مرتبہ پڑھ کر دیکھیے۔ صاف ستھری خوب صورت ٹائٹل کور کے ساتھ چھپی ہے۔

عالمی اردو ادب میں رشیدہ عیاں کی شاعرانہ عظمت

مصنف: پروفیسر ڈاکٹر عبدالقادر غیاث الدین فاروقی

صفحات: 440، سنہ اشاعت: 2015

ناشر: بلو اسٹار پرنٹرس، بیجاپور، کرناٹک

مبصر: انور بارہ بنکوی، 7/H1/11 ہرشی اسٹریٹ، کولکاتا 700009

عالمی اردو ادب کا ایک جیالا، اچھی سوجھ بوجھ رکھنے والا ادبی خدمت گار پروفیسر ڈاکٹر عبدالقادر غیاث الدین فاروقی، سابق صدر شعبۂ اردو فارسی اور عربی، انجمن آرٹس، سائنس اینڈ کامرس کالج بیجاپور، کرناٹک نے تشکیلی پہلو اختیار کرتے ہوئے بھولی بسری ہوئی یادوں کا دریچہ وا کیا اور ملک کی عظیم شاعرہ کی معقولیت کے ساتھ اس کی تخلیقی کاوشوں میں شامل انتخاب عارفانہ کلام، انتخاب رباعیات، انتخاب غزلیات اور انتخاب نظم و گیت کے علاوہ دیگر مشمولات ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر عبدالقادر غیاث الدین فاروقی نے سیدہ رشیدہ بیگم قلمی نام رشیدہ عیاں سے براہ راست رابطہ کیا اور ان کی رضامندی کے بعد ایک جاذب نظر شعری مجموعہ بعنوان 'رشیدہ عیاں کی شاعرانہ عظمت' کو بڑے انوکھے انداز سے سلسلہ وار ترتیب دیا ہے گویا مرتب نے ادب کے زمرے میں بہت اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر عبدالقادر غیاث الدین فاروقی نے عالمی اردو ادب میں رشیدہ عیاں کی شاعرانہ عظمت میں نہ صرف ان کی شخصیت وفن پر اظہار خیال کیا ہے بلکہ ان کے عارفانہ کلام، رباعیات، غزلیات، نظم اور گیت کا انتخاب بھی پیش کردیا ہے۔ کتاب میں رشیدہ عیاں سے لیا گیا ایک تفصیلی انٹرویو بھی شامل ہے جس میں رشیدہ عیاں نے اپنی زندگی کی مختلف تہوں سے پردہ اٹھایا ہے اور اپنے حالات زندگی بیان کیے ہیں۔ ایک سوال کے جواب میں وہ کہتی ہیں:

"انسان کی زندگی کے لیے زبان اور تہذیب دونوں ضروری ہیں۔ اہل تہذیب پسندیدہ لوگ ہوتے ہیں اور ہر ملک وقوم کی اپنی تہذیب ہوتی ہے اور اپنی زبان ہوتی ہے۔ اسے فراموش کسی بھی قیمت پر نہیں کرنا چاہیے۔" (ص 27)

رشیدہ عیاں نے شاعری کی مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان کا عارفانہ کلام بے حد عمدہ ہے۔ کچھ اشعار بطور مثال پیش ہیں:

جو آنکھیں ہجر میں رستی تھیں آبلوں کی طرح
برس پڑی ہیں وہ روضے پہ بادلوں کی طرح
وہی دھڑکن وہی نگاہ کا نور
میرے قلب و نظر محمد ہیں
دل عشق مصطفیٰ میں جو بے تاب ہوگیا
اللہ کے حضور شرف یاب ہوگیا

رشیدہ عیاں کی نظمیں بھی اچھی ہیں۔ انھوں نے نظموں میں اپنے ملک سے دوری، شوہر کی وفات، اپنی ذات میں گم ہونے کا جذبہ، ملک کی محبت، پوری دنیا میں قتل وغارت گری کے واقعات جیسے موضوعات کو بہت اچھی طرح برتا ہے۔ ان کی شاعری میں خلش اور تڑپ نظر آتی ہے۔ انھوں نے بھجن، گیت اور دوہے بھی لکھے ہیں جنھیں پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ رشیدہ عیاں کو نہ صرف اردو، ہندی بلکہ سنسکرت کے الفاظ اور اصطلاحات کی بھی جانکاری ہے۔

کتاب کے آخر میں رشیدہ عیاں کی کچھ تحریریں بعنوان اپنی بات، کچھ اپنے بارے میں، آئینہ وعکس، ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب، حرف مدعا، خواب واحوال شامل ہیں۔ آخری بات کے تحت رشیدہ عیاں نے اپنے 38 خوابوں کی تفصیل بیان کی ہے جو انھوں نے اپنی زندگی میں دیکھے تھے اور ان خوابوں نے ان کی زندگی میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا کی اور نعت گوئی کا محرک بنے۔ کتاب میں رشیدہ عیاں کی یادگار تصاویر بھی ہیں جن سے کتاب کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ کتاب بڑے سائز کی ہے اور تقریباً 450 صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کا کاغذ نہایت عمدہ ہے لیکن کتاب میں پروف کی اور کمپوزنگ کی بے شمار غلطیاں ہیں جس سے کتاب کی رونق ماند پڑنے لگتی ہے۔ امید کہ اگلی اشاعت میں انھیں درست کرلیا جائے گا۔

کتاب کا سرورق رشیدہ عیاں کی تصویر کے ساتھ بہت ہی جاذب نظر ہے۔ مرتب نے اپنی جانب سے اس کتاب کی تزئین کاری میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔ ویسے مجموعی طور پر رشیدہ عیاں کی شاعری دلوں کو چھونے والی شاعری ہے۔ دور حاضر کے شعرا و شاعرات اس شعری مجموعے سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں۔ ■

کونسل 'ہندوستان میں عربی ادب کی انسائیکلوپیڈیا' مرتب کرے گی: پروفیسر ارتضیٰ کریم

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں عربی زبان و ادب پینل کی میٹنگ کا انعقاد

نئی دھلی: ہندوستان میں عربی ادب کی ایک انسائیکلوپیڈیا اردو زبان میں تیار کی جائے گی اس کا فیصلہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں عربی زبان پینل کی میٹنگ میں لیا گیا۔ اس تعلق سے قومی اردو ادب کے وسیع تر منظرنامے سے اردو داں طبقے کو واقف کرانا اپنا فرض منصبی سمجھتی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ دور قدیم سے ہی ہندوستان میں عربی زبان کی بڑی اہمیت اور معنویت رہی ہے اور جدید دور میں تو اس کی اہمیت اور بھی خاصی تعداد ہے۔ عربی زبان پینل کی میٹنگ میں عربی ادب کی تاریخ ماقبل اسلام تا دور جدید کو مرتب کرنے پر بھی ممبران نے زور دیا اور اس کے لیے خاکے بھی تیار کیے گئے تاکہ اس کی روشنی میں عربی ادب کی پوری تاریخ

'عربی زبان و ادب' پینل کی میٹنگ کا انعقاد

کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ اردو اور عربی دونوں زبانیں الگ لسانی خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں مگر دونوں کے مابین تہذیبی اور ثقافتی سطح پر بڑی قربت ہے۔ عربی زبان و ادب نے اردو کی لسانی ثروت اور علمی سرمایے میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ خاص طور پر ہندوستان کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہاں عربی زبان سے وابستہ ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کی ایک بڑی تعداد رہی ہے جنھوں نے عربی زبان و ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے قومی اردو کونسل ہندوستان میں عربی بڑھ گئی ہے کہ یہ زبان روزگار سے مربوط ہے۔ غیر مسلم طبقے میں بھی اس زبان کو سیکھنے کا ذوق بڑھ رہا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ قومی اردو کونسل کو عربی زبان کی اہمیت و معنویت کا احساس ہے اسی لیے کونسل اس کے فروغ کے لیے کئی اسکیمیں چلا رہی ہے۔ قومی اردو کونسل اردو عربی کتابوں کی خریداری، مسودوں کی طباعت اور سیمینار پر بھی مالی تعاون دیتی ہے۔ اس کے علاوہ فاصلاتی تعلیم کے ذریعے فنکشنل عربک ڈپلومہ، فنکشنل عربک کورسز بھی چلائے جاتے ہیں جس کے لیے ملک کے مختلف حصوں میں اسٹڈی سینٹر قائم کیے گئے ہیں اور ان میں طلبا کی اچھی ترتیب و تشکیل دی جاسکے۔ اس موقعے پر ہندوستانی غزل گو شعرا کے کلام کو اردو سے عربی میں ترجمہ کرنے کے پروجیکٹ پر بھی غور کیا گیا۔ عربی زبان کے فروغ کے کچھ اور منصوبوں پر بھی ممبران نے اظہار خیال کیا۔

عربی زبان پینل کی اس میٹنگ میں پروفیسر محسن عثمانی، پروفیسر نعمان خان، پروفیسر کفیل احمد قاسمی، پروفیسر مسعود انور علوی، پروفیسر حسنین اختر کے علاوہ کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، اسسٹنٹ ڈائرکٹر اکیڈمک شمع کوثر یزدانی، جناب فیروز عالم اور محترمہ آبگینہ عارف نے شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 17 اگست 2016

مالی تعاون اسکیم کی رقم میں 50 فیصد کا اضافہ

قومی اردو کونسل میں گرانٹ ان ایڈ پینل کی میٹنگ کا انعقاد

نئی دہلی: قومی اردو کونسل کی آواز ملک کے طول و عرض تک پھیلتی جا رہی ہے یہی وجہ ہے کہ اس دفعہ درخواست دہندگان کی تعداد میں خاصا اضافہ دیکھا جا رہا ہے جو یقیناً ایک خوش آئند بات ہے۔ کونسل کی تاریخ میں پہلی دفعہ مالی اعانت کے لیے تقریباً ایک ہزار درخواستیں موصول ہوئی ہیں جن میں عالمی سیمینار کے تعلق سے 28 درخواستیں ہیں۔ یہ باتیں کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کونسل کے صدر دفتر میں منعقدہ گرانٹ ان ایڈ پینل کی میٹنگ میں کہیں۔ انھوں نے کہا کہ جس قدر مہنگائی بڑھی ہے۔ اس تناسب سے چھوٹی سی رقم میں سیمینار کے انعقاد میں دقتیں آرہی تھیں لہٰذا کونسل نے 50 فیصد رقم میں اضافہ کر دیا ہے۔ اس طرح ضلعی سطح کے سیمینار کے لیے 37,500، ریاستی سطح کے سیمینار کے لیے 75,000، قومی سطح کے سیمینار کے لیے 1,50,000 جب کہ عالمی سیمینار کے لیے 4,50,000 رقم مختص کی گئی ہے۔ انھوں نے مزید کہا مالی تعاون اسکیم کے تحت نہ صرف ان علاقوں کو فائدہ ہوگا جہاں اردو پڑھنے اور بولنے والوں کی تعداد زیادہ ہے بلکہ ان علاقوں کو بھی ترجیحات میں شامل رکھا گیا ہے جہاں اردو آبادی کم ہے۔ انھوں نے کہا کہ نہ صرف کونسل اردو کے فروغ کے لیے فکرمند ہے بلکہ مرکزی حکومت بھی سنجیدہ ہے اور ہمیں پورا تعاون دے رہی ہے۔ اس میٹنگ کی صدارت مشہور ناقد پروفیسر صغیر افراہیم نے کی۔ انھوں نے سال میں دو دفعہ میٹنگ کے انعقاد پر کونسل کو مبارکباد دی اور کہا کہ اس سے کونسل کی فعالیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ اس میٹنگ میں سیمینار، کانفرنس، ورک شاپ، مشاعرے اور اردو، عربی و فارسی مسودات کی اشاعت اور ریسرچ پروجیکٹ سے متعلق درخواستوں پر غور و خوض کے بعد مالی اعانت کے لیے منظور کیا گیا۔ اس میٹنگ میں پروفیسر علیم اللہ حالی، پروفیسر فاروق بخشی، پروفیسر قدسیہ انجم، ڈاکٹر کیول دھیر، ڈاکٹر مشتاق احمد نوری، ڈاکٹر نصرت مہدی، ڈاکٹر مشتاق احمد کے علاوہ کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، اسسٹنٹ ڈائرکٹر اکیڈمک محترمہ شمع کوثر یزدانی، اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر محمد فیروز عالم، ریسرچ اسسٹنٹ ڈاکٹر توقیر عالم راہی، مجیب احمد، جاوید اقبال اور ڈاکٹر شاہد اختر نے بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 24 اگست 2016

قومی اردو کونسل میں گرانٹ ان ایڈ پینل کی میٹنگ کا انعقاد

ماحولیاتی آلودگی سے انسانی زندگی کو سب سے زیادہ خطرہ

نئی دہلی: قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں شجرکاری مہم کے تحت پودا لگایا گیا۔ اس موقع پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ آلودگی کا زہر پورے کرۂ ارض میں بڑھتا جا رہا ہے اس کو ختم کرنے کے لیے شجرکاری بہت ضروری ہے۔ آج ماحولیاتی آلودگی سے انسانی زندگی کو سب سے زیادہ خطرہ لاحق ہے۔ اس لیے ماحولیات کے تحفظ کے

لیے جنگلات کو بچانا اور درخت لگانا ضروری ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اس مہم کو ہم جاری رکھیں گے تاکہ آنے والی نسل کو ایک صحت مند اور بہتر ملک سونپ سکیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ شجرکاری کی اہمیت سے عوام کو آگاہ کرنا بھی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اس شجرکاری مہم میں قومی اردو کونسل کے تمام عملے نے حصہ لیا اور یہ عہد کیا کہ اس مہم کو اور آگے بڑھائیں گے۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 23 جون 2016

کتابوں کی خریداری میں معیار سے کوئی سمجھوتہ نہیں

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں تھوک خریداری اسکیم کی میٹنگ کا انعقاد

نئی دہلی: ملک کے ایسے علاقے جہاں اردو کا رواج کم ہے، ان علاقوں کے مصنفین کی کتابوں کو تھوک خریداری اسکیم کے تحت فوقیت دی جاتی ہے، تاکہ ان کی حوصلہ افزائی ہوسکے، یہی کونسل کا مقصد ہے۔ آج کے دور میں بڑھتی مہنگائی اور اشاعتی اخراجات کو دیکھتے ہوئے کونسل نے تھوک خریداری اسکیم کے تحت مالی تعاون میں پچاس (50) فیصد کا اضافہ کیا ہے۔ اب شاعری کے لیے تیس ہزار (-/30000)، اردو، عربی و فارسی کتابوں کے لیے پینتالیس ہزار (/45000)اور جرنلس کے لیے بھی زیادہ سے زیادہ پینتالیس ہزار (/45000) مختص کیے گئے ہیں۔ یہ باتیں کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضی کریم نے صدر دفتر میں منعقدہ تھوک خریداری اسکیم پینل کی میٹنگ میں کہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ کونسل کتابوں کے معیار سے کوئی سمجھوتہ نہیں کرسکتی۔ اس کے لیے تمام ممبران پوری شفافیت کے ساتھ موصولہ کتابوں کے مواد اور اسلوب کا جائزہ لیتے ہیں اور پھر خریداری کے لیے منظوری دیتے ہیں۔ اس میٹنگ میں اردو عربی و فارسی کی جن کتابوں اور جرنلز کو خریداری کے لیے منظوری دی گئی۔ ان میں تخلیقی ادب، شاعری، سوانح، ادب اطفال، لغات، سائنس و سماجی علوم، جنرل نالج، ادبی تنقید، مذہبی کتابیں اور صحافت کے علاوہ ملک کے مختلف حصوں سے شائع ہونے والے ادبی رسائل و جرائد شامل ہیں۔ اس پینل کی صدارت مشہور شاعر و ادیب چندر بھان خیال نے کی۔

انھوں نے کہا کہ ادب کے علاوہ دیگر موضوعات کی کتابیں خریدی جارہی ہیں جو کونسل کا اچھا قدم ہے۔ انھوں نے کتابوں کی خریداری میں کونسل کے نئے طریق کار کو سراہا اور کہا کہ کونسل کے ڈائرکٹر نے یہ اچھی پہل کی ہے۔ تھوک خریداری اسکیم میں شفافیت لانے کے لیے یہ اقدام ضروری تھا۔ اس موقعے پر دیگر ممبران نے بھی اس بات پر زور دیا کہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جائے تاکہ ان کا تخلیقی جوہر نکھر کر سامنے آسکے۔ واضح رہے کہ کونسل تھوک خریداری اسکیم کے تحت ملکی سطح پر مصنفین کی کتابیں خرید کر لگ بھگ تین سو (300) لائبریریوں کو بطور ہدیہ ارسال کرتی ہے تاکہ اردو قارئین اس سے استفادہ کرسکیں۔

میٹنگ میں پروفیسر انوارالدین، پروفیسر نعمان خان، پروفیسر علیم اشرف خان، جناب چودھری ابن النصیر، محترمہ صادقہ نواب سحر، محترمہ ثروت خان، حاجی محمد اقبال خان اور خصوصی مدعو ڈاکٹر منظر حسین کے علاوہ کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، اسسٹنٹ ڈائرکٹر اکیڈمک محترمہ شمع کوثر یزدانی، اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر جناب فیروز عالم، لائبریرین محترمہ ساجدہ بیگم، محترمہ فرح دیبا، محمد اقبال موجود تھے۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 29 اگست 2016

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں 'تھوک خریداری اسکیم' کی میٹنگ کا انعقاد

سہ ماہی 'فکر و تحقیق' کا خاکہ نمبر

'ناول نمبر' کے بعد قومی اردو کونسل کے علمی، تحقیقی مجلّہ سہ ماہی 'فکر و تحقیق' کا ایک شمارہ 'خاکہ نگاری' پر مبنی ہوگا جس میں خاکہ کے فن، روایت پر تحریروں کے علاوہ مشاہیر خاکہ نگاروں پر مضامین اور ادبی شخصیات کے اہم نادر و نایاب شخصی خاکے بھی شائع کیے جائیں گے۔ اہل قلم حضرات سے تعاون کی درخواست ہے۔ آپ کے غیر مطبوعہ مضامین مع حوالہ جات کم سے کم 8000 الفاظ پر مشتمل ہونے چاہئیں۔ نگارشات درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں:

ft.ncpul@gmail.com

ایک شمارہ رفتگاں کے نام

ماہنامہ 'اردو دنیا' 2016 میں وفات پانے والی علمی و ادبی شخصیات کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے اس سال کے آخر میں ایک شمارہ 'رفتگاں کے نام' شائع کرے گا جس میں مرحومین پر تعزیتی تحریریں شامل کی جائیں گی۔ قلم کاروں سے درخواست ہے کہ اپنی غیر مطبوعہ تحریریں درج ذیل ای میل آئیڈیز پر ارسال کریں:

urduduniyancpul@yahoo.co.in, editor@ncpul.in

'فکر و تحقیق' کا ناول نمبر ایک منفرد دستاویز

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں ناول نمبر کا اجرا

نئی دہلی: قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں علمی اور تحقیقی جریدہ سہ ماہی 'فکر و تحقیق' کے ناول نمبر کا اجرا کیا

سہ ماہی 'فکر و تحقیق' کے (ناول نمبر) کا اجرا

گیا۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ ادھر بہت سے رسالوں نے ناول پر خصوصی شمارے شائع کیے ہیں اور یہ اچھی بات ہے کہ ادبی دنیا میں ناول پر خاص توجہ دی جارہی ہے۔ 'فکر و تحقیق' کا ناول نمبر بھی اسی سمت میں ایک قدم ہے اور اس شمارے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں بے جا ضخامت اور غیر ضروری تکرار واعادہ سے بچنے کی پوری کوشش کی گئی ہے اور افادی اور معنوی پہلوؤں کو ہی مدنظر رکھا گیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اگر انفرادی طور پر ناولوں پر مضامین شائع کیے جاتے تو یہ شمارہ ہزاروں صفحات پر محیط ہوتا مگر اہل علم اسے صفحات کا زیاں ہی قرار دیتے۔ اس ناول نمبر میں شعوری طور پر کوشش کی گئی ہے کہ ناول کے فن، موضوعات، اسالیب پر مرتکز تحریروں کو ہی شامل کیا جائے اور بے جا طوالت سے گریز کیا جائے، کیونکہ ضخامت کسی بھی رسالے کے معیار کی ضمانت نہیں ہوتی اور اس کی وجہ سے ایک نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ مختلف قلم کار اپنے مضامین میں ایک ہی بات بار بار دہراتے ہیں اور قاری کے علم اور آگہی میں ایک انچ کا بھی اضافہ نہیں ہو پاتا۔ انھوں نے کہا کہ ناول سے متعلق تحریریں تو اکثر رسالوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں مگر 'فکر و تحقیق' میں ایک ایسا اشاریہ مرتب کیا گیا ہے جس سے ناول پر تحقیق کرنے والے اساتذہ اور طلبا کو روشنی اور رہنمائی مل سکتی ہے۔ رسم اجرا کی اس تقریب میں شامل پروفیسر علیم اللہ حالی، پروفیسر فاروق بخشی، پروفیسر صغیر افراہیم، ڈاکٹر کیول دھیر، مشتاق احمد نوری، ڈاکٹر نصرت مہدی، ڈاکٹر مشتاق احمد، پروفیسر قدسیہ انجم وغیرہ جیسے ادبی دنیا کے مشاہیر نے 'فکر و تحقیق' کے ناول نمبر کو ایک منفرد دستاویز قرار دیا اور یہ بھی اعتراف کیا کہ 'فکر و تحقیق' کے اس نمبر میں سمندر کو کوزے میں بھرنے کی کوشش قابل ستائش ہے۔ اس اختصار پسند عہد میں ضخامت سے گریز کرتے ہوئے تمام موضوعات اور مسائل کو کم صفحات میں سمیٹ لینا بہت بڑی بات ہے اور اسی کا نام حسن ادارت ہے! شرکا نے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم کو اس خصوصی شمارے کی اشاعت پر مبارکباد دی اور یہ بھی کہا کہ آئندہ 'فکر و تحقیق' کے خصوصی شمارے فرسودہ اور پامال موضوعات کے بجائے نئے موضوعات اور مسائل کے حوالے سے شائع ہونے چاہئیں۔

اجرا کی تقریب میں کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، اسسٹنٹ ڈائرکٹر اکیڈمک محترمہ شمع کوثر یزدانی کے علاوہ شعبۂ ادارت سے وابستہ ڈاکٹر عبدالحی اور ڈاکٹر شاہد اختر انصاری بھی موجود تھے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 26 اگست 2016

قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے

'اردو صحافت کا کردار' پر سیمینار

دھرادون: ادارہ شباب اسلامی کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے ریاست اتراکھنڈ کے دارالحکومت دہرادون میں ایک روزہ سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت ہمالیہ کمپنی کے چیئرمین ڈاکٹر سید فاروق نے کی، جبکہ نظامت کے فرائض کنوینر سیمینار مولانا رسال الدین حقانی نے انجام دیے۔ اس موقعے پر متعدد اہل قلم نے اپنے مقالات میں برطانوی ہند میں اردو صحافت کے اغراض ومقاصد اور نشیب وفراز کا جائزہ پیش کیا۔ دریں اثنا 'جنگ آزادی میں اردو صحافت کا کردار' کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ کے استاذ مفتی محمد ساجد کھجناوری نے کہا کہ جنگ آزادی کی تحریک میں دیگر وسائل وذرائع کے بھرپور اعتراف کے ساتھ اردو صحافت وادب کا ناقابل فراموش کلیدی کردار رہا ہے، لہٰذا آزادی وطن کی کوئی بھی مستند تاریخ اردو صحافت کے بغیر تشنۂ تکمیل رہے گی۔ سیمینار کے دوسرے مقالہ نگار ڈاکٹر شاکر فرخ ازہری نے برطانوی عہد میں اردو صحافت کی کارگزاری کا خلاصہ پیش کیا۔ علاوہ ازیں مولانا عبدالرب ندوی، انعام رمزی، آصف حسین اور مفتی وصی اللہ قاسمی نے بھی اپنے اپنے مقالے پڑھ کر سنائے۔ اپنے صدارتی کلمات میں ڈاکٹر سید فاروق نے کہا کہ آزادی تمام ہندوستانیوں کی مشترکہ قربانیوں کا نتیجہ ہے لیکن تعجب ہے چند مجاہدین آزادی کے تذکروں ہی سے ہمارے کان اور زبانیں آشنا رہتی ہیں جبکہ بہت سے سچے جیالوں کو فراموش کردیا جاتا ہے۔ موصوف نے کہا کہ ہمیں شہید بھگت کو یاد کرنے کے ساتھ ساتھ جسٹس حیدر عباس کا بھی تذکرہ کرنا چاہیے جنھوں نے شہید بھگت کی پھانسی کے پروانے پر دستخط کرنے سے انکار کردیا تھا۔ اس موقعے پر راکیش کمار کنور، للت نارائن، مولانا محمد عثمان ندوی، وشو پرشاد رتوڑی اور شمیم احمد انجینئر نے بھی اظہار خیال کیا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 30 اگست 2016

ادبی شخصیات کے انتقال پر قومی اردو کونسل میں تعزیتی نشستیں

پیغام آفاقی

نئی دهلی: معروف فکشن نگار اور مکان وپلیتہ جیسے شہرہ آفاق ناولوں کے خالق پیغام آفاقی کی وفات کو قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اردو فکشن کا بڑا خسارہ قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ پیغام آفاقی ایک جنوئین فکشن نگار تھے جن کے اندر غیر معمولی ادراکی بصیرت تھی۔ ادب کے مسائل اور مباحث پر ان کی گہری نظر تھی۔ مقامی، قومی اور عالمی مسائل اور موضوعات سے بھی وہ

اچھی طرح واقف تھے اور ان مسائل کو انھوں نے اپنے فکشن کا محور ومرکز بھی بنایا۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ ان کے ناول مکان کو فکشن میں آفاقی حیثیت حاصل ہے۔ فکشن کے بیشتر نقادوں نے اس ناول کو اپنے تنقیدی مبحث میں شامل رکھا اور اسے اردو فکشن کا ایک نیا تجربہ قرار دیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ پیغام آفاقی کا دائرہ صرف فکشن تک محدود نہیں تھا بلکہ شاعری اور تنقید سے بھی ان کا گہرا لگاؤ تھا۔ ان کی تنقید میں دانشورانہ جھلک ملتی ہے۔ وہ معروضی و منطقی انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ ان کے شعری مجموعے درندے کو بھی ادبی حلقے میں کافی سراہا گیا اور افسانوی مجموعے مافیا کو بھی کافی شہرت نصیب ہوئی۔

پروفیسر ارتضیٰ کریم نے پیغام آفاقی کی وفات کی خبر سنتے ہی میکس ہاسپٹل شالیمار باغ، نئی دہلی جا کر ان کے پسماندگان سے تعزیت کا اظہار کیا۔ ان کے علاوہ اسپتال پہنچ کر تعزیت کرنے والوں میں ڈاکٹر نگار عظیم، حقانی القاسمی، ڈاکٹر مشتاق قادری اور ڈاکٹر عبدالحی شامل تھے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 20 اگست 2016

کشمیری لال ذاکر

نئی دهلی: معروف فکشن نگار اور شاعر کشمیری لال ذاکر کے انتقال پر اپنے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ ان کی رحلت سے اردو دنیا ایک زرخیز تخلیقی ذہن سے محروم ہوگئی

اور اردو فکشن کا ایک تابندہ ستارہ ڈوب گیا۔ کشمیری لال ذاکر کو انھوں نے ناسٹلجیائی کیفیت کی پراثر عکاسی کرنے والا فکشن نگار قرار دیتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اپنی کہانیوں میں اپنے وطن مالوف جموں کشمیر کو جاوداں کردیا ہے اور اردو ادب کو کرماں والی، آدھے چاند کی رات، نئے سال کی آخری رات، سندور کی راکھ، کتھا دامنی کی، جاتی ہوئی رُت، میرے حصے کا کشمیر، آخری ادھیائے، انگوٹھے کا نشان جب کدل کے بے نوا پرندے، بلیک باکس جیسی خیال افروز تخلیقات عطا کیں۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے ان کی اردو خدمات کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ ہریانہ جیسی سرزمین میں انھوں نے اردو کو جو شادابی عطا کی ہے وہ ادبی تاریخ کا ایک ناقابل فراموش باب ہے۔ ہریانہ اردو اکادمی کے سکریٹری کی حیثیت سے انھوں نے اردو کے فروغ کے لیے ہر ممکن کوشش کی اور وہاں اردو کے شیدائیوں کا ایک بڑا حلقہ پیدا کیا اور حکومت ہریانہ نے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں فخر ہریانہ جیسا موقر ایوارڈ عطا کیا تو حکومت ہند نے بھی ان کی ادبی خدمات کے عوض انھیں پدم شری ایوارڈ سے سرفراز کیا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 31 اگست 2016

منظر شہاب

نئی دهلی معروف شاعر وادیب منظر شہاب کے انتقال پر

اپنے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ ان کی رحلت سے ادبی منظرنامے پر اداسی سی چھا گئی ہے۔ وہ اس ادبی کہکشاں کا ایک حصہ تھے جس میں کلام حیدری، انور عظیم، اختر پیامی، شکیل الرحمٰن، حسن نعیم جیسی معتبر اور اہم شخصیتیں تھیں۔ منظر شہاب ایک بلند پایہ شاعر اور بہترین نثر نگار تھے۔ ترقی پسند تحریک سے منظر شہاب کی وابستگی پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ وہ شروع سے ہی اشتراکیت سے بہت متاثر تھے۔ اس لیے انجمن ترقی پسند مصنّفین سے نہ صرف ان کا گہرا تعلق رہا بلکہ وہ دربھنگہ شاخ کے پہلے سکریٹری بھی رہے اور مظہر امام کے اشتراک سے انھوں نے 1949 میں ترقی پسند رسالہ 'نئی کرن' بھی دربھنگہ سے شائع کیا۔ اس کے علاوہ وہ انجمن ترقی مصنّفین کے ترجمان 'نئی راہ' کی مجلس ادارت میں بھی شامل رہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ منظر شہاب (سید محمد یٰسین شعلہ شاہو بیگھوی) کا تعلق ایک ممتاز علمی اور ادبی خانوادے سے تھا۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت مخدوم سلطان بلخی سے ملتا ہے۔ ان کے والد سید محمد طٰہٰ الٰہی فکری نہ صرف متبحر عالم تھے بلکہ ایک خوش گفتار شاعر اور ہفت روزہ 'البدر' ماہنامہ 'پروانہ' کے مدیر بھی تھے اور ان کے جدامجد سید امیرالحق امیر بھی باکمال عالم اور شاعر تھے۔ اس طرح انھیں علمی اور ادبی ذوق وراثت میں ملا تھا۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ منظر شہاب نے شعر وادب میں اپنی ایک الگ شناخت قائم کی تھی۔ ان کے شعری مجموعے 'پیراہن جاں' کو ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی ملی اور ان کے مضامین کے مجموعے 'اور پھر بیاں اپنا' بھی ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوا تھا۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کریم سٹی کالج جمشید پور میں بحیثیت پرنسپل منظر شہاب مرحوم کی خدمات کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ ان کی جدوجہد سے ایک اقلیتی درس گاہ کو پورے ہندوستان میں نہ صرف شہرت نصیب ہوئی بلکہ اس کے فیض یافتگان آج ہر شعبۂ حیات میں کامیابی اور کامرانی کی نئی عبارتیں لکھ رہے ہیں۔ جمشید پور کی ثقافتی سرگرمیوں کے روح رواں تھے۔ انھوں نے شہر آہن جمشید پور کو تخلیقی وثقافتی احساس و اظہار کے ایک اہم مرکز میں تبدیل کردیا، یہ ان کا بڑا کارنامہ ہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 8 ستمبر 2016

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی:

کونسل کے لیے نئی تجاویز

مراد آباد: آل انڈیا اردو ایجوکیشنل کمیٹی کے صوبائی کنوینر مختار صدیقی نے پریس کو جاری اپنے ایک بیان میں کہا کہ کونسل کے موجودہ ڈائریکٹر ڈاکٹر محمد ارتضیٰ کریم مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے قلیل وقفے میں کونسل کے وقار کو بلند کیا بلکہ وزیر فروغ انسانی وسائل کو بھی سربلندی عطا کی۔ انھوں نے کہا کہ گذشتہ ہفتہ آل انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں منعقدہ سمینار میں ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے کونسل کو مزید فعال بنانے کے لیے اہل اردو سے اپنی بہترین تجاویز کی جو اپیل کی ہے وہ قابل تعریف ہے اور پورے ملک کے محبان اردو اور دانشوران اردو اس پر توجہ دیتے ہوئے اپنی مفید تجاویز کونسل کو جلد سے جلد ارسال کریں۔ مختار صدیقی نے اپنی تجویز پیش کرتے ہوئے کہا کہ کونسل اردو کی ابتدائی تعلیم کے لیے پورے ملک میں فعال تنظیموں اور تعلیمی اداروں کے اشتراک سے اردو سینٹر قائم کرے اور ایک مقررہ نشانے کے ساتھ اس کی فعالیت پر نظر رکھے۔ دوسری تجویز پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ قومی کونسل نئے قلمکاروں کی بھرپور حوصلہ افزائی کرے۔ ان کے ہلکے پھلکے ادب کی بھی پذیرائی ہوتا کہ نوجوان قلمکاروں کی نسل اپنی فکر اپنی صلاحیتوں کو پوری لگن اور حوصلہ کے ساتھ آگے بڑھائے ورنہ اس صدی اور اگلی صدی کے نمائندہ ادیب و شاعر کون ہوں گے؟ تیسری تجویز میں انھوں نے مشورہ دیا کہ قومی کونسل معیاری ادب کے تخلیق کاروں کے ساتھ اردو زبان کے ہر گوشہ سے وابستہ افراد کی خدمات کو سراہتے ہوئے نیشنل ایوارڈ دیے جانے کا سلسلہ انتہائی شفافیت کے ساتھ شروع کرے تاکہ اردو زبان کی خدمت انجام دینے والے افراد کی حوصلہ افزائی ہو اور ان کے جذبے میں مزید شدت پیدا ہو۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 6 اگست 2016

نیشنل ہیرالڈ، قومی آواز اور نوجیون کی دوبارہ اشاعت

نئی دهلی: ملک کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کے تحریک آزادی کے دوران قائم کردہ مشہور اخبار نیشنل ہیرالڈ اور نوجیون کی اشاعت جلد ہی دوبارہ شروع ہو جائے گی۔ ایسوسی ایٹڈ جرنلس لمیٹڈ گروپ کی طرف سے اردو اخبار قومی آواز کو بھی دوبارہ شروع کیا جائے گا۔ آؤٹ لک ہندی کے سابق ایڈیٹر اور مشہور صحافی نیلابھ مشرا کو ہیرالڈ گروپ کا چیف ایڈیٹر مقرر کیا گیا ہے۔ مسٹر مشرا اکنامک ٹائمز اور اینا ڈو گروپ میں بھی کام کر چکے ہیں۔ پنڈت نہرو نے ان اخبارات کی اشاعت کے لیے 1937 میں ایسوسی ایٹڈ جرنلس لمیٹڈ قائم کی تھی۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، یکم ستمبر 2016

دهلی:

افسانوی مجموعہ 'عیدگاہ سے واپسی' پر مذاکرہ

اسلم جمشید پوری کے افسانوی مجموعہ 'عیدگاہ سے واپسی' پر مذاکرہ

نئی دهلی: نئی نسل کہاں ہے؟ افسانوں کی محفل میں مجھے نئے لکھنے والوں کی تلاش ہوتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار معروف افسانہ نگار رتن سنگھ نے غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کے صدر اور نئی نسل کے معروف افسانہ نگار و ناقد ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کے افسانوں کا مجموعہ 'عیدگاہ سے واپسی' کے دوسرے ایڈیشن پر ایوان غالب میں منعقد مذاکرہ کے دوران کیا۔ انھوں نے موجودہ حالات پر سیر حاصل گفتگو بھی کی اور سوال بھی کھڑے کیے۔ انھوں نے کہا کہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نگار عظیم اور اسلم جمشید پوری کے بعد کی نسل کہاں ہے۔ ایک زمانہ تھا جب افسانے کے لیے ہم نوجوانوں میں جنون ہوتا تھا۔ مذاکرہ کی صدارت پروفیسر شہپر رسول، صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی نے کی۔ وہیں مہمان ذی وقار کی حیثیت سے پروفیسر ارتضیٰ کریم (ڈائرکٹر قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی) نے شرکت کی۔ نظامت معین شاداب اور شکریے کی رسم ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے ادا کی۔

اس موقعے پر پروفیسر شہپر رسول، ڈاکٹر نگار عظیم، ابرار مجیب، انجم عثمانی، پروفیسر کوثر مظہری، ڈاکٹر ابوبکر عباد، ڈاکٹر آصف علی اور ڈاکٹر شاداب علیم نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی 3 ستمبر 2016

غالب اور انیسویں صدی

نئی دهلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام غالب توسیعی خطبہ بعنوان 'غالب اور انیسویں صدی' کا انعقاد کیا گیا، جس میں الٰہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر آر ایل ہانگلو نے اپنا خطبہ پیش کیا۔ ممتاز مورخ اور جے این یو کے سابق استاذ پروفیسر ہربنس مکھیا نے صدارت کی۔

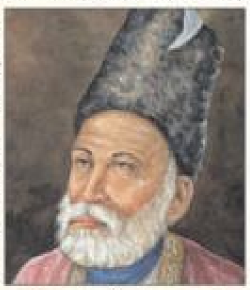

پروفیسر آر ایل ہانگلو نے کہا کہ اگر میرا دوسرا جنم ہوا تو میں اردو ادب پڑھنا پسند کروں گا غالب کی حیثیت منفرد و ممتاز ہے، غالب کسی محدود مدت کا شاعر نہیں، وہ ہمیں صدیوں پیچھے بھی لے جاتا ہے اور صدیوں آگے بھی۔ غالب اپنے زمانے کے اس فکری رجحان کی نشاۃ ثانیہ کے علم بردار تھے جس کی طلائی کڑی سرسید احمد خان تھے، جس طرح سرسید تبدیلیوں کے خواہاں تھے اسی طرح غالب بھی معاشرے میں تبدیلیوں کے لیے کوشاں تھے۔ غالب نے پہلی بار گلشن ناآفریدہ کی بات کی، غالب کی شاعری نوائے سروش سے زیادہ امکانات کے دائرے میں آتی ہے اور ان کا یہ رویہ انھیں غیر روایتی شاعر بناتا ہے۔ غالب کے افکار شیخ اکبر محی الدین ابن عربی سے لے کر متاخرین کشمیری صوفی شعرا کی توسیع ہیں۔ پروفیسر ہربنس مکھیا نے کہا کہ میں غالب کا مداح ہوں مگر میرا بہت زیادہ مطالعہ نہیں ہے، ہانگلو صاحب کا غالبیات پر عالمانہ اور خوب صورت مطالعہ ہے۔ اردو کی اعلیٰ شاعری اٹھارہویں

عین تابش کے اعزاز میں ادبی نشست

اورانیسویں صدی میں ہی ہوئی ہے۔ اٹھارہویں اورانیسویں صدی کے حوالے سے کسی شاعر کا مطالعہ دلکش ہو جاتا ہے۔ محبت کو جس طرح سے غالب نے سمجھا ہے غالبًا کسی اور شاعر نے نہیں سمجھا ہے۔ قبل ازیں غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رضا حیدر نے کہا کہ اس صدی کو سمجھنے کے لیے غالب کو سمجھنا اشد ضروری ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اظہار تشکر پیش کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 7 اگست 2015

عین تابش کے اعزاز میں ادبی نشست

نئی دھلی: مظہر فاؤنڈیشن، انڈیا کے زیر اہتمام مرزا غالب کالج گیا میں انگریزی کے استاد عین تابش کے اعزاز میں ایک ادبی نشست منعقد ہوئی جس کی صدارت شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے صدر اور معروف شاعر پروفیسر شہپر رسول نے فرمائی۔ پروگرام کے آغاز میں پروفیسر کوثر مظہری نے مہمان خصوصی جناب عین تابش کا تفصیلی تعارف پیش کیا جس میں ان کے شخصی اوصاف کے ساتھ ساتھ ان کے شعری وفنی کمالات کا بھی ذکر کیا۔ اس کے بعد نظامت کی ذمہ داری فعال اور تازہ کار شاعر جناب شکیل جمالی نے نبھائی۔ انھوں نے سب سے پہلے اس ادبی نشست کے باضابطہ آغاز کے لیے حافظ سعد اللہ احسان کو تلاوت قرآن پاک کے لیے دعوت دی۔ بعد ازاں شعری سلسلہ شروع ہوا۔ صاحب اعزاز جناب عین تابش نے اپنی غزلوں اور نظموں سے سامعین کو محظوظ کیا۔ آخر میں صدر محترم پروفیسر شہپر رسول نے اس نوع کی مختصر نشست کی معنویت اور غرض وغایت پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح کی نشست بڑے بڑے مشاعروں پر بھاری ہوتی ہے۔ اس نشست میں پروفیسر شہپر رسول، فصیح اکمل، عین تابش، کوثر مظہری، احمد محفوظ، نعمان شوق، شکیل جمالی، عرفان احمد، معین شاداب، رحمٰن مصور، عادل حیات اور خالد مبشر نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

اس نشست میں شعرا کے علاوہ جناب کمال، نوشاد منظر، امتیاز احمد علیمی، صبا نگار اور عبداللہ احسان نے شرکت کی۔

پریس ریلیز: کوثر مظہری، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، 3 اگست 2016

آندھرا پردیش :

محفل داستان گوئی

حیدر آباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، مرکز برائے اردو زبان، ادب وثقافت کے زیر اہتمام یونیورسٹی کے ڈی ڈی ای آڈیٹوریم میں داستان گوئی کی یادگار محفل کا انعقاد عمل میں آیا۔ دہلی کے معروف داستان گو فنکار پونم گردھانی اور انکت چڈھا نے اردو ادب کی مشہور داستان 'امیر حمزہ اور عمروعیار' جو 'طلسم ہوشربا' کا حصہ ہے، اپنے مخصوص انداز میں پیش کی۔ انھوں نے ابتدا میں امیر حمزہ وعمروعیار کے

بچپن کے واقعات بہت ہی دلفریب انداز میں پیش کیے۔ دوسرے دور میں ساقی نامہ کے بعد افراسیاب کے دربار میں عمروعیار کی عیاری کی حیرت انگیز داستان کچھ اس انداز میں بیان کی کہ آڈیٹوریم میں موجود حاضرین واہ واہ اور بہت خوب کہنے پر مجبور ہوگئے۔ محفل کے آغاز میں اردو ادب وتہذیب کے اس قدیم فن کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہوئے انکت چڈھا نے بتایا کہ طلسم ہوش ربا ایک ہزار سال قبل بیان کردہ داستانوں کا مجموعہ ہے۔ 600 سال بعد یہ فن ہندوستان آیا۔ مغل شہنشاہ اکبر کے دور میں اسے بہت فروغ حاصل ہوا۔ پھر نول کشور پریس، لکھنؤ نے اسے 46 جلدوں پر مشتمل تحریری کہانی کی شکل دی۔ یہ فن آہستہ آہستہ معدوم ہوتا گیا، لیکن نامور نقاد شمس الرحمٰن فاروقی نے تحقیق کے ذریعے اس کی بازیافت میں اہم رول ادا کیا۔ اب یہ تھیٹر کی دنیا میں ایک منفرد فن بن چکا ہے۔ پروگرام کے اختتام پر ڈاکٹر محمد اسلم پرویز، وائس چانسلر نے بتایا کہ مانو میں اس طرح کی محفلیں آئندہ بھی سجتی رہیں گی۔ داستان گوئی کو اتنے پرکشش انداز میں پیش کرنے کے لیے دونوں فنکاروں انکت چڈھا اور پونم گردھانی کا انھوں نے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، یکم ستمبر 2016

اتر پردیش :

اردو ادب کے غیر مسلم افسانہ نگار

سنبھل: اسلامی ایجوکیشنل سوسائٹی کی جانب سے قومی سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں تعلیم کی اہمیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی۔ شہر کے دیپا سرائے واقع آزاد گرلس انٹر کالج میں اتر پردیش اردو اکادمی کی جانب سے منعقد سیمینار کا موضوع اردو ادب کے غیر مسلم افسانہ نگار رہا۔ افسانہ نگار یاسین برکاتی نے کہا کہ اردو فکشن میں غیر مسلم افسانہ نگاروں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ پریم چند، بلونت سنگھ، رتن سنگھ نے افسانوں کی روایت کو مضبوط کیا ہے۔ مہمان خصوصی اردو اکادمی کے رکن محمد ہاشم مرادآبادی نے کہا کہ غیر مسلم افسانہ نگاروں کی بڑی تعداد ان لوگوں کو آئینہ دکھانے کو کافی ہے جو اردو کو مسلمانوں کی زبان کہتے ہیں۔ ڈاکٹر ایم اے معروف نے کہا کہ اردو افسانہ میں غیر مسلموں کی شراکت زیادہ رہی ہے اس موقعے پر ڈاکٹر عابد حسین، سلمان نبی، شفیق برکاتی، ناصر، عظمت اللہ، ڈاکٹر شہزاد، یامین، مشکور جیلانی، عرفان، ڈاکٹر منور تابش وغیرہ موجود رہے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر شاکر حسین نے ادا کیے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 25 اگست 2016

تحقیق میں دستاویزوں اور مخطوطات کی اہمیت

الہ آباد: الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ عربی و فارسی نے اپنے سابق استاد پروفیسر محمد رفیق (16 اگست 1916 تا 5

نومبر 1992) کا 100واں یوم پیدائش منایا۔ اس موقعے پر شعبہ نے ریجنل آرکائیوز کے اشتراک سے 'تحقیق میں دستاویزوں اور مخطوطات کی اہمیت' عنوان سے ایک لکچر کا اہتمام کیا۔ اس جلسہ میں بطور مہمان خصوصی کمشنر الہ آباد زون، عالیجناب راجن شکلا نے شرکت کی۔ پروگرام کا آغاز شہیدان آزادی کو خراج عقیدت پیش کرکے کیا گیا۔ صدر شعبۂ عربی وفارسی ڈاکٹر صالحہ رشید نے پروفیسر محمد رفیق کا تعارف پیش کرتے ہوئے ان کے کوائف بھی پیش کیے۔ ریجنل آرکائیوز کے آفیسر انچارج جناب اہل اگنی

ہوتری نے دستاویز اور مخطوطات کو قومی سرمایہ اور ان کی حفاظت کو قومی فریضہ بتایا۔ان کے بیان کے مطابق ان کی کسٹڈی میں کئی بیش قیمت مغلوں کے دور کے فرمان اور سندیں موجود ہیں۔اس کے علاوہ تاریخ زبان وادب، طب ،نجوم ،فلسفہ اور مختلف ادیان پر ہاتھ سے لکھی ہوئی نادر کتابیں موجود ہیں لیکن اس شہر میں انھیں ان کے قدر دان کم نظر آئے ہیں۔اس پروگرام کے انعقاد اور اس میں شعبۂ عربی و فارسی کے ریسرچ اسکالرس اور دیگر طلباء کی شمولیت سے انھیں امید بندھی ہے کہ آنے والے دنوں میں ڈیجیٹل آرکائیوز تحقیق کا مرکز بن کر ابھرے گا۔انھوں نے طلباء کو مختلف نسخوں کی معلومات فراہم کی اور تمام مہمانوں کو رکارڈ روم وزٹ کرایا۔مسٹر اگنی ہوتری نے کچھ نسخوں کے ترجمہ کے لیے چند ایجنسیوں کے ذریعہ مالی تعاون کی پیش کش کی بھی جانکاری دی۔

اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مہمان خصوصی کمشنر راجن شکلا نے اس قدم کو خوش آئند بتاتے ہوئے کہا کہ دستاویز اور مخطوطات کی قرأت سے انگنت ایسے حقائق سامنے آسکتے ہیں جن کی بدولت سماج میں پنپنے والی غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں۔آج ان کی قرأت کی اہمیت کچھ زیادہ ہے۔ پروگرام کی نظامت ہریش چند دوبے نے کی اور جناب غلام سرور نے شرکاء کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: صالحہ رشید، الہ آباد، 18 اگست 2016

مولوی عبدالحق کے یومِ وفات پر سمینار

فیروز آباد: انجمن ترقی اردو ہند شاخ فیروز آباد کے زیر اہتمام ایک سمینار بابائے اردو مولوی عبدالحق کے یوم

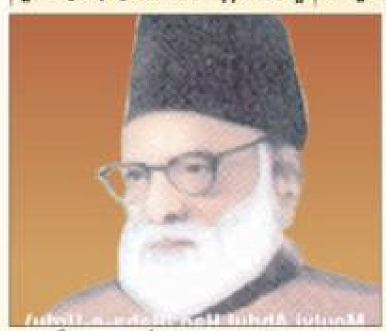

وفات کے موقعے پر حالی پبلک اسکول، غالب نگر میں منعقد کیا گیا، جس میں مولوی عبدالحق کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اُن کی اردو خدمات کا ذکر کیا گیا۔ سمینار کی صدارت انجمن ترقی اردو ہند شاخ فیروز آباد کے صدر سید ڈاکٹر حشمی جمیل حسین نے کی۔ تقریب میں مقررین نے مولوی عبدالحق کی زندگی اور ان کی خدمات کا اعتراف کیا۔ کاشی اردو مرکز کے صدر میاں بصارالدین نے اپنے مقالے میں کہا کہ کسی بھی زبان کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ اُس کے الفاظ کی حفاظت کی جائے۔ بابائے اردو نے اردو زبان کی بقا کے لیے ایسے الفاظ کی حفاظت کرتے ہوئے اردو لغت مرتب کی اور تاعمر اردو کی خدمت کرتے رہے۔ رائٹ وے انگلش اسکول کے مہتمم آصف سہیل نے اس موقعے پر بابائے اردو کے حالات زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ مولوی عبدالحق کی پیدائش اتر پردیش کے ہاپوڑ نام کے شہر میں 16 نومبر 1872 کو ہوئی تھی۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے 1894 میں بی اے کیا تھا۔

روز نامہ 'انقلاب' دہلی، 18 اگست 2016

اردو کا دبستان ادب

گورکھپور: شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی کی جانب سے یک روزہ شعبہ جاتی سمینار کا انعقاد بعنوان 'اردو کا دبستان ادب' کیا گیا۔اس سمینار کی صدارت ڈاکٹر محمد اشرف نے کی۔انھوں نے اپنے خطبے میں اردو زبان وادب کو فروغ دینے اور اس کی اہمیت وافادیت کو دبستانی پس منظر میں سمجھنے پر زور دیا۔ڈاکٹر ساجد حسین نے ادبی دبستان کے حوالے سے گفتگو کی۔ ڈاکٹر عبدالرحمن نے اردو زبان و بیان کی ہمہ رنگی پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اردو کو اس کی اصلی شکل میں زندہ رکھنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ مزید وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اردو الفاظ کے ساتھ ساتھ اس کے رسم الخط کا بھی التزام ناگزیر ہونا چاہیے یہی اردو کی پہچان ہے۔ ڈاکٹر رضی الرحمن صدر شعبۂ اردو نے اس تقریب کی سرپرستی کی اور انھوں نے کہا کہ اردو کا دبستانی ادب اپنی معاشرتی تہذیبی، ثقافتی اور لسانی سطح پر الگ پہچان رکھتا ہے اور اس پہچان کو قائم رکھتے ہوئے اس کو ترقی دینے کی ضرورت ہے۔ اس سمینار میں فرحان کاظمی، شبانہ، محمد یاسر عارف، تحریم الٰہی، سمیع اللہ، ظل الرحمن، بلقیس، ریسرچ اسکالر میں معین عارف، شریف نواز، سیدہ خاتون، نغمہ تبسم نے مقالے پیش کیے۔ سمینار کی نظامت محمد یاسر عارف نے کی اور اظہار تشکر ریسرچ اسکالر معین عارف نے پیش کیا۔سمینار میں راشد اقبال، محمد ناظر حسین و دیگر طلبا وطالبات نے شرکت کی۔

روز نامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 25 اگست 2016

آئی اے ایس کے امتحان میں اردو زبان کی اہمیت

علی گڑھ: سچی لگن اور محنت سے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے جنون سے ہی کامیابی حاصل کرسکتا ہے۔طلبہ میں آئی اے ایس جیسے بڑے امتحانات کو لے کر زیادہ بیدار ہونے کی ضرورت ہے۔ان خیالات کا اظہار الہ آباد

یونیورسٹی کے عربی، فارسی شعبہ کی چیئر پرسن پروفیسر صالحہ رشید نے سول سروسز میں اردو زبان کی اہمیت کے موضوع پر بولتے ہوئے کیا ہے۔ انھوں نے طلبہ کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا کہ حالات مخالف ہوں مگر ہمت کبھی نہیں ہارنی چاہیے، انھوں نے کہا کہ آئی اے ایس کے لیے جہاں لاکھوں درخواستیں مسلمانوں کو داخل کرنی چاہیے مگر بمشکل تمام تقریباً بارہ ہزار تک ہی درخواستیں موصول ہو پاتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ بچوں کی تربیت کے لیے ماں صد فیصد ذمہ دار ہے۔ معاشرے کی ابتری کے لیے حکومت کو ذمہ دار ٹھہرانے کی جگہ خود احتسابی کو ترجیح دیں۔ پروفیسر صغیر افراہیم نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ انسان کے آگے بڑھنے کا راز محنت اور یکسوئی ہے۔ امتحانات میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے بولنے اور لکھنے میں مہارت ہونی چاہیے۔ سابق چیئرمین شعبہ اردو پروفیسر محمد زاہد نے اپنے تجربات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ طلبہ کو منصوبہ بند طریقے سے سنجیدگی کے ساتھ کریئر کے لیے تیاری کرنی چاہیے۔اخبار کا مطالعہ آئی اے ایس کی تیاری کے لیے بہت معاون ہے۔ میجر محمد اظہر نور اعظمی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

روز نامہ 'انقلاب' دہلی، 29 اگست 2016

بہار:

آل انڈیا اقلیتی تعلیمی بورڈ کی میٹنگ

ارریہ: آل انڈیا اقلیتی تعلیمی بورڈ ارریہ شاخ کی مشاورتی میٹنگ پروفیسر رقیب احمد پرنسپل ملیہ ڈگری کالج بہار کے زیر صدارت سرسید لائبریری ٹاؤن ہال ارریہ میں منعقد ہوئی۔ سکریٹری اقلیتی ایجوکیشن بورڈ سرور عالم ندوی ڈائریکٹر الشمس اکادمی ملت نگر ارریہ نے گذشتہ کارگزاری کی تفصیلات بتاتے ہوئے مزید کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ سرسید لائبریری میں ملی جماعت و تنظیم کی جانب سے میٹرک کے غریب بچوں کے لیے مفت کوچنگ کا نظم ہو، کیونکہ کالج میں جگہ کی فراوانی ہے۔اس مشورہ کو حاضرین نے کافی سراہا۔ماسٹر دین رضا اختر ملہر یا ہائی اسکول نے اپنے خطاب میں تنظیم کو گاؤں گاؤں میں جاکر تعلیمی بیداری کے لیے کام کرنے کی پرزور وکالت کی۔

پروفیسر رقیب احمد نے صدارتی کلمات میں اردو

'اختر اورینوی کی شخصیت اور ان کے ادبی کارنامے' پر منعقدہ سیمینار کا منظر

زبان و ادب سے متعلق کہا کہ اردو زبان اور قرآن کو پڑھوانے کو فوقیت دی جائے۔ ارریہ ضلع کے چند کامیاب ناموں کا ذکر بھی کیا جنھوں نے اردو زبان و ادب میں پہلے مہارت حاصل کی پھر دوسری زبان میں بھی کمال پیدا کر کے بلند مقام پر فائز ہوئے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 19 اگست 2016

اردو مشاورتی کمیٹی کی چوتھی نشست

پٹنہ: اردو مشاورتی کمیٹی کی چوتھی عام نشست ایک جہت سے مزید اہمیت کی حامل ہے کیونکہ اردو مشاورتی کمیٹی نے اپنی تشکیل کے پورے ایک سال مکمل کر لیے ہیں۔ ہمیں اپنا احتساب کرنا ہے کہ ایک سال کے عرصے میں اردو کے فروغ اور عملی نفاذ کے سلسلے میں ہمارا کردار کیا رہا ہے۔ یہ باتیں اردو مشاورتی کمیٹی کے صدر نشیں شفیع مشہدی نے مقامی ابھی لیکھ بھون میں کمیٹی کی عام نشست میں عہدے داران اور اراکین کا استقبال کرتے ہوئے کہیں۔ انھوں نے اس موقعے پر رجسٹری آفس میں اردو فارمیٹ جاری کرنے، مہاتما گاندھی نیشنل یونیورسٹی میں شعبۂ اردو قائم کرنے، کمیٹی کے اراکین کے اعزازیہ میں اضافہ کرنے، اردو ٹی ای ٹی اساتذہ کی جلد بحالی کرنے کی تجاویز پیش کیں، جنھیں اتفاق رائے سے منظور کر لیا گیا۔ نشست میں نائب صدر نشیں ڈاکٹر مشتاق احمد اور اراکین کمیٹی میجر بلبیر سنگھ بھسین، پروفیسر توقیر عالم، ڈاکٹر محمد اعجاز احمد، مشتاق احمد نوری، ڈاکٹر سید احمد قادری، پروفیسر قمر جہاں، شاہ ہلال احمد قادری، اسد رضوی، ڈاکٹر ریحان غنی، عبدالحنان سبحانی، افضل حسین، شنکر کیموری نے شرکت کی اور تمام ایجنڈوں پر اپنے اپنے خیالات کا بھرپور اظہار کیا۔ اس موقعے پر ڈپٹی ڈائرکٹر (اردو) محمد خورشید عالم انصاری بھی شامل تھے۔ اردو مشاورتی کمیٹی کے رکن سکریٹری اور ڈائرکٹر (اردو) امتیاز احمد کریمی نے کہا کہ اردو ڈائرکٹوریٹ آپ لوگوں کے تعاون سے پوری ریاست میں اردو زبان کی ہمہ جہت ترقی اور ماحول سازی کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔ اس موقعے پر تمام ممبران نے اردو زبان کے فروغ کے لیے کئی اہم تجاویز پیش کیں اور اسے عملی صورت میں لانے کی وکالت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 اگست 2016

اختر اورینوی کی شخصیت اور ان کے ادبی کارنامے

پٹنہ: اردو ادب میں اختر اورینوی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ دانشوروں نے ان کی ادبی شخصیت اور تخلیقی جوہر کا اعتراف بھی کیا، مگر اس کے باوجود ان کی پذیرائی جس طرح ہونی چاہیے وہ نہیں ہو پائی اور انھیں وہ مقام بھی حاصل نہیں ہوا جس کے وہ حقدار تھے۔ اختر اورینوی کی شخصیت اور ان کے ادبی کارناموں کے تعلق سے دانشوروں نے بہار اردو اکادمی میں اردو ڈائریکٹوریٹ کے زیر اہتمام ایک سیمینار میں ان کے مختلف پہلوؤں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروفیسر علیم اللہ حالی نے کہا کہ بہار کو یہ فخر حاصل ہے کہ اختر اورینوی کی جائے پیدائش یہاں ہے مگر انھیں دانستہ طور پر نظر انداز کیا گیا۔ وہ تعصب اور علاقائیت کے شکار ہو گئے۔ وہ بیک وقت افسانہ نگار، شاعر، تنقید نگار اور ڈرامہ نگار تھے۔ ان کی شخصیت اور ان کے کلام میں جو مشاہدہ کارفرما ہے وہ کم ادیبوں اور شاعروں کے حصے میں آیا ہے۔ پروفیسر اعجاز علی ارشد نے اختر اورینوی کے ساتھ اپنی وابستگی کا اظہار کرتے ہوئے بے باک انداز میں ان کے مختلف اوصاف کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ مجھے خود بھی ان کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ وہ ایک اچھے افسانہ نگار تھے۔ پروفیسر اسلم آزاد نے بھی اختر اورینوی سے اپنی گہری وابستگی اور روحانی تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایک اچھے افسانہ نگار کے علاوہ عظیم انسان بھی تھے۔ معروف صحافی ریاض عظیم آبادی نے بھی اختر اورینوی کو بڑا تحریک کار بتایا۔ انھوں نے کہا کہ آزادی کے بعد مردم شماری میں اردو کو مادری زبان کے طور پر اندراج کرانے میں ان کا اہم رول رہا۔ غلام سرور کی اردو تحریک بھی ان کی مرہون منت ہے۔ مشتاق احمد نوری نے کہا کہ اختر اورینوی کی عظمت کا اعتراف بہار ہی نہیں بلکہ ملک گیر سطح پر کیا گیا۔ ان کے تحقیقی مقالے میں جمالیاتی عنصر کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ محض تقریر اور مقالے پڑھ کر اختر اورینوی کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس کے لیے اختر اورینوی کے ادب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس موقعے پر تین طلبا نے بھی اختر اورینوی کے ادب پر اپنے مقالے پیش کیے۔ یادگاری تقریب کا اختتام شعری نشست پر ہوا۔ تقریب کی صدارت شفیع مشہدی نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 اگست 2016

پنجاب:

پنجاب یونیورسٹی میں اب بھی اردو کا بول بالا

چنڈی گڑھ: انڈین ایکسپریس کی رپورٹ کے مطابق سنسکرت کے سرٹیفکیٹ کورس میں 68 سیٹیں دستیاب ہیں، جبکہ محض 29 امیدواروں نے اس میں داخلہ لینے کے لیے

درخواستیں دی ہیں اور صرف 9 امیدواروں نے اندراج کرایا۔ اس کے برعکس اردو کورس میں 85 سیٹوں کے لیے 350 امیدواروں نے درخواستیں دی ہیں اور یہ تمام سیٹیں بھر گئی ہیں۔ گذشتہ سال اردو کورس میں 200 امیدواروں نے درخواستیں دی تھیں۔ شعبہ اردو کے ایک طالب علم یوش نے بتایا کہ 'اردو ادب کا رجحان رکھنے والے لوگ اردو سیکھنا چاہتے ہیں، خصوصی طور پر اردو شاعری جس میں بہت زیادہ رومانیت ہے۔ یہ زبان لوگوں کو مضمون نگار بناتی ہے اور وہ اپنے کام میں محو رہتے ہیں۔' علاوہ ازیں معروف اور مقبول ترین فلموں کے گیتوں میں اردو کی آمیزش ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے لوگ اس زبان کو پسند کرتے ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے افسران کو اس بات پر تعجب ہے کہ اردو کے علاوہ طلبا غیر ملکی زبانیں جیسے فرانسیسی اور جرمن زبانیں سیکھنے کے لیے بہت زیادہ خواہشمند ہوتے ہیں۔ اس سال فرانسیسی زبان میں سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لیے 1100 درخواستیں موصول ہوئی تھیں، جبکہ گذشتہ سال یہ تعداد محض 800 تھی۔ علاوہ ازیں جرمن زبان میں سرٹیفکیٹ کورس کے لیے 136 سیٹ دستیاب تھیں، جبکہ اس کے لیے 600 سے زائد طلبا نے درخواستیں دی تھیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 11 اگست 2016

کل ہند مشاعرہ برائے خواتین

مالیرکوٹلہ: جشن آزادی کی 70 ویں سالگرہ کے موقعے پر پنجاب اردو اکادمی کے زیر اہتمام پہلی مرتبہ 'کل ہند مشاعرہ برائے خواتین' منعقد کیا گیا جس میں محترمہ فرزانہ عالم، چیئر پرسن، پنجاب وقف بورڈ اور وائس چیئر پرسن پنجاب اردو اکادمی نے بحیثیت مہمان خصوصی،

سہ روزہ ورکشاپ 'آئیے بچوں کے لیے اردو میں لکھنا سیکھیں' کا منظر

'ایک شام غالب کے نام' سے منعقدہ جلسے کا منظر

محترمہ صبا شاہین، پرنسپل اسلامیہ گلز سینئر سیکنڈری اسکول نے مہمان اعزازی اور محترمہ ریحانہ نقوی، پرنسپل الفلاح پبلک سینئر سیکنڈری اسکول نے اس پروقار مشاعرے کی صدارت کی۔ کل ہند خواتین کے مشاعرے میں استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے اکادمی کے سکریٹری پروفیسر منظور حسن نے کہا کہ پنجاب اردو اکادمی کا بنیادی مقصد اردو زبان کی بقا اور اس کا فروغ ہے چنانچہ ایسے مشاعرے اور ادبی پروگرام اردو زبان وادب کی بقا اور فروغ کے لیے اہم رول ادا کرتے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس طرح کے مشاعرے ہماری تہذیبی، ثقافتی اور ادبی روایات کا اعلیٰ حصہ ہیں۔

مہمان اعزازی محترمہ صبا شاہین نے اردو اکادمی کی مکمل فعالیت پر اظہار اطمینان کیا اور اکادمی کی جانب سے منعقد کیے گئے مختلف ادبی پروگراموں کو پنجاب میں اردو کی ترقی کا ضامن قرار دیا۔ محترمہ فرزانہ عالم نے اپنے خطبے میں کہا کہ زبان زندہ رہے گی تبھی اس کا فروغ ہوگا۔ اپنے صدارتی خطبے میں پرنسپل ریحانہ نقوی نے شاعری کا رشتہ زمانۂ قدیم سے جوڑتے ہوئے کہا کہ شاعرات کو اپنے منصب اور ذمے داریوں کو سمجھتے ہوئے ملک وقوم کی بہتری اور اصلاح معاشرہ کے لیے اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لانا چاہیے۔ مشاعرہ کی نظامت کے فرائض محترمہ روبینہ شبنم، صدر، نواب شیر محمد خاں انسٹی ٹیوٹ، مالیر کوٹلہ نے بحسن و خوبی انجام دیے۔ اکادمی کے سکریٹری پروفیسر منظور حسن کے اظہار تشکر کے ساتھ ہی یہ مشاعرہ اختتام پذیر ہوا۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 20 اگست 2016

تلنگانہ:

انٹرنیشنل میڈیا سینٹر کے پریویو تھیٹر کا افتتاح

حیدرآباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی متنوع اور

عصری مضامین کا حسین امتزاج اردو کے ذریعے فراہم کرتے ہوئے اردو کی نمایاں خدمت انجام دے رہی ہے۔ نوین چند، آئی پی ایس، کمشنر پولیس سائبرآباد، حیدرآباد نے یونیورسٹی کے انسٹرکشنل میڈیا سینٹر کے پریویو تھیٹر کے افتتاح کے بعد ان خیالات کا اظہار کیا۔

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز، وائس چانسلر نے تقریب کی صدارت کی۔ نوین چند نے مزید کہا کہ پریویو تھیٹر جیسی تعلیمی سہولت کا افتتاح ان کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں۔ میڈیا سینٹر کے تفصیلی معائنے کے بعد انھوں نے اعتراف کیا کہ یہاں دستیاب جدید سہولتوں کا کسی بھی عصری ٹیلی ویژن اسٹوڈیو سے تقابل کیا جاسکتا ہے۔ یونیورسٹی کے تعلیمی ماحول کی ستائش کرتے ہوئے انھوں نے اردو کی واحد یونیورسٹی کی ترقی اور یہاں سے فارغ ہونے والے طلبہ کے روشن مستقبل کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ اردو زبان میں درسی مواد کی تیاری ایک اہم کام ہے۔ یونیورسٹی سے تعاون پر انھوں نے محکمہ پولیس کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 18 اگست 2016

آئیے بچوں کے لیے اردو میں لکھنا سیکھیں

حیدرآباد: کوئی بھی انسان وہی چیزیں اپنے اندر جذب کرتا ہے جو اس کے ماحول کا حصہ ہوں۔ طلبہ کی مناسب تربیت اور تعلیمی فضا برقرار رکھنے اور اسے زیادہ سے زیادہ بامعنی بنانے کے لیے طلبہ مرکوز سرگرمیوں کی اشد ضرورت ہے۔ ان خیالات کا اظہار اکٹر محمد اسلم پرویز، وائس چانسلر نے سہ روزہ ورکشاپ 'آئیے بچوں کے لیے اردو میں لکھنا سیکھیں' کے افتتاحی اجلاس میں خطاب کرتے ہوئے کیا۔ اس ورکشاپ کا انعقاد 27 تا 29 اگست 2016 یونیورسٹی کے مرکز برائے اردو زبان، ادب وثقافت کی جانب سے بچوں کے لیے کتابیں شائع کرنے والے ممتاز اشاعتی ادارے پرتھم بکس کے زیر اشتراک کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز نے مزید کہا کہ ادب کے ساتھ ساتھ ہمیں اردو زبان کو مختلف علوم کی معلومات کا بھی ذریعہ بنانا ہوگا۔ اس سے اردو زبان کو وسعت اور پائیداری ملے گی۔ اس موقعے پر پرتھم بکس کی مدیر اعلیٰ محترمہ منیشا چودھری نے ورکشاپ کے متعلق تفصیلات فراہم کرتے ہوئے کہا کہ اپنی زبان کے تحفظ کے لیے ادب اطفال کا فروغ نہایت ضروری ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ کہانیاں شخصیت اور کردار کی تشکیل وتعمیر کا کام کرتی ہیں۔ راجیش کھر، ایڈیٹر پرتھم نے اپنی تنظیم کے متعلق معلومات فراہم کیں۔ محترمہ مالا کمار، ایڈیٹر پرتھم نے فیڈ بیک لینے کے لیے دلچسپ کھیل کا مظاہرہ کیا۔ انیس اعظمی، چیف کنسلٹنٹ اردو مرکز نے کارروائی چلائی۔ انھوں نے ابتدا میں ورکشاپ کے مقاصد پر روشنی ڈالی اور اس کے ساتھ ساتھ طلبہ کی ذہن سازی اور ان کی شخصیت میں نکھار پیدا کرنے کے لیے مرکز کی جانب سے بنائے گئے مستقبل کے منصوبوں سے آگاہ کیا۔ پروفیسر صدیقی محمد محمود، صدر شعبۂ تعلیم وتربیت نے نفسیات کو جھنجھوڑنے والی ایک بہترین کہانی سنائی۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 28 اگست 2016

راجستھان:

ایک شام غالب کے نام

جے پور: غالب انسٹی ٹیوٹ اور راجستھان کا اہم ادبی و ثقافتی ادارہ جواہر کلا کیندر، جے پور کے باہمی اشتراک سے 'ایک شام غالب کے نام' کے موضوع پر جے پور میں ایک بڑے جلسے کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس جلسے میں راجستھان کے سابق وزیر صحت اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے وائس چیئرمین جناب اعماد الدین احمد خاں مہمان خصوصی کی حیثیت سے موجود تھے اور جناب جگروپ سنگھ یادو، جناب معظم علی، انورادھا سنگھ کے علاوہ کئی ادیبوں نے غالب اور عہد غالب کے تعلق سے گفتگو کی۔ اعماد الدین احمد خاں نے اس جلسے کا افتتاح کرتے ہوئے سب سے پہلے غالب انسٹی ٹیوٹ اور جواہر کلا کیندر کو مبارکباد پیش کی اور فرمایا کہ ہم سب کے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے کہ سرزمین راجستھان پر ہم اس عظیم شاعر کو یاد کر رہے ہیں جس نے اپنی شاعری کے ذریعے پوری عالم انسانیت کو محبت اور بھائی چارگی کا پیغام دیا۔ اعماد الدین احمد خاں نے غالب کے حوالے سے فرمایا کہ غالب کی شاعری کی مقبولیت کس حد تک بڑھ رہی

ہے اس کا اندازہ اس بات سے بھی بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ ملک کے بڑے بڑے رہنما بھی اپنی گفتگو میں وزن پیدا کرنے کے لیے غالب کے اشعار کا استعمال کرتے ہیں۔ عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ غالب کے کلام کو پسند کرنے والے صرف ایک طبقے کے لوگ ہیں لیکن یہ ہماری غلط فہمی ہے کیونکہ آج غیر اردو داں طبقے میں سب سے زیادہ غالب محبوب بنے ہوئے ہیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر رضا حیدر نے اپنی استقبالیہ گفتگو میں کہا کہ اس ادارے کے مقاصد میں اردو و فارسی زبان و ادب کی ترقی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ ہم غالب، معاصرینِ غالب اور عہدِ غالب پر ملک کے بھی بڑے شہروں میں جلسے کا انعقاد کریں۔ ہم نے ایک ملک کے متعدد شہروں میں غالب کو یاد کیا ہے اور ہمیں خوشی ہو رہی ہے کہ ہم جے پور میں بھی غالب پر گفتگو کے لیے موجود ہیں۔ اس جلسے میں جگروپ سنگھ یادو (آئی اے ایس)، معظم علی سکریٹری راجستھان اردو اکادمی اور اظہار مسرت نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 9 اگست 2016

کرناٹک:

کرناٹک میں اردو زبان کے فروغ کے مسائل اور حل

ناگمنگل: منڈیا ضلع کے ناگمنگل میں ایک روزہ سیمینار اور کل ریاستی مشاعرہ کرناٹک اردو اکادمی اور بزم گلستانِ ادب ناگمنگل کے اشتراک سے بخوبی عمل میں آیا۔ 'ریاست کرناٹک میں اردو زبان کے فروغ کے مسائل اور حل' کے عنوان پر قاضی انیس الحق مؤظف ایڈیشنل ڈائریکٹر جنرل دوردرشن، ڈاکٹر حلیمہ فردوس اور ڈاکٹر فجیہہ سلطانہ نے کامیاب مقالے پیش کیے۔ انھوں نے اپنے مقالوں میں دلائل پیش کیے کہ اردو کو پس پشت ڈالا جا رہا ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے کرناٹک میں اردو کے تعلق سے پیدا شدہ مسائل کو پیش کرنے کے ساتھ ان کے قابل قبول تدارک بھی پیش کیے۔ یہ سیمینار منڈیا روڈ پر واقع نیشنل اسکول میں بروز اتوار بتاریخ 14 جولائی 2016 کو 11 بجے شروع ہوا۔ جس کا افتتاح عزیز اللہ بیگ چیئرمین کرناٹک اردو اکادمی کے بدست عمل میں آیا۔ اس نشست کے مہمانان خصوصی پروفیسر م ن سعید سابق چیئرمین کرناٹک اردو اکادمی کے افتخار احمد شریف مدیر روزنامہ سالار بنگلور اور شری کے آر انگ راجو بی ای او، نیشنل اسکول کے مالک عبدالرحمن مطیب رہے۔ پروفیسر م ن سعید نے اپنے تاثرات میں مقالہ نگاروں کی کاوشوں کو سراہا۔ انھوں نے اپنے بیان میں بتایا کہ اردو کا کوئی مسلک، مذہب اور ملک نہیں ہے۔ یہ کسی خاص مذہب کی زبان نہیں ہے۔ افتخار احمد شریف نے اپنے مخصوص لب و لہجہ میں تاثرات پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو کبھی ختم ہونے والی زبان نہیں ہے۔ عبدالرحمن مطیب مالک نیشنل اسکول نے بتایا کہ زیادہ پڑھے لکھے نہ ہونے کے باوجود تعلیم کو فروغ دینے کی خاطر ایک اسکول قائم کیا ہے اور اس اسکول میں سہ لسانی فارمولے کے تحت اردو بھی پڑھائی جا رہی ہے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 9 اگست 2016

مہاراشٹر:

'سائنس کے تدریسی مسائل اور حل' کے موضوع پر مذاکرہ

'سائنس کے تدریسی مسائل اور حل'

بیاول: ضلع جلگاؤں کے معروف تعلیمی ادارے نیشنل ایجوکیشن سوسائٹی بیاول کے زیر اہتمام ڈاکٹر ذاکر حسین اردو ہائی اسکول و جونیئر کالج بیاول میں مورخہ 20 اگست 2016 بروز سنیچر کو 'سائنس کی تدریس' جیسے اہم موضوع پر مذاکرہ شہر کی معروف تعلیمی و ادبی تنظیم 'اردو سیوا' کی جانب سے منعقد ہوا جس میں سائنس ہماراورثہ، سائنسی اصطلاحات، مسائل اور حل، سائنس کی اہمیت و افادیت، اردو اور جدید ٹکنالوجی جیسے موضوعات پر جناب محمد طاہر قریشی، جناب جلیل احمد، جناب عارف محمد خان اور رحیم رضا پرنسپل ذاکر حسین ہائی اسکول و جونیئر کالج بیاول نے اظہار خیال کیا۔ اس موقعے پر بیاول، فیض پور، بھساول، ساودہ، مارول وغیرہ ہائی اسکولوں کے سائنس ٹیچرس شریک ہوئے۔ جناب عارف محمد خان اور جناب طاہر اشرف قریشی نے اساتذہ کو سائنس کی تدریس کے دوران درپیش مسائل پر سیر حاصل روشنی ڈالی اور مشوروں سے نوازا۔ ادارہ ہذا کے نائب صدر جناب بلال سر بحیثیت مہمانِ خصوصی شریک تھے۔ اسکول ہذا کے اسٹاف ممبران کے ساتھ ساتھ جناب نہال (الحرا اردو ہائی اسکول بھساول)، جناب اظہر (اینگلو اردو ہائی اسکول ساودہ)، جناب کفیل (اینگلو اردو ہائی اسکول مارول)، محترمہ نور جہاں میڈیم (فاطمہ اردو گرلس ہائی اسکول فیض پور) اور ارشد خان (اندرا گاندھی اردو گرلس ہائی اسکول بیاول) نے نہایت دلچسپی و سرگرمی کا مظاہرہ کیا نیز پرنسپل رحیم رضا صدر سوسائٹی ہذا و اراکین کو اس اہم موضوع پر مذاکرہ رکھنے پر مبارکباد دیتے ہوئے مستقبل میں ریاضی پر بھی اس قسم کا مذاکرہ رکھنے کی درخواست کی۔

پریس ریلیز: رحیم رضا، جلگاؤں، مہاراشٹر 22 اگست 2016

ادارۂ نثری ادب مالیگاؤں

مالیگاؤں: ادارۂ نثری ادب مالیگاؤں کے زیر اہتمام 27 اگست 2016 بروز سنیچر کو بعد نماز عشا ادبی نشست کا اہتمام اے ٹی ٹی ہائی اسکول اینڈ جونیئر کالج میں ہوا جس کی صدارت کے فرائض مالیگاؤں ہائی اسکول کے سابق ہیڈ ماسٹر محترم جناب عتیق شعبان نے انجام دیے۔ نظامت کے فرائض ایم ایس جی آرٹس، سائنس اینڈ کامرس کالج کے پروفیسر محترم جناب مبین نذیر نے انجام دیے۔ نشست کا آغاز جناب حافظ انصاری محمد یاسین کی قرأت سے ہوا۔ اس موقعے پر جناب انصاری عبدالمجید ماسٹر، جناب نعیم سلیم، جناب پروفیسر مبین نذیر، نے اپنی تحریریں پڑھیں۔ جناب انصاری عبدالمجید ماسٹر بچوں کے ادیب ہیں۔ موصوف نے 'جنگل کی شہریت' کے عنوان سے کہانی پیش کی۔ جناب نعیم سلیم نے 'کوشش' کے عنوان کا بہترین انشائیہ پیش کیا۔ جناب پروفیسر مبین نذیر نے حالات حاضرہ کے مدنظر 'گئو منتر' کے عنوان سے بہترین افسانچہ پیش کیا۔ سامعین نے نقد تبصرہ، تنقید اور مشورہ دینے کے فرائض نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیے۔ مجلس صدر نے اپنی صدارتی تقریر میں قلم کاروں کو مبارک باد پیش کی۔ جناب انصاری عبدالمجید نے رسم شکریہ کے فرض کو انجام دیا۔

پریس ریلیز: انصاری محمد یامین نذیر احمد، مالیگاؤں، مہاراشٹر 28 اگست 2016

ڈاکٹر احمد حسن زویل پر تعزیتی نشست

سولاپور: سولاپور کونسل برائے فروغ سائنس سولاپور کے زیر اہتمام نوبل انعام یافتہ مشہور امریکی سائنس داں و فیموکیمسٹری کے موجد ڈاکٹر احمد حسن زویل کے انتقال پر

ایک یادگار تعزیتی نشست منعقد کی گئی جس کی صدارت پروفیسر ایم سی شیخ نے کی۔ بطور مہمان پروفیسر متین شیخ، جواں سال سائنسی مضمون نگار جنید شیخ، سلطان اختر شریک تھے۔ جنید شیخ نے دوران خطاب کہا کہ ڈاکٹر زویل عالم اسلام کے پہلے مسلمان ہیں جنھوں نے کیمسٹری میں نوبل انعام حاصل کیا۔ انھوں نے فیموکیمسٹری میں دنیا کا تیز ترین کیمرہ ایجاد کیا جو کیمیائی روعمل کے دوران ایک مالیکول کے اندر ایٹمز کو دیکھ سکتا ہے۔ پروفیسر ایم سی شیخ نے اپنے صدارتی تقریر میں کہا کہ ڈاکٹر زویل نے اپنی ساری زندگی کو انسانیت کے لیے وقف کردی۔ ڈاکٹر زویل کی سائنسی خدمات ناقابل فراموش و مشعل راہ ہیں۔ سلطان اختر نے نظامت کی۔

ڈاک سے: جنید شیخ، صدر سولاپور کونسل برائے فروغ سائنس سولاپور، 15 اگست 2016

تصوف اور بھکتی کی شعری روایت پر سمپوزیم

'تصوف اور بھکتی کی شعری روایت' پر سمپوزیم

پونے: ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی کے زیر اہتمام دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ، پونے کے اشتراک سے یک روزہ قومی سمپوزیم بہ عنوان 'تصوف و بھکتی کی شعری روایت' کا انعقاد پونے اعظم کیمپس کے ہائی ٹیک ہال میں عمل میں آیا۔ پروفیسر قدوس جاوید نے صدارت کی۔ اپنے صدارتی خطبہ میں پوری صدی کو سمیٹنے کی کوشش کی اور کہا کہ تصوف نہ تو مذہب ہے نہ مذہب کا بدل، ادب و آداب کا دوسرا نام تصوف ہے۔ آج کے حالات میں اس موضوع پر ایسے سمپوزیم کی بڑی ضرورت ہے۔ کلیدی خطبہ ممبئی سے آئے ہوئے نامور محقق، صحافی و کالم نگار، شمیم طارق نے دیا۔ انھوں نے شعری روایت کے حوالے سے تصوف اور بھکتی کے اہم نکات کی وضاحت کی اور بتایا کہ اس شعری روایت کے اثرات ہندوستان کی تمام زبانوں پہ مرتب ہوئے ہیں۔

سمپوزیم کا افتتاح انسٹی ٹیوٹ کی صدر بیگم عابدہ انعامدار نے کیا۔ انھوں نے تصوف اور بھکتی پر روشنی ڈالی اور کہا کہ ہندوستان گنگا جمنی تہذیب کا گہوارہ ہے۔ اس تہذیب کو صوفی اور سنتوں نے اپنے افکار اور فلسفے سے متحد کیا ہے۔ مذکورہ عنوان پر پروفیسر صاحب علی، ممبئی، ڈاکٹر جمشید احمد ندوی (ممبئی) ڈاکٹر صادقہ نواب سحر (کھپولی)، ڈاکٹر شعیب انور علوی (لکھنؤ) نذیر فتح پوری (پونے) اور ڈاکٹر عزیز امبیکر (احمد نگر) نے جامع اور پر مغز مقالے پیش کیے۔ اس سمپوزیم میں بڑی تعداد میں پونے کے اہل علم خواتین وحضرات اور طلبا و طالبات نے شرکت کی۔ جلسے کا اختتام عظمیٰ تسنیم کے شکریے پر ہوا۔ عظمت دلال نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

پریس ریلیز: بینی ٹو، پونے، 27 اگست 2016

مدھیہ پردیش

تحریک آزادی اور اردو ادب

برھان پور: سیوا سدن کالج برہان پور میں یونیورسٹی گرانٹ کمیشن نئی دہلی کے تعاون سے شعبۂ اردو فارسی کے زیر اہتمام دو روزہ قومی سمینار بعنوان 'تحریک آزادی اور اردو ادب' کا انعقاد 21,22 اگست 2016 کو کیا گیا، اس سمینار میں شعبۂ اردو کے صدر اور اس سمینار کے کنوینر ڈاکٹر ایس ایم شکیل کے ہاتھوں مضامین کا مجموعہ 'گنج سربستہ' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ اس سمینار کا افتتاح ورسم اجرا تقریب کی صدارت سیوا سدن ایجوکیشن سوسائٹی کے صدر ٹھاکر وریندر سنگھ جی نے کی اور مہمان خصوصی مدھیہ پردیش مدرسہ بورڈ کے صدر پروفیسر سید اعمادالدین اور سابق ایم ایل اے برہان پور قاضی حمیدالدین تھے، کلیدی خطبہ مشہور صحافی روزنامہ انقلاب ممبئی کے مدیر اعلیٰ جناب شاہد لطیف اور خصوصی خطبہ معروف ادیب، شاعر، ناظم، صحافی ای ٹی وی اردو مدھیہ پردیش ڈاکٹر مہتاب عالم نے دیا اس موقعے پر کالج کے سکریٹری جناب سکھ لال جی اور پرنسپل ڈاکٹر انیل کاپڑیا موجود تھے۔

شاہد لطیف نے اپنے کلیدی خطبہ میں تحریک آزادی میں اردو ادب کا کردار پر تفصیل سے گفتگو کی اور ڈاکٹر مہتاب عالم نے تحریک آزادی میں اردو صحافت پر روشنی ڈالی۔ اس سمینار کے اختتامی اجلاس کے مہمان خصوصی مشہور ہندی شاعر ڈاکٹر رام پریہار جی اور ہندی ادیب تیج پال جی تھے، سمینار میں کل چار اجلاس ہوئے جس کی صدارت ڈاکٹر مختار شمیم بھوپال، ڈاکٹر صاحب علی ممبئی، ڈاکٹر حدیث انصاری اودے پور، ڈاکٹر فہمیدہ منصوری اندور نے کی۔

مختلف موضوعات پر جن مقالہ نگاروں نے اپنے پرچے پیش کیے ان میں ڈاکٹر صاحب علی ممبئی، ڈاکٹر غلام دستگیر شولاپور، ڈاکٹر حدیث انصاری اُدے پور، ڈاکٹر غلام حسین اجین، ڈاکٹر فہمیدہ منصوری اندور، ڈاکٹر بلقیس بیگم کولکاتا، ڈاکٹر ساجد قادری شیرپور، ڈاکٹر قمر صدیقی ممبئی، ڈاکٹر ظفر محمود اجین، ڈاکٹر مجاہدالاسلام لکھنؤ، ڈاکٹر عتیق قریشی جالنہ، ڈاکٹر رشید اشرف ممبئی، ڈاکٹر اسرار اللہ انصاری کھنڈوا، ڈاکٹر نازنین منصوری اندور، پروفیسر ریاست علی ریاست اکل کنواں، ڈاکٹر آفاق انجم بیاول، جناب طاہر نقاش برہانپور، پروفیسر قیصر جمال وغیرہ شامل تھے۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 27 اگست 2016

اعزاز و اکرام

پروفیسر ارتضیٰ کریم و بیگم نایاب عباسی کو فخر ہند ایوارڈ

نئی دهلی: ہندوستان کی آزادی کے 70 سالہ یادگار کی مناسبت سے حسن آرا ٹرسٹ و انڈیا اسلامک سینٹر کی جانب سے ایک تقریب کا انعقاد 'جشن بھارت' کے عنوان

سے کیا گیا جس میں مہمان خصوصی کے طور پر چیف جسٹس آف انڈیا ٹی ایس ٹھاکر نے حصہ لیا جبکہ مہمان معظم کے طور پر اشوک لواسہ اور سابق گورنر سید سبط رضی وغیرہ موجود رہے۔ مہمان خصوصی کا خیر مقدم حیدر کمال نقوی نے گلدستہ پیش کر کے کیا جس کے بعد استقبالیہ خطبہ پدم شری ڈاکٹر محسن ولی نے پیش کیا۔ اسی دوران بیگم فرخ ناز کی تصنیف 'شہید ہند شہید بھگت سنگھ' کی رونمائی جسٹس ٹھاکر و دیگر مہمانان کے دست مبارک سے عمل میں لائی گئی۔ اس موقعے پر پروفیسر ارتضیٰ کریم و بیگم نایاب عباسی کو فخر ہند اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔

مہمان خصوصی جسٹس ٹی ایس ٹھاکر نے کہا کہ آج دنیا بھر میں تشدد پھیلا ہوا ہے، دنیا ایک بارود کے ڈھیر پر بیٹھی ہوئی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس بارود کو کسی چنگاری نے چھیڑ دیا تو ساری انسانیت بکھر جائے گی اور ہماری تمام ترقیاں ایک لمحہ میں ختم ہو جائیں گی۔ اپنی تقریر میں اشوک لواسہ نے کہا کہ آج پورے ملک میں آزادی کا 70 سالہ جشن منایا جا رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہر انسان کی ذمے داری ہے کہ وہ اپنے وطن کی آزادی کی اہمیت کو سمجھے اور ملک کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے کو تیار رہے۔ دریں اثنا ڈاکٹر اعجاز الدین شاہ پاپولر میرٹھی، ڈاکٹر دوا کر گوئل، سلیم امروہی وغیرہ نے اپنا کلام پیش کیا جبکہ صوفیانہ کلام استاد جاوید حسین خاں نے پیش کیا۔ اختتام سے قبل صحافی عباس مہدی و جاوید خاں کی شال پوشی چیئرمین ڈاکٹر افسر پرویز، حسن شجاع نقوی، ندیم عباس زیدی و پدم شری ڈاکٹر ولی کے دست مبارک سے کی گئی۔ اس موقعے پر خصوصی طور سے جسٹس سنگیتا ڈھینگرہ، ڈاکٹر شبلی، ڈاکٹر گائنی ہرمینیہ، جسٹس منموہن، چیئرمین بدر السلام، ایس ایم خاں، رئیس اور یسی، گلزار خاں، ڈاکٹر شبانہ نذیر، ڈاکٹر کلب حسنین، ڈاکٹر حسن جمال عابدی، کمشنر نجیب اشرف، آئی اے ایس علی رضا، ڈاکٹر دیو سوروپ، ڈاکٹر برنی، پربھ داس ماتھور، او پی سپر سپرہ، وجے کمار شوکی، مس پریا آئی اے ایس و دیگر موجود تھے۔ پروگرام کی نظامت سلیم امروہی نے کی۔ شکریہ حیدر کمال نقوی و علی عابدی امروہی نے ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 23 اگست 2016

عالمی ایوارڈ 2016 کا اعلان

نئی دهلی: شاعر مشرق علامہ اقبال کی یوم پیدائش 9 نومبر کی مناسبت سے ہر سال دنیا بھر میں عالمی یوم اردو منایا جاتا ہے۔ اس موقعے پر اردو کی ترویج و اشاعت میں نمایاں رول ادا کرنے والوں کو عالمی یوم اردو ایوارڈ سے نوازا جاتا ہے۔ یہ پروگرام اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن اور یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا کے زیر اہتمام منعقد کیا جاتا ہے۔ عالمی یوم اردو منتظمہ کمیٹی کی ایک میٹنگ میں عالمی یوم اردو ایوارڈ یافتگان کے ناموں کا اعلان کیا گیا۔ بیان کے مطابق علامہ اقبال یوم اردو ایوارڈ برائے بہترین محقق پروفیسر جگن ناتھ آزاد (پس از مرگ) کو دیا جائے گا جبکہ مولانا غلام محمد اسماعیل رنڈیرا (وستانوی) مہتمم، جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا، مہاراشٹر کو سرسید احمد خاں عالمی یوم اردو ایوارڈ برائے تعلیمی، ملی و قومی خدمات، ڈاکٹر محمد ابوالفیض (ٹونک، راجستھان) کو مولوی عبدالحق عالمی یوم اردو ایوارڈ برائے تعلیمی خدمات، ڈاکٹر ماجد دیوبندی کو حفیظ میرٹھی عالمی یوم اردو ایوارڈ برائے شعر و ادب، سید اسد رضا کو ساغر خیامی عالمی یوم اردو ایوارڈ برائے طنز و مزاح دیا جائے گا۔ منشی نول کشور عالمی یوم اردو ایوارڈ برائے نشر و اشاعت فاروس میڈیا اینڈ پبلشنگ پرائیویٹ لمیٹڈ، نئی دہلی کو دیا جائے گا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 19 اگست 2016

اردو میڈیم کے ہونہار طلبا کو نقد انعامات

نئی دهلی: انجمن فکر رفعت سروش اور سوشل کاؤنسلرس، کونسلنگ اینڈ گائیڈینس سینٹر کی جانب سے انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں اردو میڈیم اسکولوں کے ہونہار طلبا و طالبات اور اساتذہ کے اعزاز میں جلسہ تہنیت کا انعقاد کیا گیا۔ جلسہ کا آغاز حافظ جواد عالم کیفی کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ بعد ازاں پروگرام کی روح رواں ڈاکٹر شبانہ نذیر نے مہمانان، اساتذہ اکرام، طلبا و ان کے والدین کا استقبال کرتے ہوئے انجمن فکر رفعت سروش کے اغراض و مقاصد پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ اس جلسہ کا مقصد ہونہار بچوں کی حوصلہ افزائی کرنا ہے تاکہ وہ مستقبل میں مزید بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کریں۔ انھوں نے کہا کہ اپنے والد رفعت سروش کے نام سے ایک ایوارڈ ہم نے منسوب کیا ہے جس میں پہلے پانچ ہزار روپے بطور انعام دیے جاتے تھے جسے اس بار بڑھا کر دس ہزار کر دیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس بار پانچ طالبات اردو مضمون میں صد فیصد نمبر حاصل کر کے اس ایوارڈ کی مستحق قرار دی گئی ہیں۔ پانچ طالبات جنھوں نے اردو میں صد فیصد نمبر حاصل کیے تھے انھیں 'نشان رفعت سروش' ایوارڈ سے نوازا گیا ان میں یسریٰ جاوید، سمیہ اور بسمہ یہ تینوں طالبات زینت محل اسکول کی ہیں ان کے علاوہ ایس کے وی چشمہ بلڈنگ اسکول کی طالبہ ارم صبا اور ایس کے وی نور نگر کی طالبہ آفرین شکیل شامل ہیں۔ ان کے علاوہ 80 سے 90 فیصد نمبر حاصل کرنے والے طلبہ و طالبات کو بھی نقد انعامات و اسناد سے سرفراز کیا گیا۔

پریس ریلیز: محمد عمران نئی دہلی 15 اگست 2016

مظہر عالم مظاہری توصیفی ایوارڈ سے سرفراز

جالندھر: جمعیت علما متحدہ پنجاب نے ایک پروقار تقریب میں اردو صحافی مظہر عالم مظاہری کو ان کی سماجی

اور ملی خدمات کے صلے میں توصیفی ایوارڈ سے نوازا ہے۔ تقریب کی صدارت کرتے ہوئے متحدہ جمعیت کے صدر مولانا علی حسن مظاہری نے کہا کہ سماجی خدمت عصر حاضر کا اہم موضوع ہے، جس پر پوری توجہ نہیں دی جا رہی ہے۔ مولانا انس قاسمی نے کہا ملی ادارے ہوں، یا سرکاری یا نیم سرکاری، سب کا ایک ہی مقصد ہے کہ کسی طرح سماج میں سدھار پیدا ہو جائے، اس کے لیے مظہر عالم نے سدا ہی اپنی تحریروں کے ذریعے خدمت کی ہے، ان کی طویل خدمات ہیں۔ غور طلب ہے کہ اس سے پہلے پنجاب سرکار کے نائب وزیر اعلیٰ کے ہاتھوں بھی مظہر عالم کو اسی طرح کا ایوارڈ مل چکا ہے۔ مظہر عالم ریاست بہار کے رہنے والے ہیں، مظاہر علوم سے فارغ ہیں اور عرصے سے اس علاقے میں سماجی خدمات کے لیے سرگرم ہیں۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 8 اگست 2016

افسانہ خاتون کو 'بھارت جیوتی ایوارڈ'

پٹنہ: اردو کی نامور فکشن نگار اور ماہر تعلیم ڈاکٹر افسانہ خاتون کو ان کی سماجی، علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں سابق گورنر بھیشم نرائن سنگھ کے ہاتھوں 'بھارت جیوتی ایوارڈ' کے اعزاز و اکرام سے نوازا گیا۔ انھوں نے کہا کہ

یہ انتہائی خوشی اور مسرت کا مقام ہے کہ خواتین فکشن نگاروں میں ڈاکٹر افسانہ خاتون نے بہت خاموشی کے ساتھ ادب کی خدمت کی ہے۔ صدر شعبہ ایس سی ای آر ٹی بہار ڈاکٹر قاسم خورشید نے کہا کہ محترمہ افسانہ خاتون کو جس ایوارڈ سے نوازا گیا ہے وہ ہر اعتبار سے اس کی مستحق تھیں۔ انھوں نے کہا کہ افسانہ خاتون نے بلاشبہ نسائی ادبی تحریک کو نئی جہت عطا کی ہے۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ فکشن نگار ڈاکٹر عبدالصمد نے بہت ہی جذباتی انداز میں اظہار خیال کے دوران فرمایا کہ ہم صرف ایک جہت میں سوچنے کے لیے خود کو عموماً بہت عظیم تصور کر لیتے ہیں مگر جہاں تک عورتوں کا معاملہ ہے ایک دنیا کی تعمیر سے لے کر تمام بڑی چھوٹی ذمہ داریوں کے باوجود اگر ان میں ادبی رجحان ایسی دیانت داری کے ساتھ ابھرتا ہے تو اس کا اعتراف کیا جانا چاہیے۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 27 اگست 2016

رسم اجرا:

افق کے پار

مراد آباد: گمر گم ہال مراد آباد میں بھارتی کلیان سمیتی و دریا جن کلیان سمیتی مراد آباد کے باہمی اشتراک سے معروف و ممتاز شاعر انجینئر انور کیفی کے دوسرے شعری مجموعے 'افق کے پار' کا اجرا عمل میں آیا۔ پروگرام کی صدارت آکاش وانی رامپور کے ڈائرکٹر ثروت عثمانی نے کی، مہمان خصوصی اما کانت گپتا، دیانند ڈگری کالج مراد آباد، مہمانان ذی وقار سین شمین عالم، جمیل الدین خاں، مہمانان اعزازی ڈاکٹر اطہر مسعود خاں، ڈاکٹر اجے انوپم، محمد احمد، اسد مولائی، انور لطیفی ایڈووکیٹ و ڈاکٹر شیخ نگینوی رہے جن کے ہاتھوں 'افق کے پار' کا اجرا عمل میں آیا جس کی سرپرستی سید معصوم علی آزاد امام شہر مراد آباد نے فرمائی۔ اس پروگرام میں شہر کے اردو اور ہندی پریمی حضرات نے انور کیفی کے مجموعہ کلام کے اجرا پر ان کو مبارکباد پیش کی۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 8 اگست 2016

تنقیدی بحثیں، رثائی تنقیدیں اور خواجہ احمد عباس

لکھنؤ: اردو بھی ملک کی قومی زبان ہے۔ اردو ترقی کرے گی تو ملک ترقی کرے گا۔ صرف ہندی ہی نہیں بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ جتنی زبانیں ملک میں بولی جاتی ہیں وہ سبھی زبانیں ملک کی قومی زبان ہیں۔ بھاشا کا کوئی گھر نہیں ہوتا۔ اردو اتر پردیش کی دوسری سرکاری زبان ہے۔ تمام زبانیں لوگوں کو جوڑتی ہیں زبان کے نام پر تفریق قابل قبول عمل نہیں ہے۔ ان خیالات کا اظہار اتر پردیش کے گورنر شری رام نائک نے کیا۔ موقع تھا اردو رائٹرس فورم کے زیر اہتمام لکھنؤ یونیورسٹی کے مالویہ ہال میں عالمی شہرت یافتہ ناظم، شاعر اور ناقد ڈاکٹر سید عباس رضا نیر جلال پوری (صدر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی) کی تین کتابوں 'تنقیدی بحثیں'، 'رثائی تنقیدیں اور خواجہ احمد عباس' کے اجرا میں کہا کہ کتابیں انسان کے من کو سکون بخشتی ہیں۔ ڈاکٹر نیر کو مبارکباد دیتے ہوئے گورنر نے کہا کہ اچھی کتابوں کا ترجمہ ہندی میں بھی ہونا چاہیے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے استفادہ کر سکیں۔ اس سے پہلے راشٹر یہ گان سے پروگرام کا آغاز ہوا جسے شعاع گرلس کالج کی طالبات نے پیش کیا اور مہمانوں کو گلدستے پیش کیے گئے۔ پروگرام کے کنوینر وقار رضوی نے گورنر اور مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ جلسہ گاہ میں اتنی بڑی تعداد کی موجودگی ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ایس پی نمسے نے جملہ مہمانوں اور سامعین کا لکھنؤ یونیورسٹی کی طرف سے خیر مقدم کرتے ہوئے ڈاکٹر عباس رضا نیر کو ان کی تین کتابوں کی اشاعت پر مبارکباد پیش کی۔ پروفیسر شارب ردولوی نے اپنی گفتگو کتابوں پر مرکوز رکھتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر نیر نے جدید غزل میں ان تلازمات اور عناصر کو تلاش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے جن سے ہمارا ذہن کربلا کی طرف جاتا ہے۔ پروگرام کی نظامت پروفیسر صابرہ حبیب نے کی۔ آخر میں صاحب کتب ڈاکٹر عباس رضا نیر نے فرداً فرداً کلمات تشکر ادا کیے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 8 اگست 2016

'دعوت' اور 'نہ گھر کے نہ گھاٹ کے'

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے یو جی سی ایچ آر ڈی سینٹر میں منعقدہ ثقافتی شام میں آرٹی او علی گڑھ ڈاکٹر وکرم سنگھ اور ڈاکٹر اکرم شروانی نے کہانیاں پیش کیں اور شعبۂ ہندی کے ڈاکٹر معراج احمد کے دو افسانوی مجموعوں 'دعوت' اور 'نہ گھر کے نہ گھاٹ کے' کا اجرا بھی کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر وکرم سنگھ نے کہا کہ اردو اور ہندی زبانیں دو بہنوں کی طرح ہیں جنھیں پھلنے پھولنے کا بھرپور موقع ملنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ ایک قلم کار کا دل نہایت نرم اور حساس ہوتا ہے اور جب وہ کسی سے متاثر ہوتا ہے تو ایک نئی تخلیق وجود میں آتی ہے۔ ڈاکٹر معراج احمد نے کہا کہ ان کہانیوں میں مسلم سماج کی اقتصادی اور سماجی صورت حال کی تصویر کشی کی گئی ہے جو متعدد نئے پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے۔ انھوں نے ان کہانیوں میں مسلم سماج کے حاشیے پر پہنچنے کے اسباب کو جاننے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اپنی دو اہم کہانیاں 'امرود' اور 'ہری پتیاں' بھی پڑھیں۔ ڈاکٹر اکرم شروانی نے اپنی مشہور کہانی 'شامت کی ماری' پیش کی۔ انھوں نے اس کہانی میں بچوں پر پڑنے والے نفسیاتی اثرات اور نئی بول چال میں استعمال کیے جانے والے الفاظ اور اساتذہ کے ذریعہ پڑھائی کے دوران استعمال کیے جانے والے الفاظ کو بھی ابھارا۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے سابق سربراہ پروفیسر انیس اشفاق نے پروگرام میں پیش کی گئی کہانیوں 'امرود، ہری پتیاں اور شامت کی ماری' پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ کہانیاں اردو ادب کی بہترین تخلیق ہیں۔ اس سے قبل کورس کوآرڈینیٹر پروفیسر صغیر افراہیم نے حاضرین سے مہمانان کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ادب کا زندگی سے

شمس گلاؤٹھوی کے مجموعہ کلام کا اجرا

انسپکٹر راجندر کل کل اور انسپکٹر پرمود شرما اثر کے شعری مجموعے کا اجرا

گہرا تعلق ہوتا ہے اور ہر قلم کار اپنے طور پر زندگی کا مطالعہ کرکے اسے تخلیق کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ ریسرچ اسکالر محمد جنید نے حاضرین کا خیر مقدم کیا۔ ڈاکٹر فرقان سنبھلی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 25 اگست 2016

فن مضمون نگاری

منگلور: اتراکنڈ کی قدیم دینی درس گاہ جامعہ عربیہ مدرسۃ المومنین منگلور میں ایک ادبی نشست کا انعقاد ہوا جس میں میدان صحافت کے جواں عمر معروف قلم کار مولانا آفتاب اظہر صدیقی کی تازہ ترین تصنیف 'فن مضمون نگاری' کا اجرا علمائے کرام کے مبارک ہاتھوں عمل میں آیا۔ کتاب 'فن مضمون نگاری' پر علما نے اپنی قیمتی آرا پیش کیں، مفتی محمد معصوم قاسمی مدیر جامعہ مدرسۃ المومنین منگلور نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ عالم دین میں تدریسی صلاحیت کے ساتھ تحریری اور تقریری صلاحیتوں کا ہونا بھی ناگزیر ہے۔ مفتی توفیق الٰہی ہریدواری نے کہا کہ عام طور پر دنیا میں ذریعۂ ابلاغ کے دو ہی طریقے رائج ہیں تحریر اور تقریر، لیکن بغیر سیکھے کچھ نہیں آتا، مولانا آفتاب اظہر صدیقی نے 'فن مضمون نگاری' نامی کتاب تالیف فرما کر طلبا اور اہل ذوق کے لیے تحریری میدان میں آگے بڑھنا بہت آسان کردیا ہے۔ مولانا تنویر صدیقی مظاہری نے کہا کہ کتاب پر مولانا فضیل احمد ناصری القاسمی (استاذ حدیث جامعہ امام محمد انور شاہ دیوبند) کا جاندار مقدمہ کتاب کی اہمیت کا پتہ دیتا ہے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 9 اگست 2016

مذاقاً

نئی دھلی: ادبی، ثقافتی اور سماجی تنظیم ایوان اردو دہلی کے زیر اہتمام معروف و مخیّر ادب دوست ڈاکٹر سید محمد فاروق کی رہائش گاہ اوکھلا گاؤں میں دہلی کی ٹکسالی اردو زبان کے پروردہ معروف طنزیہ، مزاحیہ شاعر اقبال فردوسی کے اولین شعری مجموعہ 'مذاقاً' کا اجرا بدست ہمالیہ ڈرگس کے مینیجنگ ڈائرکٹر ڈاکٹر سید محمد فاروق عمل میں آیا۔ اس موقعے پر دہلی کی معروف علمی، ادبی شخصیات نے نہایت ناگفتہ بہ موسم کے باوجود پروگرام میں نہ صرف شرکت کی بلکہ صاحب کتاب کے اولین شعری مجموعہ پر انھیں نثری کلمات تبریک سے بھی نوازا۔ ڈاکٹر سید محمد فاروق نے صدارت کی جبکہ ڈاکٹر ایم آر قاسمی کی نظامت نے تقریب کے وقار میں اضافہ کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 15 اگست 2016

کلام شمس گلاؤٹھوی

نئی دھلی: اردو زبان کے فروغ میں مدارس کے کردار سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب اس زبان کو اپنے ہی وطن سے بے گھر کرنے کی سازشیں چل رہی تھیں، اس وقت مدارس نے آگے بڑھ کر اسے اپنایا، اس کی ترویج و اشاعت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان خیالات کا اظہار ممتاز عالم دین اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے جنرل سکریٹری مولانا محمد ولی رحمانی نے ندیم ماہر کی تحقیق و ترتیب کردہ، غالب و مومن کے ہم شاعر شمس گلاؤٹھوی کے مجموعہ کلام کی تقریب رسم اجرا کی صدارت کرتے ہوئے کیا۔ انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر اور گرین پیجز (پبلشنگ ہاؤس) کے اشتراک سے منعقد اس تقریب میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے ممبر آف پارلیمنٹ سریندر سنگھ ناگر اور مہمانان اعزازی کے طور پر آر این آئی کے ڈائریکٹر جنرل ایس ایم خان اور آئیڈیا کمیونیکیشنز کے ڈائرکٹر آصف اعظمی نے شرکت کی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر عمیر منظر نے انجام دیے۔ دیگر معزز شرکا میں ڈاکٹر سلیم الدین حسان، مولانا فرید الدین، فرزان، ڈاکٹر مشیر احمد، شیخ علیم الدین اسعدی، فاروق انجینئر، ارشاد احمد وغیرہ شامل تھے۔ مولانا محمد ولی رحمانی نے کہا کہ علما کی خدمات کا دائرہ صرف علوم دین ہی تک محدود نہیں ہے۔ علم و ادب کی متنوع اور ہمہ گیر جہات اور میدان ہائے کار میں علما نے اپنے کامیابیوں کے جھنڈے گاڑے ہیں۔ حافظ سید شمس الدین شمس گلاؤٹھوی سے لے کر ندیم ماہر تک، ان کا پورا خانوادہ جس طرح دین اور علوم اسلامیہ کے ساتھ ساتھ زبان و ادب کے فروغ میں مصروف عمل ہے، وہ لائق ستائش ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 18 اگست 2016

دو شعری مجموعے کی رسم اجرا

نئی دھلی: انسپکٹر راجندر کل کل اور انسپکٹر پرمود شرما اثر کے اولین شعری مجموعے ماتا سندری کالج کے آڈیٹوریم میں معزز مہمانان کے ہاتھوں کا اجرا عمل میں آیا۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی لکشمی شنکر واجپئی نے کہا کہ آج کے دور میں جہاں کتابیں پڑھنے کا رجحان کم ہو رہا ہے ایسے دور میں انسپکٹر راجندر کل کل اور پرمود شرما اثر نے اردو غزل میں اپنے مجموعے لاکر نوجوانوں کے لیے ایک مثال پیش کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ان دونوں شاعروں کا تعلق دہلی پولیس سے ہے اور پولیس میں رہتے ہوئے یہ ادب کی خدمت کر رہے ہیں یہ بہت بڑی بات ہے۔ شاعر اپنے کرب کو غزل کے سانچے میں ڈھال کر قاری کے سامنے پیش کرتا ہے۔ غزل میں ہندو مسلم کا کوئی دخل نہیں ہے کیونکہ ہر انسان کی اپنی سوچ ہوتی ہے اور شاعر اپنے تجربات کو اپنے لفظوں کے پیکر میں ڈھال کر عوام کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس موقعے پر جوائنٹ سی پی دہلی پولس اجے چودھری نے اپنی نیک خواہشات پیش کی۔ جبکہ شکیل شفائی، معین اختر انصاری نے دونوں کتابوں پر تبصرے کیے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 21 اگست 2016

دھوپ پھر نکل آئی

نئی دھلی: فیس اسلامک کلچرل کمیونٹی انٹی گریشن کے زیر اہتمام حسیب سوز کی کتاب 'دھوپ پھر نکل آئی' کا اجرا غالب اکادمی میں پروفیسر اختر الواسع سابق لسانی کمشنر کے ہاتھوں میں عمل میں آیا۔ مہمان خصوصی کے طور پر رام نواس گوئل اسپیکر دہلی اسمبلی نے شرکت کی جبکہ مہمانان ذی وقار کے طور پر عمر سیفی دہلی صدر سیفی کانفرنس شریک ہوئے۔ مشاعرے کی صدارت استاد شاعر شمس رمزی نے کی اور نظامت کے فرائض معین شاداب نے انجام دیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 30 اگست 2016

اردو فارسی اور سکھ مذہب

مالیرکوٹلہ: پنجاب یونیورسٹی میں شعبۂ فارسی اردو عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر رحمان اختر کی تازہ ترین کتاب 'اردو فارسی اور سکھ مذہب' کی رونمائی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر جسپال سنگھ کے دست مبارک سے عمل میں آئی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر جسپال سنگھ نے مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں بلکہ یہ ہمارے ملک کی گنگا جمنی تہذیب کی زبان اور مشترکہ وراثت ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ گوربانی کی تفہیم و تشریح کے لیے اردو فارسی زبانوں کا علم ضروری شرط ہے۔ یہ کتاب سکھ مذہب اور اردو فارسی کے باہمی رشتے کو منظر عام پر لانے کی ایک سعی ہے۔ کتاب کی رسم اجرا کے اس موقعے پر صدر شعبۂ فارسی اور عربی ڈاکٹر محمد اجمل کے علاوہ ڈاکٹر ناشر نقوی اور ڈاکٹر انور چراغ بھی موجود تھے۔

روزنامہ 'ہندسماچار' مالیرکوٹلہ، 26 اگست 2016

منتخب بنگلہ کہانیاں

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیرالدین شاہ (ریٹائرڈ) نے اپنے دفتر میں اردو اکادمی کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر مشتاق صدف کی مرتبہ کتاب 'منتخب بنگلہ کہانیاں' کا اجرا کیا۔ رسم اجرا کی اس تقریب میں شعبۂ ترسیل کے پروفیسر شافع قدوائی، شعبۂ اردو کے ڈاکٹر معید رشیدی اور اردو اکادمی کے ڈائریکٹر اور شعبۂ رابطہ عامہ کے ممبر انچارج ڈاکٹر راحت ابرار بھی موجود تھے۔ ان سبھی افراد نے ڈاکٹر مشتاق صدف کو مبارکباد پیش کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 31 اگست 2016

وفیات:

پیغام آفاقی

نئی دہلی: اردو ادب کو 'مکان' اور 'پلیتہ' جیسے ناول دینے والے معروف افسانہ نگار پیغام آفاقی نہیں رہے۔ 20 اگست کو انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا وہ 61 برس کے تھے۔ قریبی احباب کے مطابق وہ کچھ دنوں سے بہت بیمار چل رہے تھے۔ پیغام آفاقی ان کا قلمی نام تھا۔ جبکہ اصل نام اختر علی فاروقی تھا۔ وہ 1956 میں موضع چانپ، ضلع سیوان، بہار میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سیوان میں اور اعلیٰ تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی جہاں انھوں نے انگریزی ادب میں بی اے آنرز اور تاریخ میں ایم اے کیا۔ وہ مشہور زمانہ ادیب قاضی عبدالستار و شہریار اور مورخ عرفان حبیب کے شاگرد بھی رہے۔ یونیورسٹی کے زمانے میں انھوں نے دو ناولٹ اور چند افسانے اور کچھ نظمیں لکھیں جنھیں زبردست پذیرائی ملی اور ان کے کچھ افسانے اور نظمیں موقر رسالوں جیسے آج کل، آہنگ اور تحریک وغیرہ میں شائع ہوئے۔ ان کی یہ ابتدائی تخلیقات اس بات کی غماز ہیں کہ انھوں نے ترقی پسند تحریک یا جدیدیت سے متاثر ہوئے بغیر اپنے لیے نئی راہ نکالی تھی اور ان کی یہ روش آگے چل کر وہاں کے آزاد خیال نوجوانوں کے ایک کارواں میں تبدیل ہوگئی۔ طالب علمی کے دور کے بعد وہ کل ہند امتحان میں شریک ہوکر پولس سروس میں آگئے اور اس کے بعد وہ بیشتر اوقات دہلی میں مقیم رہے۔ اردو اور ہندوستان کے ادبی حلقوں میں ان کی شہرہ آفاق حیثیت ان کے ناول 'مکان' کی اشاعت سے قائم ہوئی۔ پیغام آفاقی کا دوسرا ناول 'پلیتہ' 2011 میں شائع ہوا جس کو مکان کی طرح ہی پذیرائی ملی ہے اور اسے بھی موضوع اور تکنیک دونوں اعتبار سے منفرد تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ مافیا کے نام سے بھی چھپ چکا ہے اور ان کا شعری مجموعہ 'درندہ' کے نام سے شائع ہوا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 21 اگست 2016

اخلاق الرحمٰن قدوائی

نئی دہلی: بہار، مغربی بنگال، اور ہریانہ کے سابق گورنر پدم وبھوشن اخلاق الرحمٰن قدوائی کا 24 اگست 2016 کو انتقال ہوگیا۔ بعد نماز ظہر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں سرکاری اعزاز کے ساتھ سپرد خاک کردیا گیا۔ وہ 96 برس کے تھے۔ جنازہ کی نماز جامعہ ملیہ

اسلامیہ کے امام وخطیب قاری محمد سلیمان نے پڑھائی۔ تدفین سے قبل فوج کے جوانوں نے مرحوم کو گارڈ آف آنر پیش کیا۔ مرحوم کے اہل خانہ کی تعزیت کے لیے ان کی رہائش گاہ ذاکر باغ میں سابق وزیراعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ، ہریانہ کے سابق وزیراعلیٰ بھوپندر سنگھ ہڈا، سی پی سنگھ سابق گورنر سکم، محسنہ قدوائی کے علاوہ دیگر معزز شخصیات بھی تشریف لائی تھیں۔ نماز جنازہ اور تدفین میں نائب صدر جمہوریہ ہند محمد حامد انصاری، سابق مرکزی وزیر کے رحمٰن خان، اے ایم یو کے وائس چانسلر ضمیرالدین شاہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد وغیرہ کے علاوہ بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 26 اگست 2016

محمد شفیع قریشی

نئی دہلی: دہلی کی معروف شخصیت اور سابق گورنر محمد شفیع قریشی کا 28 اگست 2016 کو بترا اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ وہ 86 برس کے تھے۔ گذشتہ ایک برس سے وہ بیمار تھے۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ 2 لڑکے اور 3 لڑکیاں ہیں۔ مرحوم قریشی نے مغربی بنگال، بہار اور

مدھیہ پردیش میں گورنر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ انھوں نے آنجہانی اندرا گاندھی کی حکومت میں محکمہ ریل اور شہری ہوابازی کے وزیر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ محمد شفیع قریشی کو گیٹ قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ جموں و کشمیر کی وزیراعلیٰ محبوبہ مفتی نے سینئر کانگریسی لیڈر اور سابق وزیر محمد شفیع قریشی کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ اپنے تعزیتی پیغام میں انھوں نے ان کے لواحقین کے تئیں ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے آنجہانی شفیع قریشی کی روح کو سکون حاصل کرنے کی دعا کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 29 اگست 2016

تاجدار تاج

دیوبند: اردو دنیا کے نامور شاعر اور فلمی نغمہ نگار جناب تاجدار تاج 77 سال کی عمر میں 24 اگست 2016 کو انتقال کرگئے۔ وہ گذشتہ کئی ماہ سے بیمار اور صاحب فراش تھے۔ تاجدار تاج دیوبند کے رہنے والے تھے۔ ان کا اصل نام محمد اسلام تھا۔ تقریباً پچاس سال پہلے ممبئی کی سکونت اختیار کی اور ابتداً وہ فلمی دنیا سے وابستہ ہوئے۔ 30-35 فلموں میں گیت لکھے۔ انھوں نے شاعری کے جو مجموعے چھوڑے ان میں زہر، آوارہ پتھر اور برفیلی زمین کا سورج کو شہرت حاصل ہوئی۔ بچوں کے لیے بھی بے شمار نظمیں کہیں جن کے دو مختصر مجموعے ممبئی اور دہلی کے معتبر ناشرین نے شائع

کیے وہ اس وقت ایک اردو لغت کی ترتیب میں مصروف تھے، مگر یہ کام پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 26 اگست 2016

جوہری توفیق قادری

امروہہ: شہر کے مشہور محبِ اردو اور قلمی کتابوں و نوادرات کے جوہری مولانا توفیق احمد قادری کا حرکت قلب بند ہونے کے سبب 9 اگست 2016 کو 72 سال کی

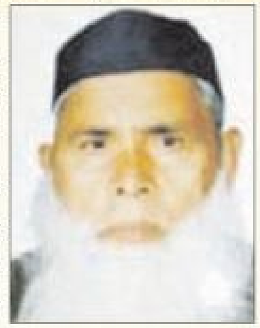

عمر میں انتقال ہوگیا۔ ان کی تدفین ان کے آبائی قبرستان شاہ ولایت میں ہوئی۔ نیشنل بک ڈپو کے نام سے محلّہ گزری میں کتب خانہ چلانے والے قادری اردو عربی فارسی سنسکرت اور کئی دیگر زبانوں کے ماہر تھے۔ مرحوم کے انتقال پر شہر کے ادبی حلقوں میں رنج و غم کا ماحول ہے، ضلع کی کئی ادبی تنظیموں نے مرحوم کے لیے مغفرت کی دعا کرتے ہوئے پسماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کی ہے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 10 اگست 2016

منظر شہاب

جمشید پور: کریم سٹی کالج جمشید پور کے بانی پرنسپل اور معروف ترقی پسند شاعر و ادیب منظر شہاب 7 ستمبر کو انتقال کر گئے۔ ان کی عمر 90 سال کے قریب تھی اور وہ پچھلے کئی سال سے صاحب فراش تھے۔ منظر شہاب کا آبائی وطن شاہو بیگھا ضلع نالندہ تھا۔ جہاں وہ 31 مئی 1927 کو پیدا ہوئے تھے۔ ان کا زمانۂ طالب علمی دربھنگہ میں گزرا جہاں ان کے والد مدرسہ اور اسکول میں استاد تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی معروف شاعر پروفیسر سید احمد شمیم بھی کریم سٹی کالج کے شعبۂ اردو سے سبک دوش ہوکر جمشید پور میں ہی مقیم ہیں۔

مرحوم کریم سٹی کالج جمشید پور سے بحیثیت پرنسپل یکم جون 1989 کو سبک دوش ہوئے تھے۔ ان کے 2 شعری مجموعے 'پیراہنِ جاں' اور 'مجروح پرندے کی صدا' اور مضامین کا مجموعہ 'اور پھر بیاں اپنا' شائع ہوکر ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' پٹنہ، 9 ستمبر 2016

خراج عقیدت:

سانجھی وراثت

نئی دهلی: بھارت رتن استاد بسم اللہ خاں کی 10 ویں برسی کے موقعے پر ایشین رپورٹر میل کے زیر اہتمام 'سانجھی

وراثت' کے عنوان سے دہلی کے غالب اکادمی میں ایک شاندار پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس میں اردو اور ہندی زبان کے ادبی اور صحافتی تخلیق کاروں کے ساتھ بڑی تعداد میں معزز مہمانوں نے شرکت کی۔ اس موقعے پر استاد علی عباس خاں (داماد بسم اللہ خاں) نے شہنائی کے توسط سے پرنم آنکھوں سے پرخلوص خراجِ عقیدت پیش کیا اور سانجھی وراثت کی ترویج و تشہیر کی ضرورت پر زور دیا۔ ان کے ہاتھوں ماہنامہ 'ایشین رپورٹر میل' ہندی کا اجرا عمل میں آیا۔ اس موقعے پر گرافک آرٹسٹ فیض احمد فیضی کو اعزاز سے نوازا گیا۔ اس پروگرام کا انعقاد فلمنٹ فلمس اور ساوتری فاؤنڈیشن کی ڈاکٹر انیتا شری واستو کے تعاون سے کیا گیا۔ پروگرام کی نظامت مشہور و معروف مقرر اور اینکر ڈاکٹر حفیظ الرحمن اور سماجی کارکن اور ایشین رپورٹر میل کی سب ایڈیٹر زلیخا جبیں نے کی۔ اس موقعے پر سانجھی وراثت کی روح رواں اور ایشن رپورٹر میل کی ایڈیٹر محترمہ تسنیم کوثر نے اپنے خیالات پیش کیے۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 23 اگست 2016

عتیق مظفر پوری کی پہلی برسی

نئی دهلی: عتیق مظفر پوری نے اردو صحافت کو اپنی مدلل اور بے باک تحریروں کے ذریعے نہ صرف اسے انفرادیت کا درجہ دیا بلکہ اس کی اہمیت اور ضرورت سے نوجوان طبقے کو روشناس بھی کرایا۔ وہ اردو صحافت کو محض پیشے نہیں بلکہ ایک مشن سمجھتے تھے۔ ان خیالات کا اظہار یہاں انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر اہتمام بے باک صحافی عتیق مظفر پوری مرحوم کی پہلی برسی کے موقعے پر 'مثالی معاشرے کی تشکیل اور اردو صحافت' کے عنوان پر منعقدہ مذاکرہ میں کیا گیا۔ م افضل نے صدارتی کلمات میں کہا کہ اردو صحافت بہت برے وقت سے گزر چکی ہے۔ اردو صحافت کے لیے حالات بہتر ہیں اس لیے اردو اخبارات کے بارے میں مایوس کن باتیں نہیں ہونی چاہیے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر رضا حیدر نے کہا کہ عتیق مظفر پوری اپنے کارناموں کی وجہ سے یاد کیے جا رہے ہیں۔ ان کی تحریروں کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ وہ ہمیشہ غیر ضروری باتوں سے گریز کرتے تھے اور موضوع کے تمام پہلو پر نظر رکھتے تھے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر اطہر فاروقی، ماجد دیوبندی، ڈاکٹر ظفر الاسلام، ڈاکٹر سید قاسم رسول الیاس اور ڈاکٹر اشفاق احمد عارفی نے بھی اظہار خیال کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 اگست 2016

فراق گورکھپوری کو خراجِ عقیدت

گورکھپور: اردو کے عظیم شاعر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کی 120 ویں سالگرہ پر یہاں مختلف سماجی اور ثقافتی تنظیموں نے پروگراموں کا انعقاد کر کے انھیں خراج عقیدت پیش کیا۔ گورکھپور کینٹ علاقے میں واقع فراق کے مجسمے پر پھول چڑھائے گئے اور مقامی چترگپت مہاسبھا کے ہال میں مشاعرے اور کوی سمیلن کا انعقاد کیا گیا۔ فراق صاحب کے آبائی گاؤں میں خصوصی پروگرام کا بھی انعقاد کیا گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 29 اگست 2016

سید محمد یونس جعفری

نئی دهلی: فارسی کے عظیم اسکالر، انڈو ایران ریلیشن کی اہم کڑی، دہلی کالج کی دانشوری کی آخری بہار، ذاکر حسین دہلی کالج کے نامور استاد، نابغۂ روزگار ڈاکٹر یونس جعفری کے انتقال پر اسٹاف ایسوسی ایشن، ذاکر حسین، دہلی کالج کی جانب سے ایک تعزیتی جلسے کا انعقاد کیا گیا جس میں شعبۂ فارسی کے سینئر استاد اور اسٹاف ایسوسی ایشن کے سکریٹری ڈاکٹر جمیل الرحمن نے مرحوم کی کالج سے وابستگی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یونس جعفری نے 1958 میں دہلی کالج میں درس و تدریس کا عہدہ سنبھالا اور 1995 تک علوم و فنون کی خدمت انجام دیتے رہے۔ انھیں فارسی دنیا میں صائب شناس کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ انھیں ایرانی حکومت کی جانب سے 'بین الاقوامی فارابی ایوارڈ'، 'سعدی ایوارڈ' اور ملک و بیرونی ممالک میں متعدد انعامات سے نوازا گیا۔ ان کے شاگرد نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرونی ممالک میں بھی فارسی علوم و فنون کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ یونس جعفری فارسی محاورات اور زبان کے خصوصی مطالعے کے لیے ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 31 اگست 2016

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

علاج بذریعہ غذا

مصنف: حکیم احتشام الحق قریشی
صفحات: 415
قیمت: -/185 روپے

تاریخ طب (ابتدا تا عہد حاضر)
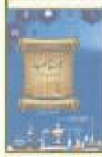

مصنف: حکیم سید محمد حسان نگرامی
صفحات: 496
قیمت: -/220 روپے

مشرق و مغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ
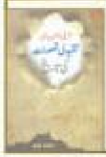

مصنف: محمد حسن
صفحات: 373
قیمت: -/168 روپے

تدریس تاریخ

مصنف: خلیل الرب
صفحات: 272
قیمت: -/110 روپے

اسّی دن میں دنیا کا سفر
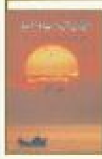

مصنف: صفدر حسین
صفحات: 170
قیمت: -/35 روپے

ماحول نامہ
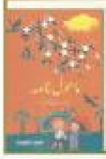

مصنف: متین اچلپوری
صفحات: 82
قیمت: 35 روپے

ننھی جل پری
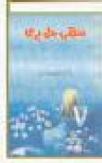

مصنف: ہان کرسٹیان اینڈرسن
مترجم: ہرچرن چاؤلہ
صفحات: 33
قیمت: 16 روپے

سوڈان کی مزے دار کہانیاں

مصنف: محمد امین
صفحات: 61
قیمت: 20 روپے

روبنسن کروسو

مصنف: ڈینیل ڈیفو، مترجم: م ندیم
صفحات: 80
قیمت: 20 روپے

دکن میں اردو
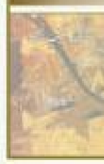

مصنف: نصیر الدین ہاشمی
صفحات: 945
قیمت: -/325 روپے

اردو ادب کی تنقیدی تاریخ
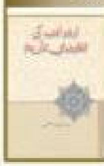

مصنف: سید احتشام حسین
صفحات: 341
قیمت: -/100 روپے

اکبر سے اورنگ زیب تک

مصنف: ڈبلیو ایچ مولینڈ
مترجم: جمال محمد صدیقی
صفحات: 420
قیمت: -/185 روپے

قدیم علم الامراض
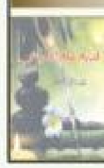

مصنف: ملک واصق امین
صفحات: 131
قیمت: -/40 روپے

رہبر اخبار نویسی
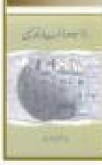

مصنف: سید اقبال قادری
صفحات: 751
قیمت: -/260 روپے

حالی

مصنف: صالحہ عابد حسین
صفحات: 68
قیمت: 20

اصول تعلیم اور عمل تعلیم
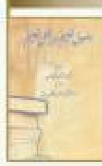

مصنف: ڈی ایس گورڈن
مترجم: خلیل الرحمٰن سیفی پریمی
صفحات: 330
قیمت: 155 روپے

میر غلام حسن دہلوی (مونوگراف)
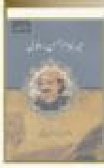

مصنف: قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی
صفحات: 128
قیمت: -/77 روپے

محمد حسین آزاد (مونوگراف)

مصنف: ابوالکلام قاسمی
صفحات: 152
قیمت: -/85 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, October-2016, Vol.18, Issue:10
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2014-16
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/09/2016
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

ناول پر ایک اہم دستاویز

- ناول کے فن اور روایت پر بیش قیمت مضامین
- بیسویں اور اکیسویں صدی کے اردو ناولوں کی فہرست
- ناول پر لکھی گئی تنقیدی کتابیں اور مضامین کا اشاریہ
- ہندوستانی جامعات میں ناولوں پر تحقیق کا جائزہ
- بیسویں اور اکیسویں صدی کے بیشتر اہم ناولوں کا تنقیدی جائزہ

طلبا اور اساتذہ کے لیے معلوماتی اور مفید شمارہ

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025